برھان

جلد ۴۱ شمارہ ۱

جولائی ۱۹۵۸ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیدر آباد میں چار دن

گذشتہ مہینہ تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ حیدر آباد جانے کا اتفاق عثمانیہ یونیورسٹی کی ایک ضرورت سے ہوا تو یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ اگرچہ انقلاب کے اثرات در و دیوار سے ظاہر ہیں لیکن حیدر آباد کی تہذیبی و تمدنی ۔ اور علمی و ادبی روایات بدستور قایم ہیں اور اس بناء پر آج بھی اُس میں وہی کشش اور عظمت ہے جو پہلے تھی۔

۱۶ر جون کو سہ پہر میں پہنچا اور مولانا سید فضل اللہ شاہ صاحب کا مہمان ہوا تو معلوم ہوا کہ میرے چہار روزہ قیامِ حیدر آباد کا پروگرام جو تقریروں اور دعوتوں پر مشتمل تھا پہلے ہی بن چکا ہے۔ چنانچہ اس پروگرام کے مطابق ۱۷ر کی شام کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی دعوت پر اُن کی کوٹھی پر ارکانِ ادارہ ادبیات اُردو کے ساتھ چائے پی اور پھر ڈاکٹر صاحب نے مع اور چند ارکان کے ادارہ کے تمام صیغوں کا معائنہ کرایا۔ ادارہ اپنی گوناگوں اور ٹھوس ادبی خدمات کی وجہ سے ہندو پاک کا ایک نہایت موقر اور وقیع ادارہ ہے لیکن اس کے مختلف شعبوں کو دیکھنے کے بعد تو حیرت کے ساتھ مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہی ۔ قدیم مخطوطات، سکے، مکاتیب، تصاویر، کتبات؛ اردو زبان و ادب کے عہد بعہد نشو و نما سے متعلق مختلف چارٹ اور نقشے ۔ غرض کہ تاریخ اور ادبِ اردو پر ریسرچ کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اُن میں سے کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو یہاں موجود نہ ہو اور حسنِ سلیقہ سے رکھی ہوئی نہ ہو۔ اس کے علاوہ ادارہ کے کام خود نوع در نوع ہیں۔ اب تو ادارہ نے اُردو کے مصنفوں اور ادیبوں کی ایک نسل پیدا کر دی ہے جو زبان و ادب کی قابلِ قدر خدمات انجام دے رہی ہے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ

کیا کرایا ایک ہی شخص یعنی ڈاکٹر زور کا ہے۔ موصوف میں جہاں تحقیق اور تصنیف و تالیف کی اعلیٰ صلاحیت ہے ساتھ ہی تنظیمی قابلیت بھی بلند درجہ کی ہے، وہ خود بھی کام کرتے ہیں اور دوسروں سے کام لینا بھی خوب جانتے ہیں۔ آج کل بڑے سلیقہ اور شوق سے ادارہ کی اپنی بلڈنگ بنوا رہے ہیں۔ یہ بلڈنگ موجودہ پلان کے مطابق مکمل ہو گئی تو سچ مچ اُردو محل ہو گی۔ حیدرآباد کے مشہور اہل قلم نصیر الدین صاحب ہاشمی اور بعض مشاہیر حیدرآباد سے بھی چائے پر ملاقات ہوئی اور دیر تک گفتگو رہی۔ اسی روز شب میں چوک کی مسجد میں تقریر کا اعلان ہو چکا تھا لیکن ٹمپریچر ہو جانے کی وجہ سے اس کو منسوخ کرنا پڑا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لوگ دور دور سے بڑی تعداد میں آئے تھے اور جب میں نہیں پہنچا تو مجھ کو برا بھلا کہتے ہوئے واپس ہوتے والعلم عند اللہ!

۱۸ ار کو اکاڈمی آف اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام "ہم انسانیت کی بہترین خدمت کس طرح کر سکتے ہیں" کے موضوع پر تقریر ہوئی جو شام کے چھ بجے سے سات بجے تک ایک گھنٹہ جاری رہی اکاڈمی حیدرآباد کے ارباب علم کی خاص انجمن ہے چنانچہ اس جلسہ میں بھی یونیورسٹی کے ممتاز ہندو مسلم اساتذہ اور دوسرے ارباب علم کا بڑا اچھا منتخب اجتماع تھا۔ یونیورسٹی میں معاشیات کے استاد ڈاکٹر سید معین الدین قادری اکاڈمی کے جنرل سکریٹری اور ڈاکٹر سید عبد اللطیف اس کے صدر ہیں۔ اکاڈمی مقالات اور مذاکرات کی ماہانہ نشستوں کے علاوہ تصنیف و تالیف کے ذریعہ بھی انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلامیات کا علمی ذوق پیدا کر کے مفید خدمات انجام دے رہی ہے یہاں جو تقریر ہوئی تھی وہ صرف خواص کے سامنے تھی۔ ۱۹ ار کو مغرب کے بعد سکندرآباد کی جامع مسجد میں رحمۃ للعالمین کے موضوع پر ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی۔ اس اجتماع میں عوام اور خواص دونوں کا کثیر مجمع تھا افسوس ہے کہ اس دور میں بھی حیدرآباد میں دیوبندی اور بریلوی اختلافات کی بڑی گرم بازاری ہے چنانچہ جب میری تقریر کا اعلان ہوا اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں دیوبند سے نسبت رکھتا ہوں تو اُن میں بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں اور طرح طرح کی باتیں کہی گئیں۔ لیکن الحمد للہ! تقریر کے بعد جیسے گویا مطلع صاف

ہوگیا جو حضرات دیوبندی مسلک سے اختلاف رکھتے ہیں انھوں نے بھی مصافحہ کیا اور تقریر کی تعریف کی وجہ یہ ہے کہ میری تقریر ہمیشہ اسلام کی اصولی اور بنیادی تعلیمات پر ہوتی ہے۔ فروعی اور جزئیاتی مسائل سے میں تعرض نہیں کرتا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کو حیدرآباد پہنچتے ہی دیکھ لیا تھا۔ یہاں اب ذریعۂ تعلیم بجائے اُردو کے انگریزی ہے گویا

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا

ہندی اور کوئی علاقائی زبان اس لائق نہیں تھی کہ یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم بن سکے۔ لیکن بہرحال سالہائے دراز کے کامیاب تجربہ کے باوجود اردو کو برداشت کیا نہیں جا سکتا تھا اس لئے جو پورے ملک میں کہیں نہیں ہوا وہ یہاں ہوگیا یعنی اُردو کو ہٹا کر انگریزی کو اُس کی جگہ دے دی گئی

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اس کے علاوہ شعبۂ دینیات کا نام بدل کر مذہب و ثقافت رکھ دیا گیا ہے اور اب اسلامی دینیات کے ساتھ ایشیا کے مختلف مذاہب کی دینیات کی بھی تعلیم ہوتی ہے یہ عجب اتفاق ہے کہ جس وقت میں یونیورسٹی پہنچا اُسی وقت مولانا سید فضل اللہ شاہ صاحب شعبۂ مذہب و ثقافت" کی صدارت سے سبکدوش ہو رہے تھے اور ڈاکٹر یوسف الدین صاحب اُس کا چارج لے رہے تھے ۱۹۴۸ء میں جب میں پہلی بار حیدرآباد گیا تھا تو یونیورسٹی میں ہر طرف ترکی ٹوپیاں اور شیروانیاں نظر آتی تھیں۔ آج کل وہ بات نہیں ہے۔ لباس اور وضع قطع میں یکسانیت باقی نہیں رہی اُردو اگرچہ یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم نہیں ہے لیکن بعض کالجوں میں اب بھی ہے۔ آصفیہ لائبریری جس کا نام اب سنٹرل اسٹیٹ لائبریری ہوگیا ہے کئی مرتبہ جانا ہوا۔ ایک دن لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں کتابیں دیکھ رہا تھا کہ مس سمینہ شوکت سے ملاقات ہوئی یہ اُردو میں فرسٹ کلاس ایم۔ اے ہیں اور آج کل پی۔ ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھ رہی ہیں گفتگو سے کافی ذہین اور صاحبِ ذوق و نظر معلوم ہوتی ہیں کتب خانہ سعیدیہ جو

ڈاکٹر یوسف الدین صاحب کے خاندانی کتب خانہ کا صرف ۱/۴ حصہ ہے اس کو بھی دیکھا۔ اس میں پانچ ہزار عربی کے اور ایک ہزار فارسی کے مخطوطات ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ بعض کتابیں خود اصل مصنف مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں اور بعض کتابیں وہ ہیں جن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی ایسے نامور بزرگوں نے کئی کئی مرتبہ درس دیا ہے وقت کی کمی کا بہت افسوس رہا کتب خانہ کے محافظ اور کارکن دونوں بڑے خوش سلیقہ ہیں اور کتب خانہ کو جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ سر سالار جنگ کا کتب خانہ اور میوزیم بھی دیکھا۔ اللہ اکبر، دونوں چیزیں کس قدر عظیم الشان اور بلند مرتبہ ہیں اگر مقدور ہو تو بس!

نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

یہاں کیا کیا دیکھا اور کیا کیا محسوس کیا؟ اس کو قلم بند کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے اس لئے اور کچھ کیا لکھا جائے، اگر کسی شخص نے حیدر آباد جا کر اس میوزیم اور کتب خانہ کو نہیں دیکھا تو اُس کی بد ذوقی میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا! اس وقت میوزیم میں جو سامان ہے اُس کی قیمت کا اندازہ ۷۵ کروڑ روپیہ کیا گیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ سامان صرف ۱/۴ حصہ ہے اُن چیزوں کا جو سالار جنگ مرحوم نے دنیا کے کونہ کونہ سے جمع کی تھیں ابھی دو حصہ سامان غیر مرتب پڑا ہوا ہے اور میوزیم کی زینت نہیں بنا۔ اسی سلسلہ میں زنانہ کالج بھی جانا ہوا، یہ کالج اب سابق انگریز ریذیڈنٹ کے عالی شان محل میں منتقل ہو گیا ہے اس کی پرنسپل ہمیشہ کوئی انگریز خاتون ہوتی تھی مگر اب ڈھائی برس سے ڈاکٹر شری دیوی ایک ہندوستانی خاتون اس عہدہ پر فائز ہیں۔ موصوفہ نہایت لائق و قابل اور بڑی خوش اخلاق و شگفتہ مزاج خاتون ہیں۔ انگریزی کی تو مشہور مقررہ ہیں ہی اُردو بھی بہت اچھی بولتی ہیں۔ بڑے اخلاق سے پیش آئیں، پورے کالج کا معائنہ کرایا۔ ایک ایک شعبہ دکھایا۔ کالج کے اسٹاف کی دوسری ممبر خواتین سے ملاقات کرائی اس کالج میں آرٹس۔ سائنس میڈیکل گروپ۔ عربی۔ فارسی۔ اُردو، ہندی، تلنگو وغیرہ نو زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ پھر ذریعۂ تعلیم اُردو اور انگریزی دونوں زبانیں ہیں

اس لئے اسٹاف بہت وسیع ہے اور استانیاں ایک سے ایک قابل ہیں، پرنسپل اور دوسری استانیوں کو اس کا افسوس رہا کہ چوں کہ کالج موسم گرما کی تعطیل کے بعد اُسی دن کھلا تھا اور داخلہ شروع ہو رہا تھا اس لئے وہ کالج میں میری تقریر کا بندوبست نہ کرا سکیں۔ آئندہ کے لئے بہر حال ابھی سے انھوں نے تقریر کا وعدہ لے لیا ہے۔ پورا کالج دکھانے کے بعد پرنسپل صاحبہ نے اور چند ممبران اسٹاف کے ساتھ بڑی پُر تکلف چائے سے ضیافت کی میں ان سب کا دل سے شکر گذار ہوں، امید قوی ہے کہ کالج موجودہ لایق و فاضل پرنسپل کے ماتحت بڑی ترقی کرے گا۔

کھڑے کھڑے تھوڑی دیر کے لئے اسلامک کلچر کا دفتر بھی دیکھا انگریزی میں اسلامیات کا یہ بلند پایہ مجلہ اب تک تو جوں توں کر کے پابندی اور باقاعدگی سے نکلتا رہا ہے لیکن آئندہ اُس کی راہ میں دشواریاں معلوم ہوتی ہیں۔ اسٹیٹ اور سنٹرل گورنمنٹ کو اس پر توجہ کرنی چاہیئے۔ دائرۃ المعارف اور ادارۂ احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد کے مشہور علمی ادارے ہیں۔ ارادہ پختہ ان کے دیکھنے کا بلکہ چند کتابیں خریدنے کا بھی تھا مگر افسوس کہ وقت میں اس کی گنجائش ہی نہیں نکل سکی۔ اول الذکر ادارہ کی اگرچہ اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی ہے چنانچہ کتابوں کی تصحیح میں وہ اہتمام نہیں ہوتا جو اس ادارہ کا طرۂ امتیاز تھا پھر دفتری نظم و نسق کا معاملہ بھی یہ ہے کہ میں نے سال گذشتہ اپنے دفتر کی جانب سے بعض کتابوں کے سلسلہ میں دو تین خط لکھے مگر ایک کا بھی جواب نہیں ملا۔ تاہم حکومت کی سرپرستی میں یہ ادارہ اب بھی قایم ہے۔ یہ بھی لبا غنیمت ہے۔

حیدر آباد کے چہار روزہ قیام میں بزرگوں اور دوستوں نے جو کرم پاشی کی ہے بفحوائے من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ اُس کا تذکرہ بھی میرا اخلاقی فرض ہے مولانا سید فضل اللہ شاہ صاحب مولانا مونگیری صاحبِ خانقاہ رحمانیہ کے پوتے اور خود بلند پایہ اور وسیع النظر عالم اور صاحبِ ورع و تقویٰ بزرگ ہیں۔ مولانا نے بڑی تحقیق اور کاوش سے امام بخاری کی ادب المفرد کی شرح لکھی ہے جو مصر میں طبع ہو رہی ہے۔ صاحبِ علم و درس ہونے کے ساتھ دنیوی معاملات میں بھی بڑی سوجھ بوجھ

رکھتے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد میں چمڑے کی بنی ہوئی چیزوں کا کاروبار بڑے پیمانہ پر کر رہے ہیں اور اُس کی وجہ سے بہ وجوہ "رئیس العلماء" کہلانے کے مستحق ہیں۔ عرصہ دراز سے اس ناچیز کو مولانا کی شفقتِ بے غایت کا شرف حاصل ہے۔ لیکن اس مرتبہ براہِ راست مولانا کا مہمان بننے کی سعادت حاصل ہوئی تو مولانا کی فیاضی۔ عالی حوصلگی اور غیر معمولی دل جوئی نے قدم قدم پر شرمندہ کر دیا۔ روزمرہ کے تمام مشاغل چھوڑ چھاڑ ہر وقت میرے ساتھ ہیں اور صبح سے شام تک کی ٹیکسی کے سخت گراں اخراجات میرے سخت اصرار کے باوجود خود اُٹھا رہے ہیں۔ جانتے ہیں کہ میں صبح کو ناشتہ میں صرف دو پیالی چاء اور ایک چھوٹے سے بسکٹ کے علاوہ کوئی اور چیز بالکل نہیں کھا سکتا مگر اس کے باوجود روزانہ دسترخوان پر الوانِ نعمت جمع ہو رہے ہیں یہ سب کچھ لکھا تو گیا میرے ہی حساب میں لیکن کام آیا میرے رفیقِ سفر محمد اظہار الحق صاحب بی کام کے جن کو میں بطور سکریٹری لے گیا تھا اور ان حضرات کے جو صبح کے وقت مجھ سے ملنے آتے تھے میری طبیعت خراب ہو گئی تو گھڑی گھڑی مولانا دوا پلا رہے ہیں۔ شب میں دو بجے تین بجے اُٹھ کر میری نبض دیکھ رہے ہیں۔ ہوا سرد ہو گئی تو چادر اُڑھا رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ کے فضل و کرم سے گھر میں نوکر چاکر سب موجود ہیں مگر میرا ہر کام خود کر رہے ہیں۔

اللہ اکبر! یہ تصوف کا ذوقِ لطیف بھی انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ پھر اگر صوفیائے اسلام کو دیکھ کر ہی کافر مسلمان ہو گئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میں ہیچمیرز مولانا اور مولانا کی رابعہ فطرت اہلیہ محترمہ کا کیا شکریہ ادا کر سکتا ہوں۔ بس اللہ رب العلمین دونوں کو میری طرف سے اس خلاص و محبت کا اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر میر ولی الدین عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ فلسفہ ہیں اور تصوف پر اپنے مقالات اور تصنیفات کی وجہ سے ہند و پاک میں مشہور ہیں۔ حد درجہ مخلص اور شریف ہیں۔ دیرینہ تعلق کے باعث کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ ۱۸ر کی شام کو طعام شب پر یونیورسٹی کے متعدد اساتذہ اور دوسرے اربابِ علم کے ساتھ مدعو کیا تھا یہ مجمع بڑا منتخب تھا۔ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد

دیر تک علمی مذاکرہ رہا۔

سید مظہر احسن صاحب گیلانی ایم۔اے مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے برادر خورد اور عثمانیہ یونیورسٹی میں معاشیات کے استاذ ہیں مولانا گیلانی کے ساتھ ہم لوگوں کو جو تعلق تھا اُس کی وجہ سے بالکل برادرانہ گرم جوشی اور محبت سے پیش آئے۔ ۱۷ر کو طعام شب پر پہلے سے مدعو کر رکھا تھا پرنسپل عبدالقادر۔ شری دلیش پانڈے کنٹرولر آف اکزامینیشنز اور پرنسپل متیاز علی وغیرہ اصحاب بھی مدعو تھے اس لئے ان حضرات سے خوب بات چیت رہی اور طبیعت محظوظ ہوئی۔ ڈاکٹر راحت اللہ خاں ایم۔اے ڈی فل میرے دیرینہ حمیم صمیم اور مخلص دوست ہیں یہ سنٹرل اسٹیٹ لائبریری (سابق آصفیہ) کے لائبریرین اور بڑے باوضع انسان ہیں ان سے بار بار ملاقات رہی اور ایک دن لنچ اور ۱۹ر کو عشائیہ (ڈنر) انھیں کے ہاں کھایا۔ محترمہ سعید جہاں بیگم حیدر آباد کے ایک ممتاز خاندان کی چشم وچراغ ہیں۔ اُردو کے ساتھ عربی میں فرسٹ کلاس ایم اے ہیں اور کامل التفسیر بھی ہیں پھران سب پر مستزاد یہ کہ عشرہ قرأت کی ماہر ہیں۔ پہلے حکومت کے محکمۂ تعلیم میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھیں اب اُس سے مستعفی ہو کر لڑکیوں اور عورتوں کو تجوید وقرأت کی تعلیم وتدریس کی خدمت انجام دے رہی ہیں اور یونیورسٹی سے پی۔ایچ ڈی بھی کر رہی ہیں۔ از راہ کرم خود میرے قیام گاہ پر آئیں اور بڑے اصرار کے ساتھ کھانے پر مدعو کر گئیں۔ چنانچہ ۲۰ر کو جمعہ کی نماز کے بعد موصوفہ کی کوٹھی پر پُر تکلف کھانا کھایا یہیں کھانے پر آں محترمہ کے والد ماجد جناب محمد ابراہیم صاحب ان کے بھائی جناب محمد الیاس صاحب ایڈووکیٹ۔ قاری بسم اللہ بیگ صاحب۔ خواجہ محمد احمد صاحب ایم۔اے اور دوسرے حضرات سے ملاقات ہوئی۔ کھانے سے فراغت کے بعد میری درخواست پر محترمہ سعید جہاں بیگم نے عشرہ قرآت سنائیں۔ اول تو عشرہ قرآت اور پھر وہ بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون کی زبان سے! یہ زندگی میں میرا پہلا تجربہ تھا۔ طبیعت بے حد متاثر اور محظوظ ہوئی اور بے ساختہ دل سے دعا نکلی کہ خدا اپنی برکتیں نازل فرمائے اُس گھرانہ پر جس میں قرآن مجید کے ساتھ شغف

رکھنے والی ایسی خاتون ہو۔ یہ پورا گھر شرافت و نجابت اور اعلیٰ تہذیب و ثقافت کا مظہر ہے
قاری بسم اللہ بیگ صاحب جن کا ذکر اوپر آیا حیدرآباد کے نامور قاری ہیں پہلے فوج میں بریگیڈیر
تھے اب اُس سے سبکدوش ہو کر شب و روز فنِ تجوید کی خدمت میں مصروف ہیں۔ سیدجہاں
انھیں کی شاگرد ہیں۔ جناب قاری صاحب سے یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ آج کل حیدرآباد
میں تین سو فن تجوید کے ماہر مرد و عورت ہیں جو مردوں اور عورتوں کو قرأت کی تعلیم دے رہے
ہیں۔ اللھم زد فزد۔ ہمارے اطراف میں جگہ جگہ ناچ اور گانا اور حیدرآباد میں تجوید کا یہ عام ذوق!
یہ حیدرآباد کے مسلمانوں کے روشن مستقبل کی دلیل ہے۔ خدا اُن کا حامی و ناصر اور کفیل ہو۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے نامور ادیب اور
مصنف ہیں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے برادر خورد تو ہیں ہی صورت اور سیرت میں بھی اُن
کے مثنیٰ ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں پالیٹکل سائنس کے پروفیسر تھے۔ اب اس سے سبکدوش ہو کر
مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے پرووائس چانسلر ہو کر جا رہے ہیں موصوف نے مولانا سید فضل اللہ
صاحب کی معرفت ۱۹ر کی شام کو چار پر مدعو کیا۔ دیر تک علمی اور مذہبی مسائل پر گفتگو رہی۔ ڈاکٹر
صاحب کی کوٹھی جوبلی ہل پر ایسے عمدہ موقع سے ہے کہ جی میں آیا کہ اگر ڈاکٹر صاحب مجھ کو اپنے
یہاں قیام کی دعوت دیں تو چاہے کچھ ہو جائے حیدرآباد میں پانچ چھ دن قیام کی اور گنجائش
نکال لوں۔ اردو زبان کے نامور ادیب اور مصنف پروفیسر عبدالقادر سروری میرے دیرینہ
کرمفرما اور دوست ہیں۔ اُن سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ اور بڑے اخلاص اور محبت سے
پیش آئے ہر چند انھوں نے کوشش کی میرے پروگرام میں کسی طرح ایک وقت اُن کے ہاں
کھانا کھانے کی گنجائش نکل آئے۔ مگر ممکن نہ ہوا اور خود مجھ کو بھی اس کا افسوس ہے کہ میں ان کے
مکان پر چند منٹ کے لئے بھی حاضر نہ ہو سکا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے حیدرآباد میں جو ایک
نئی نسل ایسے لوگوں کی پیدا کی ہے جو علومِ جدیدہ کی اعلیٰ ڈگریاں رکھنے کے ساتھ علوم اسلامیہ

و دینیہ کے بھی مُبَصِّر اور مُحَقِّق ہیں اور یہ صرف علماً نہیں بلکہ عملاً بھی۔ ڈاکٹر یوسف الدین صاحب
اس نسل کے گلِ سر سبد ہیں عمر چالیس سے زیادہ نہیں ہو گی مگر اب تک انگریزی اور اردو
میں متعدد اہم علمی کتابیں لکھ چکے ہیں آج کل مسند عبد الرزاق کو اڈٹ کر کے خود اس کی اشاعت
میں منہمک ہیں مولانا گیلانی اور ان کے واسطہ سے حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہؒ کے گویا
نام کے عاشق ہیں۔ میری ان کی صرف ایک سرسری ملاقات کئی برس ہوئے کلکتہ میں ہوئی تھی۔
لیکن علمی۔ روحانی اور معنوی تعلق کی وجہ سے اس مرتبہ حیدر آباد میں اس خلوص و محبت کا معاملہ
کیا کہ میں اُس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ کئی بار قیام گاہ پر تشریف لائے۔ اکثر تقریبات میں شریک
رہے اور پھر یونیورسٹی سے رخصت لے کر ایک دن تو مسلسل چھ سات گھنٹے ساتھ رہے۔ موصوف
ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے بھتیجے ہیں۔ یہ خاندان کس قدر خوش نصیب ہے جس میں بیک وقت علومِ جدیدہ
کے ساتھ علومِ اسلامیہ کے ماہر۔ اور عملاً دین کے سچے خادم دو دو شخص پیدا ہو گئے ہیں اور مشرق
و مغرب کی علمی دنیا میں اسلام کا نام روشن کر رہے ہیں۔ بارک اللہ فی اعمارہم و اعمالہم

خواجہ حمید الدین شاہد ایم۔ اے چادر گھاٹ کالج میں لکچرر ادارۂ ادبیات اردو کے رکنِ رکین
اور اردو کے ادیب و صاحبِ قلم ہیں۔ سراپا خلوص و محبت ہیں۔ میرے ساتھ اس طرح ملتے
تھے کہ گویا ان کے گھر میں عید آ گئی ہے۔ روزانہ کئی کئی گھنٹے ساتھ رہے اُن کا متبسم چہرہ اور جذباتی
انداز میں اظہارِ محبت اب بھی رہ رہ کر یاد آتا ہے۔ خدا ان کو خوش رکھے اور سکونِ قلب عطا فرمائے۔
ان حضرات کے علاوہ مولانا محمد علی حیدر آبادی۔ مولانا محمد حامد صدیقی۔ مولانا سید حسین قادری
شور ایم۔ اے۔ محمد جمال شریف صاحب ایم۔ اے۔ جناب عبد الوہاب صاحب بی۔ اے۔
مولوی محمد نعیم صاحب کا بھی صمیم قلب سے شکر گذار ہوں کہ برابر کرم فرماتے رہے اور تشریف لاتے
رہے۔ حیدر آباد کے بزرگوں میں مولوی عبد الرحمٰن خاں صاحب صدر حیدر آباد اکاڈمی۔ پروفیسر
ہارون خاں شیروانی۔ مولانا حکیم مقصود علی خاں صاحب۔ حکیم الشعراء حضرت امجد سے دیرینہ
تعلق نیازمندی کا ہے۔ اس لئے اس بھاگ دوڑ میں کھڑے کھڑے ان کے ہاں بھی حاضری دی۔

یہ حضرات اب زندگی کی بہاریں لٹا کر اس کے دورِ خزاں سے گذر رہے ہیں۔ امجد صاحب تو آنکھوں سے بھی معذور ہو گئے ہیں۔ حکیم صاحب انقلابِ روزگار کی خاموش تصویر بن کر رہ گئے ہیں البتہ صد آفریں ہے مولوی عبدالرحمن خاں صاحب اور پروفیسر شیروانی کو کہ اس ضعیف العمری میں بھی برابر علمی کاموں میں مصروف ہیں اور اُن کا ایک لمحہ بے کار نہیں۔ پروفیسر صاحب نے بڑا کرم فرمایا کہ اکاڈمی میں میری تقریر میں بھی موجود تھے۔ اور پھر اسٹیشن پر الوداع کہنے بھی آئے تھے۔ اگرچہ راستہ میں موٹر کے خراب ہو جانے کی وجہ سے اسٹیشن پر اُس وقت پہنچے جب کہ ٹرین روانہ ہو چکی تھی۔ مولانا حمید الدین قمر سنبھلی میرے بچپن کے ساتھی اور دوست ہیں۔ لیکن اُن سے ملاقات صرف ان دو جلسوں میں ہوئی جن میں میری تقریر تھی معلوم نہیں کیوں کچھ شرمائے شرمائے اور لجائے سے رہے۔

اب کہ یہ داستان ختم ہو رہی ہے اپنے چند تاثرات کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے۔ میں نے نامی گرامی مسلم اداروں میں دیکھا ہے کہ کسی تقریب یا جلسہ کے موقع پر اگر عصر یا مغرب کی نماز کا وقت آگیا ہے تو دو چار نمازیوں نے اٹھ کر فریضۂ خداوندی ادا کر لیا ہے اور باقی لوگ یونہی بیٹھے رہے ہیں۔ لیکن حیدر آباد میں دیکھا کہ اکاڈمی کے جلسے میں میری تقریر نماز مغرب کے وقت ختم ہوئی تو باقاعدہ صفیں بچھی ہوئی تھیں اور بلا استثنا ایک اونچے سے اونچے درجے کا پروفیسر بھی ایسا نہیں تھا جس نے جماعت سے نماز نہ پڑھی ہو۔ یہاں تک کہ جو خاتون شریکِ جلسہ تھیں انھوں نے بھی الگ نماز ادا کی۔ اسی طرح ڈاکٹر میر ولی الدین کی کوٹھی پر یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے جو اساتذہ اور دیگر حضرات موجود تھے پہلے ان سب نے جماعت سے عشا کی نماز پڑھی اور اس کے بعد کھانا کھایا۔ ظاہر ہے کہ ان حضرات میں ہر شخص پنجوقتہ نماز کا پابند نہیں ہوگا۔ لیکن اسلامی شعائر کا ادب و احترام بھی آخر کوئی چیز ہے۔ میرے خیال میں یہ سب کچھ نتیجہ ہے اس بات کا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں بی۔ اے تک دینیات ایک لازمی مضمون تھا اور پھر اس شعبہ کا صدر تھا مولانا گیلانی جیسا شخص جس نے انگریزی تعلیمیافتہ طبقہ میں دین کی لگن پیدا کر دی۔ اعلی اللہ مقامہ

لیکن افسوس ہے آپس کے اختلاف و افتراق سے حیدر آباد کے مسلمان بھی بچے ہوئے نہیں ہیں۔ علماء میں باہم چپقلش۔ علماء اور مشائخ میں کشمکش۔ ادارہ ادارہ کا حریف۔ اردو زبان وادب کے کارکن ایک دوسرے سے دست و گریباں۔ اختلاف کی یہ نوعیت کسی طرح بھی مستحسن نہیں لیکن موجودہ دور میں بھی اگر باہمی رواداری کے ساتھ مل جل کر کام نہ کر سکے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ گردشِ روزگار نے اب تک ہماری آنکھ نہیں کھولی ہے اور شاید ہم ابھی کسی اور بڑے انقلاب کا انتظار کر رہے ہیں۔ افسوس ہے بہت سے حضرات جو وقتاً فوقتاً کرم فرماتے رہے اور جو اسٹیشن پر بھی الوداع کہنے کے لئے تشریف لائے تھے اُن کے نام محفوظ نہیں رہ سکے۔ تاہم ان کا اخلاص رسمی شکریہ سے بالا ہے۔ فجزاھم اللہ عنّی۔

۲۰ کو محترمہ سعید جہاں بیگم کے ہاں کھانا کھاتے ہی ان کے بھائی کی موٹر میں سیدھا اسٹیشن پہنچا۔ اور چار بجے کی ٹرین سے روانہ ہو گیا۔

تاریخِ ملّت کا گیارہواں حصّہ

سلاطینِ ہند

جلد دوم

اس جلد میں سلاطینِ کشمیر، شاہانِ گجرات، سلاطینِ بہمنیہ، عماد شاہی، قطب شاہی، عادل شاہی وغیرہ مملکتوں کے ساتھ شاہانِ مغلیہ ظہیر الدین بابر سے لے کر بہادر شاہ ثانی کے زمانے تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ تاریخِ ملّت کا یہ سلسلہ جامعیت و اختصار کے ساتھ استناد و اعتبار کے لحاظ سے بہترین سمجھا گیا ہے۔

قیمت غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے۔

مجلد تین روپے بارہ آنے۔

اسلام کا نظامِ امن وامان

از
(جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی مرتب فتاوی دار العلوم دیوبند)

(۳)

قتل وخوں ریزی کو بند کرنے کی سعی جس قدر اسلام نے کی ہے، وہ اپنی آپ مثال ہے، اور اس سلسلہ میں مؤثر سے مؤثر جو اسلوب بیان ہو سکتا ہے، وہ سب اختیار کیا گیا ہے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لایزال المومن معنقا صالحا مالم یصب دما حراما فاذا اصاب دما حراما بلح رواہ ابوداؤد (مشکوٰۃ)	مومن ہمیشہ نیکیوں کی طرف تیزی کرنے والا نیکوکار ہوتا ہے جب تک وہ حرام خون نہیں کرتا، جب وہ اس گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ تھک جاتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا بیان ہے، ان مہلک امور میں سے جن میں انسان اپنے آپ کو ڈال کر بچا نہیں سکتا اور اس کی ہلاکت ضروری ہے، یہ بھی ہے کوئی ناحق خون بہائے، جس کی کوئی شرعی وجہ نہ ہو[1]

اعانت قتل اسلام کی نظر میں اسلام ناحق قتل وخوں ریزی کو ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کرتا، ایک طرف وہ طرح طرح سے ان لوگوں کی مشکیں باندھتا ہے، جو اس میں آلودہ ہو کر خطا اٹھانے کے عادی ہو گئے ہیں، دوسری طرف عوام کو منع کرتا ہے کہ وہ اپنے کسی عمل سے قاتل کی حوصلہ افزائی نہ کریں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

من اعان علی قتل مسلم ولو بشطر	جو شخص کسی مسلمان کے قتل میں کوئی مدد کرے گا،

---

[1] بخاری کتاب الدیات ج ۲ ص ۱۰۱۳

کلمۃ جاء یوم القیامۃ مکتوبا بین عینیہ آیس من رحمۃ اللہ

(ابن کثیر ج ۱ ص ۳۳۵)

خواہ وہ ایک کلمہ ہی سے کیوں نہ ہو، تو وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا "خدا کی رحمت سے مایوس"

انسانی فریضہ | پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایسے موقع پر ایک مسلمان کا فریضہ یہ ہے کہ قاتل کا ہاتھ تھام لے، اور اس کو اس جرم عظیم سے جس طرح بن پڑے روک دے، ارشادِ نبوی ہے

لا یقفن احد منکم موقفا یقتل فیہ رجل ظلما فان اللعنۃ تنزل علی من حضرہ حین لم یدفعوا عنہ ولا یقفن احد منکم موقفا یضرب فیہ رجل ظلما فان اللعنۃ تنزل علی من حضرہ حین لم یدفعوا عنہ (جمع الفوائد ج ۱ ص ۲۷)

تم میں سے کوئی ایسی جگہ موجود نہ ہو، جہاں ظلم و جور سے ایک انسان قتل کیا جا رہا ہو، مگر با ایں ہمہ وہ اس کی طرف سے مدافعت نہیں کرتا تو وہ قابل لعنت ہے جس پر لعنت نازل ہوتی رہتی ہے اور تم میں سے کوئی ایسی جگہ موجود نہ ہو! جہاں ظلما ایک شخص کو زد و کوب کیا جا رہا ہے مگر پھر بھی وہ اسے نہیں بچاتا اور نہ اس کی حمایت میں لڑتا ہے تو وہ مستحق لعنت ہے کہ اس پر لعنت برستی ہوگی، جب اس کی طرف سے لوگ مدافعت نہ کریں۔

جس طرح ایک مسلمان کا فریضہ یہ ہے کہ ظالم کو پوری قوت کے ساتھ ظلم سے روک دے، اور خونِ ناحق سے قاتل کو بچالے، اسی طرح اس مقتول کی جان بچانا بھی حتی الوسع انسانی فریضہ ہے۔

اشارۂ قتل کا حکم | قتل کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ انسان خود تو اپنا ہاتھ خون آلودہ نہ کرے، مگر اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر کسی دوسرے کو اس سلسلہ میں استعمال کرے، اور

اس کے ذریعہ کسی بے گناہ کا سر قلم کرنے کی ناپاک کوشش کرے، اسلام اس صورت کو بھی برداشت نہیں کرتا، اور اصل مجرم صاحبِ اثر و رسوخ ہی کو قرار دیتا ہے، حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قاتل اور آمر کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا

قسمت النار سبعین جزأ فللآمر تسعۃ وستون وللقاتل جزء (جمع الفوائد عن احمد ج ا ص ۲۷۵)	آگ ستر حصوں میں بانٹ دی گئی ہے ان میں سے انہتر حصے اس کے لئے ہوں گی جو قتل کا حکم دیتا ہے اور صرف ایک حصہ اس قاتل کے لئے ہوگی جو دوسرے کے کہنے سے قتل کرتا ہے

اسی طرح حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن قاتل و مقتول لائے جائیں گے، پس مقتول کہے گا، اے رب! پوچھئے کہ اس نے مجھے کس قصور پر قتل کیا، قاتل آمر کی طرف اشارہ کر کے جواب دے گا، اس نے مجھے حکم کیا تھا چنانچہ ان دونوں قاتل و آمر کے ہاتھ پکڑے جائیں گے اور دونوں کو ایک ساتھ جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔[1]

خودکشی قتل کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود اپنے کو ہلاک کر ڈالے، جس کو خودکشی سے تعبیر کرتے ہیں، اس صورت میں بھی چوں کہ انسانی جان کا ضائع کرنا ہوتا ہے، اس لئے اسلام نے خودکشی کو بھی پوری قوت کے ساتھ روکا ہے اور ترہیب کے وہ تمام ذرائع استعمال کئے ہیں، جس سے ڈر کر انسان اس کام سے باز آجائے، بلکہ اس کو ایسے ارادہ کی جرأت تک نہ ہو، خود قرآن میں اعلان ہے

ولا تقتلوا انفسکم (النساء - ۵)	اور تم اپنی جانوں کو قتل نہ کرو

آگے اس کی سزا کا بھی تذکرہ ہے ارشادِ ربانی ہے

ومن یفعل ذالک عدوانا وظلما فسوف نصلیہ نارا (النساء - ۵)	اور جو کوئی تعدی اور ظلم سے یہ کام کرے گا، ہم اس کو آگ میں ڈالیں گے۔

---

[1] جمع الفوائد ج ا ص ۲۷۵

لا تقتلوا کے کئی معنی بیان کئے گئے ہیں، مگر ظاہر الفاظ سے خود کشی کی ممانعت بھی ثابت ہوتی ہے، اور خاکسار نے اسی لئے اس آیت کو یہاں نقل کیا ہے اور حدیثیں تو اس سلسلہ میں کافی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

ومن قتل نفسہ بشئی فی الدنیا عذب بہ یوم القیامۃ (مسلم ج ۱ صـ ۷۲)

جو شخص جس چیز سے دنیا میں خود کشی کرے گا قیامت میں اسی کے ساتھ اسے عذاب دیا جائے گا۔

ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں

ومن ذبح نفسہ بشئی ذبح بہ یوم القیامۃ (ایضا)

جو جس چیز سے اپنے آپ کو دنیا میں ذبح کرے گا، وہ اسی چیز سے قیامت میں ذبح کیا جائے گا۔

خود کشی کی سزا ایک حدیث میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کشی کرنے والے کا حشر بیان کیا، کہ وہ کس طرح کے عذاب میں قیامت کے دن مبتلا ہوگا، خود کشی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے کو کسی اونچی جگہ سے گرا کر ہلاک کر ڈالے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ زہر پی کر اپنے کو موت کے گھاٹ اتار لے، اور تیسرا طریقہ اپنے کو ذبح کر لینا ہے، ان کے علاوہ بھی طریقے ہیں، مگر کسی صورت میں اسے معاف نہیں کیا جائے گا، آپ نے فرمایا

من تردی من جبل فقتل نفسہ فھو فی نار جھنم یتردی فیھا خالدا مخلدا فیھا ابدا، ومن تحسی سما فقتل نفسہ، فسمہ فی یدہ یتحساہ فی نار جھنم خالدا مخلدا فیھا ابدا، ومن قتل نفسہ بحدیدۃ فحدیدتہ فی یدہ یتوجا بھا فی بطنہ فی نار جھنم خالدا

جو شخص پہاڑ سے گرا کر اپنے آپ کو مار ڈالتا ہے وہ مرنے کے بعد جہنم کی آگ میں گرتا جائے گا جس میں اسے ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے اور جو شخص زہر پی کر اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا اور جہنم کی آگ میں وہ اس کو ہمیشہ پیتا رہے گا اور جو اپنے آپ کو کسی ہتیار سے مار ڈالتا ہے تو اس کا وہ ہتیار اس کے ہاتھ میں ہوگا اور جہنم کی دہکتی آگ میں اسے ہمیشہ اپنے

مخلدا فیھا ابداً (للستۃ الاماالکا) پیٹ میں بھونکتا رہے گا۔

(جمع الفوائد ج ا ص۲۷۵)

اپنا آپ گلا گھوٹنے کے متعلق ارشادِ نبوی ہے

الذی یخنق نفسہ یخنقھا فی النار جو شخص اپنا آپ گلا گھوٹتا ہے جہنم کی آگ میں (جمع الفوائد) (اسی طرح) گھونٹتا رہے گا۔

اپنے آپ کو بھالا، نیزہ، اور بندوق کی گولی مار لینا، اس کے متعلق ارشادِ نبوی ہے

والذی یطعن نفسہ یطعنھا اور جو اپنے کو نیزہ مار کر ہلاک کرتا ہے وہ جہنم کی فی النار۔ للبخاری (ایضاً) آگ میں اپنے آپ کو نیزہ مارتا رہے گا۔

قتل کا ارادہ اور اس کا حکم | قاتل کے جذبہ کی خواہ وہ کسی بھی ناجائز موقع سے ہو، اسلام مذمت کئے بغیر نہیں رہتا، چنانچہ ایک دفعہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب دو مسلمان تلوار لے کر باہم مقابلہ کے لئے نکلیں، اور کوئی ان میں سے مارا جائے، تو قاتل و مقتول دونوں ہی جہنم میں جائیں گے، پوچھا گیا کہ قاتل تو اپنے جرم میں جائے گا لیکن مقتول کیوں؟ آپ نے فرمایا

انہ کان حریصاً علی قتل صاحبہ اس لئے کہ وہ اپنے ساتھی کے قتل کا خواہش (بخاری ج ا ص۹) مند تھا۔

ہتھیار پر کنٹرول | اور یہی وجہ ہے کہ قتل تو بہرحال قتل ہے، اسلام یہ بھی پسند نہیں کرتا آدمی ایسی ہیئت اختیار کرے جس سے کسی کو زخم پہنچنے کا معمولی اندیشہ بھی ہو، یا کسی کے قلب میں اس کی طرف سے شبہ بھی پیدا ہو، ارشادِ نبوی ہے

من حمل علینا السلاح فلیس جو ہم مسلمانوں پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے منا رواہ البخاری) نہیں ہے

حافظ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں

المراد من حمل علیهم السلاح لقتالهم لما فیه من ادخال الرعب علیهم لا من حمله لحراستهم (فتح الباری ج ۱۲ صـ ۱۲۳)

یعنی مراد یہ ہے کہ جو مسلمانوں سے قتال کے لئے ہتھیار اٹھائے، اس لئے کہ اس صورت میں ان کو مرعوب کرنا ہے، ہاں وہ مطعون نہیں ہے جو مسلمانوں کی حفاظت کے لئے ایسا کرے۔

ننگی تلوار کا حکم | رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ننگی تلوار لے کر چلنے کی ممانعت فرمادی تھی، کہ مبادا کسی کو دھوکہ سے کوئی خراش آجائے، یا کسی کو قلب کی کمزوری کی وجہ سے ننگی تلوار دیکھ کر خطرہ محسوس ہونے لگے۔

نهی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ان یتعاطی السیف مسلولا

(رواہ الترمذی ومشکوٰۃ کتاب القصاص)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا کہ ننگی تلوار لی۔ دی جائے۔

تلوار اٹھانے کا گناہ | قتل وخون کی برائی ذہن نشین کرنے اور دنیا سے فتنہ وفساد کے مٹانے کے لئے آپ نے ارشاد فرمایا

لجهنم سبعة ابواب، باب منها لمن سل السیف علی امتی او علی امة محمد رواہ الترمذی

(مشکوٰۃ کتاب القصاص)

دوزخ کے سات دروازے ہیں، ان میں سے ایک دروازہ اس مجرم کے لئے ہے جو میری امت یا امت محمد صلعم پر تلوار چلائے،

گویا کوئی ایسا پیرایہ باقی نہ چھوڑا گیا، جس سے امت کا ذہن اس سلسلہ میں راہِ راست پر لگ سکتا تھا، مختلف انداز سے کوشش کی گئی ہے، کہ انسان قتل اور خوں ریزی کے نقصان کو سمجھ کر اس سے بے زاری کا اعلان کر دے اور فتنہ وفساد سے ہاتھ اٹھالے، ایک موقع سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

من اشار الی اخیہ بحدیدۃ فان الملائکۃ تلعنہ حتی یضعہا وان کان اخاہ لابیہ وامہ رواہ البخاری (مشکوٰۃ کتاب القصاص)

جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرتا ہے اس پر فرشتے لعنت کرتے ہیں، تاآنکہ وہ اسے رکھ نہ دے، اگرچہ وہ اس کا سگا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں

آنجا قصد وجد گنجائش ندارد، مجرد ہزل و لعب خواہد بود، باوجود آں متوجہ می شود لعنت نبوی مبالغہ است در نہی (اشعۃ اللمعات ج ۳ ص۲۵۲)

اس حدیث میں اشارہ سے مراد ہنسی مذاق کے طور پر ہے، کیوں کہ قصد وارادہ کے معنی لئے جانے کی گنجائش نہیں ہے اور باایں ہمہ پھر بھی لعنت کا متوجہ ہونا قابل عبرت ہے، گویا اس سے شدت کے ساتھ روکنا ہے

پیرایۂ بیان ہر موقع سے ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ انسانی ذہن میں انسانی خون، اور امن و امان کی قدر و قیمت مضبوطی سے جم جائے، اور پھر اس کو اس سلسلہ میں مزید سوال کی ضرورت باقی نہ رہے۔

اسلام کے سوا یہ اہتمام انسانی امن و امان کا کہاں مل سکتا ہے؟ اور ہمارے اس موجودہ دور میں ایسے امن وامان کا تصور بھی نہیں ہو سکتا ہے، اور کیسے ہو سکتا ہے جب کہ جانوروں کی قدر و قیمت انسان کے مقابلہ میں مذہبی نہج سے زیادہ ہو، یہ تو اسلام ہی کو فخر ہے کہ اس نے پوری قوت سے انسانی احترام کی برتری کا اعلان کیا، اور ساری مخلوقات کو اس کا تابع اور خدمت گزار قرار دیا۔

ہتھیار کو چھپا کر رکھنا چاہیئے | کھلے ہتھیار سے اشارہ کرنے کو کیوں روکا گیا؟ خود حدیث ہی میں اس کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں کوئی اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرے۔

فانہ لا یدری لعل الشیطان ینزع فی یدہ فیقع فی حفرۃ من النار (متفق علیہ ایضاً)

کیوں کہ اسے خبر نہیں کہ شاید شیطان وسوسہ ڈال دے اور ہاتھ غلطی پر آمادہ ہو جائے اور اس طرح وہ جہنم کے غار میں جا پڑے۔

اسلام نے یہ بھی بیان کر دیا ہے کہ دھار تیز ہتھیار کس طرح لے کر چلنا چاہیئے اس سلسلہ میں تاکید ہے کہ طریقہ ایسا ہو کہ جس سے نہ کسی کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ رہے اور نہ کسی کے قلب میں کوئی خطرہ پیدا ہو سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اذا مر احدکم فی مسجدنا او فی سوقنا ومعہ نبل فلیمسک علی نصالہا ان یصیب احدا من المسلمین منہا بشیئ متفق علیہ (ایضاً)

تم میں سے جب کوئی مسجد یا بازار سے گذرے اور اس کے ساتھ میں تیر ہو، تو اسے چاہیئے کہ اس کی پھلی کو تھام لے، تاکہ دھوکہ سے بھی کسی مسلمان کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

اس حدیث میں مسجد اور بازار کا تذکرہ ہے، لیکن مراد ہر وہ جگہ ہے جہاں آدمیوں کا مجمع ہو خواہ وہ دینی عبادت کی وجہ سے، یا دنیاوی ضرورتوں کی وجہ سے، چنانچہ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے

وسائر مجامع در حکم آنست (اشعۃ اللمعات)

تمام مجامع اسی حکم میں ہیں۔

خون میں مساوات پھر یہ کہ انسانی جانوں کا یہ احترام ایسا ہے، جس میں آزاد و غلام، امیر و غریب سلطان و گدا کسی کی کوئی تمیز نہیں، سب کے لئے حکم برابر ہے، اور سب کی جان لائقِ صد احترام ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

المسلمون تتکافأ دماءھم

مسلمانوں کے خون برابر ہیں

(مشکوٰۃ کتاب القصاص)

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اس حدیث کے ضمن میں رقمطراز ہیں

گفت آں حضرت مسلمانان برابر است

آں حضرت صلعم نے فرمایا کہ مسلمانوں کے خون

خونہا ایشاں در قصاص و دیت فضل نیست دراں شریف را بر وضیع و کبیر را بر صغیر، و عالم را بر جاہل و مرد را بر زن بر خلاف عادت جاہلیت (اشعۃ اللمعات ج ۳ ص ۲۳۷)

مسئلہ قصاص و دیت میں برابر ہیں، اس باب میں نہ شریف کو کمینہ پر فضیلت ہے، نہ بڑے کو چھوٹے پر، نہ عالم کو جاہل پر، اور نہ مرد کو عورت پر، جیسا کہ جاہلیت میں تھا، اسلام اس کے برعکس مساوی درجہ کرتا ہے

غلام کے خون کا احترام چنانچہ حضرت سمرہؓ کا بیان ہے کہ رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

من قتل عبدہ قتلناہ ومن جدع عبدہ جدعناہ رواہ الترمذی (مشکوٰۃ کتاب القصاص)

جو شخص اپنے غلام کو قتل کرے گا، ہم اسے قتل کریں گے جو اپنے غلام کی صورت بگاڑے گا ہم اس کی صورت بگاڑیں گے۔

قتل پر اعانت اور اس کی سزا قتل پر ادنیٰ اعانت بھی جائز نہیں ہے جس کی تفصیل قصاص کی بحث میں آئے گی، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اذا امسک الرجل وقتلہ الآخر یقتل الذی قتل ویحبس الذی امسک رواہ الدارقطنی (ایضاً)

جب کسی شخص کو ایک شخص تھام رکھے اور دوسرا قتل کرے تو جس نے قتل کیا ہے وہ قصاص میں قتل کیا جائے گا اور جس نے پکڑا ہے اسے قید کیا جائے گا۔

حضرت شیخ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں

اما پوشیدہ نماند کہ ایں اعانت است و در اعانت بر قتل بحکم احادیث دیگر قصاص آمدہ است مگر آنکہ ایں حدیث منسوخ باشد (اشعۃ اللمعات ج ۳ ص ۲۰۲)

یہ بات مخفی نہ رہے کہ مقتول کو پکڑنا قاتل کی اعانت ہے اور قتل میں اعانت ایسا جرم ہے کہ دوسری حدیثوں میں آیا ہے کہ اس پر قصاص ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہو۔

امن و امان میں خلل کبھی خشت باری سے بھی ہوتا ہے، کہ دھوکہ سے کہیں کسی کو چوٹ آگئی، تو پھر یہی بڑھ کر جنگ کا شعلہ بھڑکا سکتی ہے اور آن کی آن میں انسانوں کا سارا

اطمینان و سکون اس کی نذر ہو سکتا ہے، حفظ ماتقدم کے طور پر اسلام نے اس طرح کی چیزوں سے بھی منع کیا ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خشت باری نہ کیا کرو چنانچہ عبداللہ بن مغفل رض کا بیان ہے کہ انھوں نے کسی کو ڈھیلہ بازی کرتے ہوئے دیکھا تو اس سے کہا ایسا نہ کرو کیوں کہ

فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن الخذف وقال انہ لا یصاد بہ صید ولا ینکا عدو ولکنھا قد تکسر السن وتفقأ العین متفق علیہ (ایضاً)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگ باری سے منع فرمایا ہے اور آپ کا ارشاد ہے کہ اس سے نہ کوئی شکار کیا جا سکتا ہے اور نہ اس سے دشمن کو قتل کیا جا سکتا ہے، ہاں یہ البتہ ہوتا ہے کہ کبھی اس سے دانت ٹوٹتے ہیں اور کبھی آنکھیں پھوٹتی ہیں

امن و امان کی تاکید | ان تمام گوشوں پر اسلام کی نظر ہے، جہاں سے امن و امان میں خلل کا اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے اور محبت کی جگہ عداوت راہ پا سکتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی زندگی کے آخری ایام میں امت کو تاکید فرمائی تھی کہ وہ انس و محبت کی جگہ قتل و خوں ریزی کے جذبہ کو نہ آنے دیں۔

لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض (بخاری ج ۲ ص ۱۰۱۲)	مرے بعد کافروں کا سا شعار نہ اختیار کر لینا، کہ تم میں سے بعض بعض کی گردن مارنے لگے۔

جس درد کے ساتھ یہ فرمایا تھا اس کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے، کہ بعثت نبوی سے پہلے کی تاریخ سامنے ہو، اور پھر آپ کی جد و جہد کا منظر آنکھوں میں پھر رہا ہو۔

حجۃ الوداع میں پیغام نبوی | جس انداز میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے امن و امان کی تبلیغ کی، قتل و خوں ریزی کے دروازہ کو بند کیا، اور کائنات انسانی میں انسانی جان کی قدر و قیمت بتائی اس کا اجمالی نقشہ آپ کے سامنے آگیا، اخیر میں وہ حدیث بھی سُن لیجئے جس کا تعلق حجۃ الوداع کے خطبہ سے ہے، جہاں ایک لاکھ کے قریب انسان موجود تھے، آپ نے ارشاد فرمایا۔

فان اللہ تعالیٰ قد حرم علیکم دماء کم واموالکم واعراضکم الا بحقہا کحرمۃ یومکم ھذا فی بلدکم ھذا، فی شہرکم ھذا (بخاری باب ظہر المومن حمی)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ تم پر تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں حرام کر دی گئیں تمہارے آج کے دن کے حرمت کی طرح، تمہارے اس شہر اور اس مہینہ میں، مگر یہ کہ حق کے لئے ہوں۔

اس کی اہمیت جتانے کے لئے پھر اخیر میں انسانوں کے سیلاب کو مخاطب کر کے فرمایا

الا ھل بلغت۔ ثلاثا کل ذالک یجیبونہ الا نعم (ایضاً)

کیا میں نے پیغام حق پہنچا نہیں دیا؟ اسے تین مرتبہ فرمایا، سبھوں نے بیک زبان جواب دیا، جی ہاں ضرور

کوئی معاشرہ اس سے زیادہ انسانی جان کی قدر و منزلت اور کیا جتا سکتا ہے، جو کچھ عرض کیا گیا اسے بار بار پڑھئے اور سوچئے کیا کوئی گوشہ ابہام و تفہیم کا آپ نے اٹھا رکھا، جس مومن کی ان تمام احادیث پر نظر ہو گی، غیر ممکن ہے وہ انسانی جان کا جیسا احترام چاہیے اس میں کوئی کسر اٹھا رکھے۔

خون کی اہمیت اسلام میں اجتماعی زندگی میں انسانی خون کی قیمت کا مزید اندازہ اس حدیث سے لگائیے، جس میں عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ سرورِ کائنات نے فرمایا

اول ما یقضی یوم القیامۃ فی الدماء (بخاری کتاب الدیات ج ۲ ص ۱۰۱۳)

قیامت میں جس مسئلہ کا پہلے فیصلہ کیا جائے گا، وہ خون کا کیس ہو گا۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں

فیہ تغلیظ امر الدماء (شرح مسلم ج ۲ ص ۶۰)

اس حدیث میں خون کی اہمیت ہے

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں

ای اول القضاء یوم القیامۃ القضاء فی الدماء ای فی امر المتعلق بالدماء

یعنی قیامت میں پہلا فیصلہ خون کا فیصلہ ہو گا یعنی خون سے متعلق مقدمات کے فیصلے ہوں گے۔

وفیہ عظم امر القتل لان الابتداء انما یقع بالاھم (فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۶۶)

اس حدیث میں مسئلہ قتل کی اہمیت ہے کہ ابتدا ہمارے ہاں اہم معاملہ سے ہوتی ہے۔

عبادات اور انفرادی چیز میں نماز سے متعلق سوال ہوگا اور اجتماعی اور حقوق العباد امور میں سب سے پہلے اہمیت کے پیش نظر خون کا مقدمہ سامنے آئے گا، کیوں کہ بندوں پر مظالم کے سلسلہ میں سب سے بڑا ظلم یہی ہے۔

ابن العربی فرماتے ہیں

ثبت النھی عن قتل البھیمۃ بغیر حق والوعید فی ذالک فکیف بقتل الآدمی فکیف بالمسلم فکیف بالتقی الصالح (فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۶۶)

جب ناحق چوپایوں کے قتل کی بھی ممانعت ثابت ہے اور اس سلسلہ میں وعیدیں بھی ہیں پھر قتل انسان کی کتنی اہمیت ہوگی اور اس سے بڑھ کر مسلمان کی اور اس سے بڑھ کر خدا ترس اور نیکوکار کی

اسلام سب سے پہلے دل پر قبضہ کرتا ہے اور ہر چیز کی اہمیت سب سے پہلے دل ہی میں جاگزیں کرنے کی سعی کرتا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے پہلے اپنا سارا زور اسی پر صرف کیا ہے، کہ انسان کے رگ وپے میں یہ بات پیوست ہوجائے کہ انسانی جان کی بڑی قیمت ہے اور اس کی حفاظت ہر شخص کا دینی اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے۔

دین قیم کے یہ وہ زریں اصول ہیں جن کے قلب میں راسخ ہو جانے کے بعد ساری عداوتوں کے باوجود مسلمان ایک لمحہ کے لئے قتلِ ناحق کے مسئلہ میں تذبذب میں مبتلا نہیں ہوتا ہے بلکہ اس خیال کے آتے ہی اس کی زبان پر لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا جملہ آتا ہے، اور بے زاری کا اعلان کرکے علیحدہ ہوجاتا ہے۔

قاتل کی سزا اسلام میں | مگر بایں ہمہ انسان، انسان ہے، فرشتہ نہیں ہے، کبھی وہ ان تمام حقائق کے باوجود شیطانی وساوس میں گرفتار ہوجاتا ہے، اور جو نہ کرنا چاہیے وہ کر گذرتا ہے، مختلف محرکات ہیں، جو تھوڑی دیر کے لئے اس کی عقل پر پردہ ڈالتے ہیں، اور دین قیم

کے روشنی کے باوجود وہ اپنے آپ کو تاریکی میں محسوس کرتا ہے، اور پھر وہ ناجائز قتل وخوں ریزی پر اتر آتا ہے اسلام نے انسان کی ان نفسیاتی بیماریوں کے پیشِ نظر شہری قانون نافذ کیا ہے کہ اگر وہ خدانخواستہ اپنے ہاتھوں کو خون آلود کرلے تو اس کی ایسی سزا ہونی چاہیئے، جو آئندہ دوسروں کے لئے عبرتناک ہو۔

قصاص اور اس کی نوعیت | اسلام نے ایسے موقع کے لئے "قصاص" کا حکم نافذ کیا ہے، ارشادِ ربانی ہے

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی	مسلمانو! مقتولوں کا قصاص (خون کا عوض) تم پر فرض کیا گیا ہے، آزاد بدلے آزاد کے، اور غلام بدلے غلام کے، اور عورت بدلے عورت کے

(بقرہ ۲۲)

حضرت تھانویؒ کا تفسیری ترجمہ ملاحظہ فرمایئے، لکھتے ہیں

"اے ایمان والو! تم پر قانونِ قصاص فرض کیا جاتا ہے، مقتولین بقتلِ عمد کے بارے میں یعنی ہر آزاد آدمی قتل کیا جائے، ہر دوسرے آزاد آدمی کے عوض میں، اور اسی طرح ہر غلام دوسرے غلام کے عوض میں، اور اسی طرح ہر عورت دوسری ہر عورت کے عوض میں، گویہ قاتلین بڑے درجہ کے اور مقتولین چھوٹے درجہ کے ہوں، جب بھی سب کو برابر سمجھ کر قصاص لیا جائے گا، یعنی قاتل کو سزا میں قتل کیا جائے گا"[1]

قصاص میں عدل و مساوات | اس آیت کے سلسلہ میں ابو بکر جصاصؒ لکھتے ہیں

وھذہ الآیۃ تدل علی قتل الحر بالعبد والمسلم بالذمی والرجل بالمرأۃ لما بیناہ من اقتضاء اول	یہ آیت بتاتی ہے کہ ہر (آزاد) غلام کے بدلہ قتل کیا جائے گا اور مسلمان کا فرذمی کے بدلہ اور مرد عورت کے بدلہ، جیسا کہ ہم نے پہلے بیان

[1] بیان القرآن ج ا صنا

الخطاب ایجاب عموم القصاص فی سائر القتلیٰ (احکام القرآن ج۱ ص۱۳۷) کیا ہے کہ خطاب کے ابتدائی حصہ کا اقتضا تمام مقتولین میں قصاص کا وجوب سمجھ میں آتا ہے۔

قصاص میں عدل و مساوات کی صراحت اس آیتِ قرآنی میں موجود ہے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وکتبنا علیہم فیہا ان النفس بالنفس والعین بالعین والانف بالانف والاذن بالاذن، والسن بالسن، والجروح قصاص (المائدہ۔۷)

اور ہم نے اس میں ان پر لکھ دیا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ، اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت، اور سب زخموں کا بدلہ برابر۔

حضرت مولانا تھانویؒ لکھتے ہیں

"النفس بالنفس میں آزاد اور غلام، اور مسلمان اور کافر ذمی، اور مرد اور عورت اور کبیر اور صغیر اور شریف اور رذیل اور بادشاہ اور رعیت سب داخل ہیں"(بیان القرآن ج ۳ ص۳۵)

قصاص عہدِ نبوی میں | حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک مسلمان عورت کو ایک یہودی نے مار ڈالا، اس کے عوض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی کو بھی قصاص میں قتل کر ڈالا۔

(بخاری باب قتل الرجل بالمرأۃ)

اسی طرح حدیث میں ہے کہ خدمتِ نبوی میں ایک مسلمان پیش کیا گیا، جس نے ایک ذمی کافر کو قتل کر دیا تھا چنانچہ آپ نے حکم فرمایا اور اس قاتل مسلمان کو قتل کیا گیا

(شرح معانی الآثار ج ۲ ص۱۱۱)

قصاص میں یہ شرط نہیں ہے کہ مقتول کمال ذات و صفات میں قاتل کے بالکل برابر ہو چنانچہ اعضاء کا صحیح و سالم اس شخص کے قصاص میں قتل کیا جائے گا جس کے اعضاء کٹے ہوئے ہوں، یا جس کے اعضاء شل ہوں، اسی طرح عالم، جاہل کے بدلے شریف

کمینہ کے بدلے عاقل، مجنون کے بدلے تندرست بیمار کے بدلے اور بالغ، بچہ کے بدلے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔[1]

اگر ان مذکورہ اوصاف کا لحاظ کیا جائے، تو قصاص کا قانون ہی نافذ العمل باقی نہ رہے اسی وجہ سے جان کے معاملہ میں ان اوصاف وکمالات کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے بلکہ جان اور اس کی قیمت کا لحاظ قانوناً تسلیم کیا گیا ہے۔

قصاص کا فائدہ | اسلام نے یہ قانون اس لئے بنایا ہے کہ قتل کا مجرم اپنے جرم کی پاداش پالے اور پھر اس سے ہمیشہ کے لئے باز آجائے اور ساتھ ہی دوسرے اس سزا کو دیکھ کر عبرت وبصیرت حاصل کریں اور ظلم وزیادتی کی ان میں جرأت پیدا نہ ہو سکے، دوسری طرف اس کا فائدہ پہنچے کہ مقتولین کے ورثاء اور حامیوں کا غیظ وغضب ٹھنڈا پڑ جائے اور ان میں ردِ عمل و انتقام کا جوش موجزن ہو کر امن وامان کے خرمن کو خاکستر نہ بنانے پائے، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے قصاص کو "حیات" سے تعبیر کیا ہے، ارشادِ ربانی ہے۔

ولکم فی القصاص حیاۃ یااولی الالباب (بقرہ - ۲۲)	اور اے عقل مندو! قصاص میں تمھارے لئے زندگی ہے

قصاص میں حکمت | حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں

وفی شرع القصاص لکم وھو قتل القاتل حکمۃ عظیمۃ وھی بقاء المھج وصونھا لانہ اذا علم القاتل انہ یقتل انکف من صنیعہ فکان فی ذالک حیاۃ النفوس (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۲۱۱)	قصاص کی مشروعیت میں عظیم الشان حکمت ہے اور وہ یہ کہ جان کی حفاظت اور اس کی بقاء ہے اس وجہ سے کہ جب قاتل کو یہ یقین ہو جائے گا کہ وہ بھی قصاص میں قتل کیا جائے گا تو وہ اپنے جرم سے رک جائے گا۔ اور اس طرح یہ چیز لوگوں کے لئے باعثِ حیات بن جائے گی۔

---

[1] بدائع الصنائع ج ۷، ص ۲۳۷

ابو العالیہ کا بیان ہے

جعل اللہ القصاص حیاۃ فکم من یعل ویرید ان یقتل فیمنعہ مخافتہ ان یقتل (ایضاً)

اللہ تعالیٰ نے قصاص میں زندگی رکھی ہے اس لئے کہ کتنے ہیں جو قتل کا ارادہ کرتے ہیں مگر یہ خوف ان کو روک دیتا ہے کہ پھر تم بھی بدلے میں قتل کئے جاؤ گے۔

ابھی ہند و پاک میں ردِ عمل کے نام پر جس طرح لاکھوں ہندو مسلم خاک و خوں میں تڑپے، وہ نتیجہ تھا، مذہبی جذبۂ انتقام کا، اگر دونوں حکومتیں قاتلین کو واجب سزائیں دیتیں تو یہ تعداد سیکڑوں سے آگے نہ بڑھتی، اس لئے کہ یہ دیکھ کر تسکین ہوتی کہ حکومت قاتلوں کو ان کے جرم کی سزا خود دے رہی ہے، دوسری طرف قاتلوں کی حوصلہ افزائی بھی نہ ہوتی، اور پھر ان کی ہمتیں فوراً ٹوٹ جاتیں

ورثائے مقتولین کو ہدایت اسلام سے پہلے جیسا پہلے اشارہ کر آیا ہوں، انتقام کے نام پر خوں ریزی کا بازار گرم رہا کرتا تھا اسلام نے قصاص کا عدل پرور قانون نافذ کرکے اس مرض کا خاتمہ کر دیا، قرآن نے جہاں جہاں قصاص کا قانون بیان کیا ہے وہاں پوری قوت سے ورثاء مقتولین کو زیادتی سے منع بھی کیا ہے، چنانچہ پہلی آیت کتب علیکم القصاص کے آخر میں یہ بھی اعلان فرمایا گیا،

فمن اعتدی بعد ذالک فلہ عذاب الیم (بقرہ - ۲۲)

مشرکین سے قتال کا جہاں ذکر کیا گیا وہاں بھی صراحت کی گئی ہے کہ زیادتی نہ ہونے پائے، بس برابر سرابر ہو۔

الشھر الحرام بالشھر الحرام والحرمٰت قصاص فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ مع المتقین

(بقرہ - ۲۴)

حرمت والا مہینہ بدلا (مقابل) ہے حرمت والے مہینے کا اور ادب رکھنے میں بدلا ہے پھر جس نے تم پر زیادتی کی تم اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے زیادتی کی تم پر اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہے پرہیزگاروں کے۔

صاحب تفسیر المنار لکھتے ہیں

وهذه الشروط والاداب لا توجد الا فی الاسلام ولذالك قال تعالی بعد شرح القصاص والمماثلة واتقوا الله فلا تعتدوا علی احد ولا تبغوا ولا تظلموا فی القصاص بان تزیدوا فی الایذاء (ج ۲ ص ۲۱۳)

یہ آداب و شروط اسلام کے سوا اور کہیں نہیں پائے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نقاص ومماثلت کا حکم بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اللہ سے ڈرو، کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کرو اسی طرح قصاص میں ظلم وجور پر نہ اترآؤ، کہ تم اذیت کوشی میں نمبر نہ لے جاؤ۔

مسئلہ قصاص میں غلط فہمی اور اس کا ازالہ اسلام نے قصاص میں جس عدل ومساوات کا ثبوت دیا، یہ بس اسی کا حصہ ہے اور جن آداب و شرائط کا لحاظ رکھا ہے، یہ اسی کے لائق ہے، کہیں ڈھونڈے یہ جامعیت نہیں مل سکتی ہے، مگر بایں ہمہ کچھ لوگ اپنی کم فہمی سے اسلام کے اس قانون پر منہ آتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ قاتل کی جان لینا بہت بڑا ظلم ہے، ان کا منشار یہ ہے کہ قتل کے بجائے اسے جیل کی سزا دی جائے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ملک کی ایک جان سزا پاکر پھر کارآمد ہو سکتی ہے۔

لیکن جن لوگوں کو جماعتی نظام کا تجربہ ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ملک سے فتنہ وفساد اور قتل وخوں ریزی کا بند کیا جانا اگر ضروری ہے تو اس کی صورت اس عدل ومساوات والے قصاص سے بہتر کوئی اور نہیں ہو سکتی، بدبخت افراد اگر یہ سن لیں کہ قتل کے بدلہ قتل نہیں ہے جیل ہے تو دنیا جانتی ہے کہ وہ جرم پر جری ہو جائیں اور ملک میں اودھم مچا دیں، اور کہتے پھریں چلو فلاں کو مار ڈالو، جیل میں جاکر بھی کھانا ملے گا، سونے کا وقت بھی ملے گا اور کم وبیش کچھ دنوں بعد یہاں جیسا ہی آرام وہاں بھی محسوس ہونے لگے گا۔

پھر ادھر مقتولین کے حامی وناصر بھی کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتے، وہ بھی دوسری طرف

سے موقع پاکر قتل وخوں ریزی شروع کر دیں گے، اور کوشش کریں گے کہ بدلہ سود در سود وصول ہو اس طرح ملک کا امن وامان جاتا رہے گا، ہم نے اپنے ملک میں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آزادی کے بعد قتل وخوں ریزی میں کئی گونہ اضافہ ہوگیا، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے، کہ بدبختوں نے سمجھ لیا کہ بدلہ میں قتل ہونا تو نہیں ہے، مذہب کے نام پر ہمارے ساتھ رعایت ہوگی۔

جدید عربی شاعری کے علم بردار

از

(جناب مولوی رشید احمد صاحب ارشد ایم اے استاذ ادبیات عربی کراچی یونیورسٹی)

(۲)

حافظ ابراہیم حافظ ابراہیم ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا ابتدائی زمانہ بہت تنگی اور عسرت میں گذرا۔ اس وجہ سے ان کے ابتدائی کلام میں شکایتِ زمانہ اور اہلِ وطن کی ناقدری کا شکوہ ہے۔ اس غریبانہ ماحول اور فوج کی ابتدائی ملازمت کی وجہ سے ان کا تعلق عوام سے گہرا رہا۔ وہ عوام کے دکھ درد میں شریک رہے، وہ ان کے جذبات واحساسات سے اچھی طرح واقف تھے کیونکہ وہ خود بھی عرصۂ دراز تک انھی کے ایک فرد تھے اسی وجہ سے انھوں نے مصر کے عوام کی ترجمانی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ فوجی ملازمت چھوڑ دینے کے بعد ان کا تعلق مصر کے حریت پسند قومی لیڈروں سے زیادہ قائم ہوگیا جو جمال الدین افغانی کے تربیت یافتہ تھے اس وجہ سے ان کی شاعری عوام اور قوم کے لئے وقف ہوگئی۔ انھوں نے قومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی شاعری کے ذریعے مصر کے نوجوانوں میں سیاسی، معاشرتی اور علمی بیداری پیدا کی۔ ان کا دیوان مصر کی قومی تحریکات اور اہم واقعات کی منظوم تاریخ ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ادبی دلچسپی اور شاعرانہ جذبات سے خالی نہیں ہے۔ ہمارے اردو شعراء اقبالؔ، ظفر علی خاں اور محمد علی جوہر کی طرح ان کی پُرجوش قومی نظموں نے تحریکِ آزادی کو کامیاب بنایا۔ اسی کے ساتھ ساتھ مولانا حالیؔ کی نظموں کی طرح ان کی قومی اور معاشرتی نظموں نے بھی مصر و شام کے لوگوں کو ان کے سماجی اور اخلاقی عیوب سے آگاہ کیا انھوں نے خواتین کی حالت کو بہتر بنانے اور انھیں معتدل طریقے سے تعلیم دلانے کی حمایت کی۔

حافظ ابراہیم نے حضرت عمر فاروقؓ کے سیرت و کردار پر ایک بہت بڑی نظم لکھ کر عربی ادب میں بلند پایہ طویل اسلامی نظموں کی کمی کو پورا کیا۔ اس طرح قدیم عربی شاعری میں حریت

پسندانہ، قومی وسماجی نیز خالص اسلامی نظموں کی جو کمی تھی، اس کی بڑی حد تک تلافی کردی۔

حافظ ابراہیم اپنے الفاظ، طرزِ بیان اور موضوع کے لحاظ سے سامی البارودی کے صحیح جانشین تھے انھوں نے جدید خیالات کو قدیم فصیح عربی زبان میں پیش کیا اور علمِ عروض کے اوزان کی پوری پابندی کی۔ ان کے اشعار جدید گوناگوں خیالات کے باوجود ان کی قادر الکلامی کا ثبوت دیتے ہیں اور سہلِ ممتنع کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔ ان کی سیدھی سادھی زبان اور خیالات کو معمولی پڑھا لکھا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ کسی قسم کی پیچیدگی اور اشکال نہ الفاظ میں ہے اور نہ معانی میں۔ ان کی یہ خصوصیت بھی انھیں ہر دل عزیز اور "شاعرِ عوام" بنانے میں کامیاب ثابت ہوئی اور وہ شاعر النیل کے لقب سے سرفراز ہوئے۔

حافظ کے ابتدائی کلام میں تقلیدی اور قدیم رنگ جھلکتا ہے قدیم انداز کے مطابق انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز بڑے لوگوں اور بادشاہوں کی قصیدہ خوانی سے کیا۔ چنانچہ شروع کے کلام میں خدیوِ مصر عباس اور ترکی خلیفہ سلطان عبدالحمید خاں کی تعریف، ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ، ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی پر مبارکباد اور لارڈ کرومر مصر کے ہائی کمشنر، پر الوداعی قصیدہ بھی شامل تھا۔ مگر جب مفتی محمد عبدہ اور مصطفی کامل کی جماعت سے ان کا تعلق پیدا ہوا تو انھوں نے تحریکِ آزادی میں زور شور سے حصہ لینا شروع کیا۔ بہر حال وہ اپنے اور قوم کے رنج وغم اور جذبات کے اظہار اور ان کے عیوب کی صحیح ترجمانی کرنے میں منفرد ہیں۔ اس معاملے میں ان کا کوئی ہم عصر شاعر مقابلہ نہیں کرسکتا[۱]۔

حافظ ابراہیم نے غزل گوئی نہیں کی کیونکہ انھیں قوم کے عشق ومحبت کے سوا اور کسی سے عشق نہیں ہوا اسی طرح ان کے کلام میں مناظرِ قدرت اور فلسفیانہ گہری نظروں کی کمی ہے بلکہ ان کی شاعری "روحانیت" سے بھی خالی ہے مگر انھوں نے مصر اور سرزمین مشرق کے تمام بڑے لوگوں کے نہایت عمدہ مرثیے لکھے ہیں ان میں سیاسی لیڈر، علماء، شعراء اور مصنف

---

[۱] تاریخ الادب العربی للزیات۔

بھی شامل تھے۔ چنانچہ ان کے دیوان میں نظموں کا بہت بڑا حصہ بڑے لوگوں کے مراثی یا خاص تقریبات وحوادث کے بیان کے لئے وقف ہے۔ اس لئے وہ نقّاد اور ادبا رجو رومانیت، غزل اور گہری فلسفیانہ جذباتی شاعری کے دلدادہ ہیں، یا وہ لوگ جو مغربی ادب کی تقلید کرنا چاہتے ہیں، حافظ ابراہیم کی شاعری کو پسند نہیں کرتے۔ یہ کمی ایک حد تک شوقی نے پوری کر دی تھی۔ اس لئے حافظ اور شوقی کے طرفداروں کی دو مختلف جماعتیں اہلِ ذوق کی پیدا ہوگئیں چونکہ دونوں ہمعصر اور مقبول ترین شعراء تھے اس لئے مختلف اخبارات ورسائل میں ان پر موازنہ اور مقابلہ ہونے لگا اور ان دونوں کی شاعری پر بے شمار تنقیدیں ان کی زندگی ہی میں شائع ہونے لگیں، ان میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین، عقّاد و مازنی وغیرہ کی تنقیدیں زیادہ اہم تھیں۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں حافظ ابراہیم اور شوقی کی شاعری کے بارے میں ”مجلۃ الہلال مصر“ میں حافظ وشوقی دونوں کی وفات کے بعد ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ایک مقالہ سپردِ قلم کیا تھا۔ حافظ کے بارے میں ان کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

”حافظ کے اشعار سیدھے سادے اور آسان ہیں۔ ان کا علم محدود تھا۔ فرنچ سے معمولی واقفیت تھی۔ اس وجہ سے ان کا کلام شاعری کی ہر صنف سے مالامال نہیں ہے بارودی کی طرح قدیم ادب تک ان کی واقفیت تھی۔ علوم عربیہ میں بھی وہ کتاب الاغانی اور مشہور شعراء کے دواوین سے واقف تھے مگر چونکہ ان کا حافظہ تیز تھا۔ اس لئے اس کی مدد سے وہ اپنے ماحول کی مصوری کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ مگر محدود عقلیت کی بنا پر اپنی نظموں میں گہرائی اور تخیلات میں بلندی نہیں پیدا کر سکے ان کے مرثیے۔ شکایت نامے، واسوخت، سیاسی اور معاشرتی نظمیں دردانگیز اور مؤثر ہیں۔ مناسب الفاظ، عمدہ طرزِ بیان، اور دلکش تصویر کشی کی وجہ سے مذکورہ بالا اصنافِ شاعری میں ان کا مقام کافی بلند ہو مگر اس قسم کے اشعار میں بھی گہرائی اور فلسفہ نہیں ہے۔ انھوں نے ایک ایسے معمولی انسان کے خیالات کی ترجمانی کی ہے جو عوام کا ایک فرد ہو۔ اسی وجہ سے انھوں نے عوام میں ہر دلعزیزی حاصل کی کیونکہ انھوں نے مصر کے عام مسلمانوں کے خیالات وجذبات کی نمائندگی کی تھی۔

حافظ ابراہیم سیاسی لیڈروں سے بھی ربط و ضبط رکھتے رہے۔ اور عوام سے بھی ان کا تعلق رہا۔ اس بنا پر ہر قسم کے افراد کے خیالات و رجحانات کی عکاسی کرتے رہے اور نہایت آزادی و بیباکی کے ساتھ قومی خیالات کا اظہار کرتے رہے مگر جب حشمت پاشا نے انھیں مصری لائبریری کے ادبی شعبہ کا نگراں بنا دیا (اور وہ سرکاری ملازم ہو گئے) تو ان کی زبان بند ہو گئی (یہ تقرر ۱۹۱۱ء میں ہوا) اس کے بعد حافظ نے عمدہ کلام نہیں پیش کیا۔ اگر وہ شاعرِ فطرت ہوتے تو اس زمانہ میں سیاست اور عوام کی ترجمانی سے الگ ہونے کے بعد قدرتی مناظر پر نظمیں لکھ سکتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی طبیعت اس کام کے لئے موزوں نہ تھی اس آخری زمانے میں بڑے بڑے آدمیوں کے مرنے پر ان کی مرثیہ گوئی کے سوا اور کچھ نہ کر سکے"[1]

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تنقید کسی قدر سخت ہے۔ شعراء سے یہ توقع رکھنا کہ وہ بھی ان کی طرح مغربی ادب اور فلسفہ کا بہت بڑا عالم ہو ناممکن کوشش ہے۔ بہت بڑے عالم کا شاعر بننا بہت مشکل ہے۔ نیز ہر شاعر کا جامع اوصاف ہونا اور ہر صنفِ شاعری میں طبع آزمائی کرنا بھی ضروری نہیں ہے۔ ہر زبان کی موجودہ اور گذشتہ ادبی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ کوئی شاعر ہر صنفِ شاعری پر حاوی نہ ہو سکا۔ بہر حال اس تنقید سے شاعر کی تصویر کا دوسرا رخ واضح ہو جاتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ حافظ ابراہیم کی شاعری کا بہترین زمانہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۱ء تک کا ہے۔ یہ زمانہ ان کی شاعری کا عالمِ شباب تھا۔ اس کے بعد جب اپنے حالات اور مشکلاتِ مالی سے تنگ آ کر وہ سرکاری ملازم ہو گئے۔ تو ان کی شاعری زوال پذیر ہو گئی۔ تاہم وہ مالی حیثیت سے خوش حال ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں ان کی یادگار نثر کی تصانیف ہیں جو کچھ درسی کتب اور کچھ تراجم اور افسانوں پر مشتمل ہیں۔ بہر حال حافظ اور شوقی وہ دو ممتاز شاعر ہیں جو متنبی اور معری کے بعد کئی صدیاں گذرنے کے بعد نمودار ہوئے، تاہم عربی ادب کے قدیم مشہور شعراء کے

---

[1] مجلہ الہلال قاہرہ مصر دسمبر ۱۹۳۱ء۔

دوش بدوش فخر کے ساتھ انھیں پیش کیا جاسکتا ہے۔ مخالفین کی سخت تنقیدوں کے باوجود ان کی شاعرانہ کمالات لافانی ہیں اور جدید عربی ادب کے رہنماؤں کی حیثیت سے انہیں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

شوقی ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۳۲ء میں وفات پائی۔ اہلِ ذوق اسے متنبی اور معرّی کے بعد عربی زبان کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ تقریباً ایک ہزار برس کے درمیانی عرصے میں اتنا بڑا شاعر نہیں پیدا ہوا۔ حافظ کے برخلاف وہ امیرانہ ماحول میں پروان چڑھا وہ عرب، ترک، یونانی اور چرکسی نسلوں سے ملے جلے مصر کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی پیچیدہ طبیعت ان تمام نسلوں کی بہترین خصوصیات سے متصف رہی۔ عربی شاعری میں تنوع پیدا کرنے کے باوجود اس نے عربی زبان کے قدیم اوزان اور بحور وقوافی کی پابندی روا رکھی اور طویل بحروں میں نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں اس نے قوافی میں بھی کوئی خاص تنوع یا تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم اس نے کئی طویل وطنی اور تاریخی نظمیں لکھ کر عربی شاعری میں جدید باب کا اضافہ کیا۔ جن میں دول العرب، وادی النیل کی نظمیں قابل ذکر ہیں جن میں اس نے نہایت قادر الکلامی کے ساتھ اسلامی اور قدیم مصری تاریخ کے اہم واقعات کو نظم کیا ہے۔ "عظماء الاسلام" کے نام سے بھی اس نے ایک طویل نظم لکھی ہے۔ جس میں اکابرِ اسلام کے کارناموں کو قلمبند کیا ہے۔ بچوں کے لئے اس نے نہایت عمدہ نظمیں اور گیت تحریر کئے ہیں۔

اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عربی شاعری میں منظوم ڈراموں کی کمی کو پورا کیا اور مندرجہ ذیل عمدہ منظوم ڈرامے تحریر کئے جو اس کا لافانی کارنامہ ہیں۔

"مصرع قلوپطرا"[۱] "الست صدی" "قمبیز" "علی الکبیر" "عنترہ" "مجنوں لیلیٰ"

وہ عربی زبان میں پہلا منظوم ڈرامہ نگار ہے اور اس زمانے کے حالات اور اپنی قابلیت

---

[۱] تاریخ ادب العربی للزیات ص ۸۳ مطبوعہ مصر

کے لحاظ سے اس نے بہت اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ ان ڈراموں کی سلاست و روانی اور غنائیہ عنصر اپنی نظیر آپ ہے۔ اور ان سے زبان و ادب نیز عروض و قافیہ پر اس کی قادر الکلامی کا زبردست ثبوت ملتا ہے۔ اگر وہ عربی ڈراموں کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیتا اور اس کی قوتِ مشاہدہ اور زیادہ عمیق ہوتی تو وہ عربی زبان کا شیکسپیئر قرار دیا جاتا۔

شوقی اور حافظ معاصر ہونے کے باوجود اپنی شاعرانہ خصوصیات کے لحاظ سے بعض معاملات میں مشترک اور بعض چیزوں میں مختلف ہیں۔ شوقی ابتدا میں شاہی خاندان میں پرورش پانے کی وجہ سے درباری شاعر بنا۔ اس لئے اس کی ابتدائی نظمیں بادشاہ اور امراء کی تعریف میں قصائد اور تشبیب پر مشتمل ہیں۔ اس کے برعکس حافظ ابراہیم کی ابتدائی نظمیں شکایت زمانہ اور اس کے ذاتی رنج و غم و مصائب کی آئینہ دار تھیں۔ اس لحاظ سے ان میں جدت، اثر اور خلوص تھا مگر شوقی کے قصائد قدیم طرز کے اور خلوص سے خالی ہوتے تھے۔ اس زمانے میں اس نے قومی سیاست اور عوام کے بارے میں کچھ نہیں لکھا در حقیقت اس زمانے میں اس کا عوام سے کوئی تعلق بھی نہ تھا مگر جب پہلی جنگ عظیم کے موقع پر انگریزی سیاست کے ماتحت معتوب شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے جلاوطن کیا گیا، تو اس کی زندگی اور شاعری دونوں نے ایک نئی کروٹ لی جس کے ساتھ اس کا شاعرانہ رنگ بھی تبدیل ہو گیا۔ اس نے جلاوطنی کا زمانہ سرزمین اندلس میں گزارا جہاں عربوں نے صدیوں تک حکومت کی تھی اس لئے وہاں کے ماحول نے اس کی طبیعت میں اسلامی اور قومی جذبات پیدا کئے۔ جلاوطنی کے زمانے میں اس نے اندلس کی گذشتہ شان و شوکت پر کئی نظمیں لکھیں۔ اور جب وہ مصر واپس آیا تو اس کا استقبال ایک قومی رہنما کی حیثیت سے نہایت شاندار طریقے سے کیا گیا اور قوم نے اسے ایک درباری شاعر کے گوشے سے نکال کر قومی شاعری کے میدان میں لا کھڑا کیا اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہاں تک کہ مصر کے قومی شاعر حافظ ابراہیم نے اس کا اپنی نظموں کے ذریعے پرتپاک خیر مقدم کیا اور اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کو خراجِ تحسین ادا کیا۔

اب وہ انگریزوں اور شاہی محل کا معتوب شاعر تھا۔ اسے قوم کے سہارے زندگی گذارنی تھی۔ لہٰذا اس نے دل و دماغ کی بہترین صلاحیتیں اپنی شاعری کے لئے وقف کردیں اور عوام سے بہت گہرے تعلقات قائم کرلئے۔ اس طرح وہ مصری عوام اور مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی بھی کرنے لگا۔ اور تمام اصنافِ شاعری کا جامع بن گیا۔

شوقی حافظ ابراہیم کے برخلاف مناظرِ قدرت کی نظموں، تغزل اور عاشقانہ نظموں میں بھی کامیاب شاعر تھا اس طرح وہ عربی زبان کی تمام اصنافِ سخن کا جامع اور مکمل شاعر تھا۔ تمثیل نگاری کی نئی صنف کا وہ بانی ہے اس کی بیشتر نظموں میں رومانی عنصر گہرائی اور فلسفیانہ انداز پایا جاتا ہے۔

صحیح عناصر | مجموعی حیثیت سے ہمارے خیال میں شوقی کا رتبہ حافظ ابراہیم سے بہت بلند ہے۔ کیونکہ وہ مشرقی و مغربی ادب دونوں سے واقف تھا۔ اس کی علمی استعداد بھی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اس لئے اس کی شاعری ہر قسم کے خیالات سے مالا مال ہے تاہم انصاف پسند نقادوں کی یہ رائے ہے کہ حافظ مرثیہ گوئی، قومی ترجمانی، شکوۂ زمانہ، عوام کے احساسات و آلام کی صحیح ترجمانی میں شوقی سے بازی لے گیا تھا۔ اور شوقی غنائیہ عاشقانہ اور فطری شاعری کے لئے یکتا شہسوار، تمثیل نگاری کا بانی اور وصف نگاری میں ایک دل کش مصور تھا۔ رفعتِ مضامین، جدت نگاری اور معنی آفرینی میں بھی وہ حافظ سے آگے ہے۔ جہاں تک بلند پایہ شعرائے متقدمین کی تقلید کا تعلق ہے۔ حافظ اس معاملے میں شوقی سے سبقت لے گیا ہے مگر حافظ ظاہری الفاظ و صورت کا مقلد بھی تھا۔ شوقی نے صرف معنی آفرینی میں ان کی کامیاب تقلید کی۔ بہر حال قوم اور حکومت نے اسے امیر الشعراء کا لقب عطا کیا جس کا وہ بجا طور پر مستحق تھا۔

شوقی کی زندگی ہی میں عربی ممالک کے بڑے بڑے شہروں میں اس کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اور اس کے اعزاز و اکرام کے طور پر عظیم الشان جلسے ہوئے جن میں وہ جلسے قابلِ ذکر ہیں جو ۲۹ اپریل سے ۶ مئی ۱۹۲۷ء میں لگاتار ہوئے جن میں بڑے بڑے شعراء حافظ ابراہیم

خلیل مطران، امیر شکیب ارسلان وغیرہ نے قصائد میں اسے خراج تحسین ادا کیا اور دیگر ممتاز رہنماؤں نے بھی تقریریں کیں۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی رائے

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے شوقی کی وفات پر ایک مقالہ تحریر کیا تھا جس میں شوقی کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے اس کی بعض خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ تحریر کرتے ہیں۔

"شوقی کو ترکی اور فرنچ میں مہارت حاصل تھی اس کا مطالعہ وسیع تھا لہٰذا اس وسیع مطالعہ کی بنا پر دیگر عناصر کے ساتھ ساتھ فرانسیسی عنصر بھی اس کے کلام میں شامل ہو گیا تھا تاہم ترک و عرب کے اثرات اس پر غالب رہے وہ قدمائے یونان کی محفل سے محروم رہا ورنہ مصر کا "شاعر کامل" ہوتا"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شوقی نے فرانسیسی ادبیات کا مطالعہ صحیح طریقہ سے نہیں کیا کیونکہ اس نے فرانسیسی ادیبوں کا جہاں تذکرہ کیا ہے اس موقع پر اس نے فرانس کے اعلیٰ قسم کے ادبا اور فلسفیوں کا ذکر نہیں کیا ہے مثلاً وہ بودلین فرلین سولی بریدم مالارامیہ وغیرہ سے ناواقف معلوم ہوتا ہے۔ وہ جدید فرانسیسی ادب کے بجائے قدیم ادب سے زیادہ متاثر معلوم ہوتا ہے۔ دوسری خامی جو اس میں باقی رہ گئی تھی وہ یہ ہے کہ ابتدا میں اس نے اپنی طبیعت کو آزاد نہیں کیا بلکہ محل شاہی کی سیاست میں الجھ کر رہ گیا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس کی جدت پسند قوت اور قوت متخیلہ اس کی شاعری کا رخ بدل دیتی۔ اگر وہ مشہور یونانی شاہکار ایلیڈ اور اوڈیسہ کو اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لیتا تو وہ عربی زبان میں فنی حیثیت سے منظوم رزمیہ گوئی کی بنیاد ڈال سکتا تھا۔

اسی طرح اگر وہ قدیم یونانی اور جدید مغربی ڈراموں کو اچھی طرح مطالعہ کر لیتا اور اپنی فطرت کو ہر طرح سے آزاد کر لیتا تو وہ عربی نثر و نظم میں جدید تمثیل نگاری کے اعلیٰ نمونے پیش کر سکتا تھا۔ اسی طرح اگر وہ عصر جدید کے شعرائے فرانس سے ربط ضبط قائم کرتا اور ان کے کلام کا مطالعہ کرتا تو اس کی شاعری تخیل اور گہرائی میں بہت بلند پایہ کی ہوتی۔ مگر کچھ تو مطالعہ کی کمی اور کچھ درباری سیاست نے اس کے پر نوچ دیئے تھے"[1]

---

[1] الہلال قاہرہ مصر ماہ دسمبر ۱۹۳۲ء

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی یہ رائے انتہا پسندی پر مبنی ہے وہ نقاد کی حیثیت سے یہ چاہتے تھے کہ جس قدر وسیع معلومات یونانی اور مغربی ادب کے بارے میں انھیں حاصل ہے، وہ ہر مصنف ہر ادیب اور ہر شاعر میں ہونی چاہئے نیز وہ یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ ہر شاعر میں وہ تمام اوصاف پائے جائیں جو قدیم یونانی اور مغربی ادب کے شعراء میں موجود ہیں۔ مشرق کے حالات اور شاعر کے رجحانات کے لحاظ سے ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ شاعری ایک فطری ملکہ ہے جو وسیع مطالعے سے نہیں حاصل ہوتا۔

بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شوقی اور حافظ عربی ادب میں متنبی اور ابوالعلاء المعری کے بعد ایسے دو زبردست شاعر تھے جنھوں نے عربی شاعری میں انقلاب برپا کیا اور جدید شاعری کے لئے اس طرح راہ ہموار کی کہ قدیم عروض اور قوافی کی پابندیوں سے بغاوت بھی نہیں کی بلکہ شوقی نے قدیم شعراء کی مشہور نظموں کی تقلید و تتبع میں انہی قافیوں، بحر اور وزن میں ان کے جواب میں اپنی بعض مشہور نظمیں تحریر کیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ رسول کریمؐ کی نعت میں مشہور مصری شاعر بوصیری کے قصیدہ بردہ کے اتباع میں اور اسی طرز میں اس نے ایک طویل نظم لکھی جو نہج البردہ کے نام سے مشہور ہے اسی طرح وطن کی یاد اور اس کے شوق و محبت میں ابن زیدون کے نونیہ قصیدہ کے جواب میں اس نے بھی اسی طرز پر ایک نونیہ قصیدہ تحریر کیا۔ نیز اس کی ایک نظم بحتری کے سینیہ قصیدہ کے مشابہ، گذشتہ ایام اور ملک کے کھنڈروں کی یاد میں ہے ایک اور نظم تغزل میں حصری کے دالیہ قصیدے کے جواب میں اسی قافیہ میں ہے یہاں تک کہ اس نے مشہور ابن سینا کے عینیہ قصیدہ کے جواب میں فلسفۂ نفس پر اسی قافیہ اور اسی طرز پر ایک نہایت عمدہ نظم لکھی اس طرح مشہور قدیم شعراء کے جواب میں نظمیں لکھ کر اس نے اپنی قادر الکلامی کا بہترین ثبوت دیا اس سے بعض لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ مقلد شاعر تھا اور اس نے عربی شاعری میں زبردست انقلاب نہیں پیدا کیا جیسا کہ آج کل بعض شعراء قدیم روایات سے بغاوت کر رہے ہیں اس طرح اس نے کوئی جرأت مندانہ قدم نہیں اٹھایا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ زمانہ قدیم روایات کے تحفظ و تعمیر کا تھا نہ کہ تخریب کا۔ اس نے قدیم روایات کو محفوظ رکھتے ہوئے کچھ نئی معنوی تعمیر بھی کی یعنی عربی شاعری میں تمثیلی اور رزمیہ تاریخی قصوں کو منظوم کرکے اس کمی کو پورا کیا۔ اس قسم کی رزمیہ نظموں میں (۱) دول العرب (۲) وادی النیل (۳) صدی الحرب یعنی "جنگ کی صدا" قابل ذکر ہیں۔

آخری نظم میں اس نے یونانیوں کے خلاف ترکوں کے جنگی کارناموں کا ذکر کیا ہے یہ اسی قسم کی بلند پایہ نظموں میں ہے جس قسم کی نظمیں پہلی جنگ عظیم کے بعد تحریک خلافت کے زمانے میں ہمارے اردو شعراء نے تحریر کی تھیں۔

مذکورہ بالا نظموں اور ڈراموں کے علاوہ شوقی کی بہترین نظموں میں مندرجہ ذیل نظمیں بھی شامل ہیں۔ ابوالهول (جو مصر کی تاریخی یادگار ہے) عبرة الدهر مملكة النحل (شہد کی مکھیوں کی سلطنت) الاندلس الجدیدة، الشباب المنتحر (شباب کی خودکشی) تحیة الاستقلال (آزادی کا سلام) علی سفح الاهرام (اہرام مصر کے دامن میں) توت عنخ آمون (مصر کا ایک قدیم بادشاہ)

ان میں سے اکثر نظموں میں اس نے قدیم مصر کی تاریخی عظمت کو زندہ کیا ہے۔ اس طرح وہ تمام مصریوں کا قومی شاعر کہلانے کا پورا حق رکھتا ہے۔

مشہور نقاد احمد حسن الزیات نے اپنی مجموعۂ مضامین میں جو اس نے "فی اصول الادب" کے نام سے شایع کرایا ہے ایک مضمون خاص شوقی پر تحریر کیا ہے اس میں ایک مقام پر شوقی کے کلام کی گوناگوں خصوصیات کو واضح کرتے ہوئے وہ تحریر کرتا ہے۔

"شوقی کے تغزل اور وصف نگاری میں، بحتری اور مہیار الدیلمی جیسی نزاکت اور لطافت پائی جاتی ہے رزمیہ انداز اور مدح گوئی میں وہ ابوفراس الحمدانی اور رضی کے مشابہ ہے۔ ادب و حکمت میں اس میں ابوتمام جیسی گہرائی اور متنبی جیسی پیچیدگی پائی جاتی ہے"[1]۔

جدید شعراء کے ایک رہنما احمد زکی شادی نے شوقی پر ایک مضمون تحریر کیا تھا جس کا اہم

---

[1] فی اصول الادب از احمد حسن الزیات مصر ۱۰۱-۱۰۴ مطبوعہ مصر

خلاصہ ذیل میں مختلف نقطۂ نگاہ پیش کرنے کے لئے درج کیا جاتا ہے۔

"شوقی انفرادی عظمت اور شخصی پروپیگنڈہ کا قائل رہا ہے گذشتہ نصف صدی میں اسی قسم کے رجحانات بہت زیادہ تھے جن کا سرچشمہ محل شاہی تھا جس سے شوقی وابستہ تھا اور ابھی تک قدیم ادبی حلقوں میں ان رجحانات کا تھوڑا بہت اثر باقی ہے۔ جن کا نمائندہ انشاپردازوں میں احمد حسن الزیات اور شعراء میں عزیز اباظہ ہے۔

شوقی سب سے پہلے درباری شاعر رہ چکا تھا۔ ایک طرف وہ متنبی کا مقلد تھا تو دوسری طرف فرانسیسی شاعری کا آئینہ دار بھی تھا اور صحیح معنوں میں حافظ ابراہیم کی طرح کبھی بھی قومی شاعر نہ بنا اور نہ متنبی کی نفسیاتی خصوصیات اس میں پائی گئیں۔ حافظ ابراہیم کا پیغام شاعری انتہائی درجے کا وطنی، سیاسی اور قومی پیغام تھا مگر شوقی کے بنیادی پیغام میں مصر کی قدیم عظمت، اسلامی اور عرب کی تاریخ کے گیت گائے گئے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اس کی گوناگوں تاریخی نظموں میں خلوص پایا جاتا ہے اور ان کے ذریعے اس کی غیر معمولی دماغی صلاحیت اور ذہانت کا ثبوت ملتا ہے۔ مگر عام طور پر شوقی کے کلام میں اس کی اپنی شخصیت زیادہ نمایاں اور واضح نہیں دکھائی دیتی اس معاملہ میں وہ متنبی کے مشابہ نہیں ہے کیونکہ متنبی کی زبردست شخصیت کا آئینہ اس کا کلام ہے۔ تاہم بعض باتوں میں وہ متنبی کے مشابہ ہے جن میں غرور وانانیت کی صفت بھی ہے۔"

آگے چل کر شاعر موصوف کہتا ہے "اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ شوقی کی شاعری میں قدم ترقی کی طرف آگے بڑھایا گیا ہے اس کے کلام سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ عربی زبان میں جدید خیالات ومعانی کو قدیم طرز کے سحر آفریں انداز سے اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ تصورات ومعانی اور موسیقی قارئین کی نگاہوں کے سامنے جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ تاہم شوقی وحافظ کی مصری تصویر کشی میں یہ فرق ہے کہ حافظ موجودہ مصر کی زندہ تصویر پیش کرتا ہے جس میں عوام کے مصائب، ترقی کی کشمکش اور خوف وہراس کے جذبات بھی شامل ہیں۔ مگر شوقی قدیم مصر کی تصویر کشی کرکے اس کی قدیم عظمت کے گیت گاتا ہے"[1]

---

[1] رائد الشعر الحدیث حصہ دوم از محمد عبد المنعم خفاجہ صفحہ ۶۶-۶۸۔ مطبوعہ مصر

خلیل مطران | شوقی اور حافظ کے بعد مصر و شام کا مشہور شاعر خلیل مطران تھا جو ۱۸۷۱ء میں بمقام بعلبک پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اس نے بیروت میں حاصل کی۔ اس کے بعد وہ ۱۸۹۳ء میں مصر آیا یہاں آکر اس نے کئی اخبارات و جرائد نکالے۔ وہ خدیو مصر عباس حلمی کے زمانے میں شاہی سرپرستی میں عزت و احترام کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا۔ اس نے مصری تھیٹر اور مصری ڈراموں کی اصلاح و ترقی کے لئے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ اور انگریزی اور فرانسیسی زبان کے بعض مشہور ڈراموں کو عربی زبان میں منتقل کیا اس طرح عربی ڈراموں کی زبان کو درست کر کے ان کے ادبی معیار کو بہت بلند کیا۔ ۱۹۴۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔

خلیل مطران کی شاعری پر فرانسیسی شعرا کا اثر غالب ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے وہ شوقی اور حافظ سے کم درجہ پر ہے مگر شاعری کے جدید رجحانات و خیالات کے لحاظ سے وہ موجودہ عربی شعراء کا رہنما ہے فرانس کی سیاحت اور وہاں کے قیام نے اس کے خیالات میں زبردست تبدیلی پیدا کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں مغربی شعرا کی دقت آفرینی، خیالات کی یکسوئی، اور موضوع کے مطابق مکمل اور مسلسل اشعار کی نظمیں لکھنے کا رجحان غالب ہے۔ اس کی نظمیں مشہور فرانسیسی شاعر الفریڈ دی موسیہ کے پہلے دیوان کی ہوبہو عربی شکل ہے چنانچہ موسیہ کے مانند وہ بھی محبت اور رنج و غم کے جذبات کا اظہار کرتا ہے اور اسی کے طریقہ کے مطابق صنفِ نازک کو مخاطب کر کے اپنی وارداتِ عشق بیان کرتا ہے۔

عام سماجی اور مجلسی تقریبات کے موقعوں پر اس نے حافظ اور شوقی کے بہ نسبت کم نظمیں تحریر کی ہیں تاہم قومی اور سیاسی تحریکوں کی حمایت میں اس نے کافی عمدہ نظمیں تحریر کی ہیں۔ مصطفےٰ کامل اور سعد زغلول کی تحریکات آزادی کے زمانے میں اس نے نہایت عمدہ قومی نظمیں لکھی تھیں جو اس زمانے کی آزادی کی تاریخ کا کام دے سکتی ہیں۔

مصر میں طویل قیام کے باوجود اس کے دل سے اپنے آبائی وطن شام و لبنان کی محبت محو نہیں ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی بعض دل کش اور مشہور نظموں میں اپنے پیدائشی اور

تاریخی وطن شہر بعلبک کا مؤثر الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ اور مصر و شام دونوں ملکوں کے شاندار ماضی اور عبرت انگیز حال پر آنسو بہاتا رہا ہے اس لحاظ سے محض مصر کا قومی شاعر نہیں تھا بلکہ شام و لبنان کا علاقہ بھی اسے اسی قدر محبوب تھا جس قدر وہ مصر کا دلدادہ تھا اسی وجہ سے اسے شاعر القطرین کہتے ہیں اس کی قومیت تنگ دائرہ میں محدود نہ تھی۔ اس نے حافظ و شوقی کی جدید روایات کو بھی برقرار رکھا چنانچہ حافظ کی طرح اس نے اپنے دوستوں کی وفات پر نہایت دلگداز اور پرتاثیر مرثیے بھی تحریر کئے اور شوقی کی طرح اس نے بعض عمدہ اور دلکش تاریخی نظمیں بھی تحریر کیں جو خاص و عام میں بہت مقبول ہوئیں۔ اس قسم کی نظموں میں اس کی مشہور ترین وہ نظم ہے جس میں اس نے رومن شہنشاہ نیرون کے حکم سے قدیم روما کو نذر آتش کرنے کی تفصیلات بیان کی ہیں جو ایک مشہور ادیب و نقاد زکی المحاسنی کی رائے میں عربی زبان میں آتش زدگی کے اسی قسم کے موضوع پر تین لافانی نظموں میں سے ایک نظم ہے۔ اس قسم کی پہلی نظم ابو تمام نے تحریر کی تھی جب معتصم باللہ نے رومیوں کو شکست دے کر عموریہ کا سرحدی شہر فتح کر لیا تھا اور اسے نذر آتش کر دیا تھا۔ اسی موقع پر ابو تمام نے جو قصیدہ لکھا تھا اس میں آتش زدگی کا حال نہایت عمدہ طریقہ سے بیان کیا تھا اور یہ قصیدہ اس کے دیوان کا لافانی شاہکار ہے۔

دوسری اسی قسم کی نظم ابن الرومی کی ہے جو اس نے اس موقع پر لکھی تھی جب حبشیوں (زنوج) نے بصرہ میں بغاوت کر کے شہر کو آگ لگا دی تھی۔ اس نظم میں بھی شہر کی آتش زدگی کا حال عمدہ اور مؤثر طریقے سے بیان کیا گیا تھا۔ جب سیکڑوں برسوں کے بعد شاعر موصوف نے مذکورہ بالا نظم لکھی تو اپنے بے مثل انداز بیان کی بنا پر اس موضوع پر بجا طور پر اسے تیسرے درجے پر رکھا جا سکتا ہے[1]

شاعر موصوف اپنے پیدائشی وطن کی یاد میں اپنی چچا زاد بہن نجلاء صباغ کو خطاب کرتے ہوئے لکھتا ہے

---

[1] مقالہ زکی المحاسنی مجلۃ المجمع العلمی دمشق ۲۵ جنوری ۱۹۵۰ء

هل تذكرين ونحن طفلان عهداً ابزحلة ذكره غنم
اذ يلتقي في الكرم ظلان فيضاحكان ويائس الكرم

(۱) کیا تمھیں زحلہ کے مقام پر وہ زمانہ یاد ہے جب ہم دونوں بچے تھے۔ وہ یاد اب غنیمت معلوم ہوتی ہے

(۲) جب انگوروں کی بیلوں کے پاس دو سائے ہنستے ہوئے ملتے تھے۔ اس وقت انگوروں کی وہ بیل ہم سے مانوس تھی۔

شاعر موصوف نے اس قسم کی نظمیں بھی تحریر کی ہیں جن میں قوم کے نوجوانوں کو ہمت وجرأت پر آمادہ کیا گیا ہے۔ ایک نظم میں اس نے اس وقت کا ذکر کیا ہے جب اطالوی بحری بیڑہ ساحلِ شام پر لنگر انداز ہو گیا تھا۔ ایسے نازک موقع پر شاعر موصوف نے قوم کو آنے والے خطروں سے آگاہ کیا تھا اور انھیں ہمت وجرأت کے ساتھ ان خطروں کا مقابلہ کرنے پر متوجہ کیا تھا۔

اس نے نپولین پر بھی ایک عمدہ نظم لکھی تھی جس میں اس کے اولوالعزمانہ کارناموں کا تذکرہ تھا۔[۱]

مصر کے موجودہ شعراء کا رہنما ڈاکٹر احمد زکی ابوشادی، جس کا چند سال ہوئے، امریکہ میں انتقال ہوا ہے، خلیل مطران کا بیحد مداح تھا۔ ابوشادی خود بھی ہم عصر مصر کے تجدد پسند شعراء کا قائد تھا۔ مگر وہ خلیل مطران کو تجدد پسند عربی شعراء کا قائدِ اول قرار دیتا ہے۔

اس کے نزدیک شوقی قدیم کلاسیکل عربی شاعری کا رہنما تھا مگر مطران صحیح معنوں میں جدید عربی کا بانی مبانی ہے۔ اس کی رائے میں مطران نے حافظ اور شوقی کی طرح قدیم شعراء کا اتباع نہیں کیا اور نہ قدیم کلاسکل عربی شاعری کے طرز کو زندہ کرنے کی کوشش کی بلکہ مغربی شعراء کی طرح نئے اور اچھوتے موضوعات پر تخیل آرائی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا کلام تکلف وتصنع اور قدامت پسندانہ تقلید سے خالی ہے۔ ابوشادی کی رائے میں اس کے اشعار نہ صرف عربی ادب کے بلکہ آفاقی ادب اور آرٹ کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ بلاشک وشبہ

---

[۱] جواہر الادب للہاشمی

وہ رومانیت اور جدت پسند شعراء کا پیش رو ہے اور اسی وجہ سے جدید عربی شعراء کے تخلیقی شاہکاروں پر خلیل مطران کا سب سے زیادہ اثر ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی کوششوں سے جدید عربی شاعری کو تقلید کے اثرات سے آزاد کیا بلکہ مسلسل اور مربوط خیالات کی نظموں کو رائج کر کے زبان کو خیالات کا تابع بنایا۔[1]

خلیل مطران کے شاعرانہ کمالات پر بہترین کتاب ڈاکٹر اسمٰعیل ادہم نے تحریر کی تھی جو ادارہ المقتطف نے شایع کی تھی۔

---

[1] رائد الشعر الحدیث حصہ دوم لعبد المنعم خفاجہ صفحات ۶۴-۶۹

عربی کی ایک قلمی کتاب سے
تاریخ ہند پر نئی روشنی

از
(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق استاذ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

کتاب کا نام مَسالک الأبصار فی ممالک الأَمصار ہے، مؤلف ابن فضل اللہ عُمَری ہیں جو ۷۰۰ھ میں بمقام دِمَشق پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔ پھر حکومتِ وقت سے تعلق پیدا ہوا اور جج اور سکریٹری کے معززِ عہدوں پر فائز رہے۔ عُمَری کہلانے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا نسب عمر فاروقؓ سے ملتا تھا۔ اڑتالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ ادب اور انشار میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ ان کے ہم عصر صلاح الدین صَفَدی، مصنف الوافی فی الوَفَیَات، (م ۷۶۴) کی رائے ہے کہ انشائے مراسلت میں مصر کے مشہور اور صاحبِ طرز قاضی فاضل (م ۵۹۶) سے بھی بازی لے گئے تھے۔ صَفَدی نے ان کے حافظہ اور ذہانت کی بڑے جوش بھرے الفاظ میں تعریف کی ہے۔ ان کی ادبی لیاقت اور نثر و نظم میں ان کی مہارت کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں: چنگیز خاں اور اس کے جانشین مغل بادشاہوں، سلاطینِ ہند اور ترکوں کی تاریخ پر ان جیسا مہارت رکھنے والا میں نے نہیں دیکھا اور جہاں تک مختلف ممالک کے حالات اور ان کی شاہراہوں، حدود، اور مخصوص پیداوار سے واقفیت کا تعلق ہے تو اس میں وہ امامِ وقت تھے۔" (فَوَاتُ الوَفَیات، تالیف ابن شاکر کُتُبی، مصر)

مسالک الأبصار عام معلومات یا جنرل نالج کی بہت ضخیم کتاب ہے جو بقول صَفَدی مؤلف نے بڑی تقطیع کی بیس جلدوں میں لکھی تھی اور جس کا فوٹو نسخہ اس وقت تینتالیس

جلدوں میں مصر کی قومی لائبریری میں محفوظ ہے۔ عربی میں جنرل نالج پر تصنیف کی ابتداء تیسری صدی ہجری میں ہوئی۔ اس کا محرک سرکاری ملازمین بالخصوص سکریٹریوں اور وزیروں کی معلومات میں وسعت، ہمہ گیری اور توازن پیدا کرنا تھا جہاں تک معلوم ہے ابن قتیبہ (م ۲۷۰) کی عیون الأخبار اس صنف کی اولین تصنیف تھی۔ آٹھویں صدی ہجری کے دو ہم عصر ادیبوں نے جنرل نالج پر دو بڑی کتابیں لکھیں: نُوَیری (م ۷۳۲) نے نہایۃ الأرب فی فنون الأدب اور ابن فضل اللہ عُمَری نے زیادہ وسیع پیمانہ پر مسالک الأبصار۔ اس کتاب میں مؤلف نے معلومات کے منفرد اصناف کو یک جا کر دیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی تالیف کا اکثر مواد پچھلے مصنفوں سے مستعار ہے، ان مصنفوں کی متعدد کتابیں اب نایاب ہیں، اس کے علاوہ کتاب کا ایک قلیل حصہ ان کے ذاتی آراء، مشاہدات یا ہم عصر اشخاص مثلاً سیاحوں اور سفیروں کے بیانات پر مبنی ہے۔ ہندوستان پر ان کا جو طویل باب ہے وہ بیشتر زبانی معلومات پر مشتمل ہے۔ مؤلف نے کتاب کو دو بڑے حصّوں میں تقسیم کیا ہے: ایک حصّہ میں ملکوں کے جغرافیہ، شاہراہوں، ہواؤں، خشکی اور سمندر کے عجائبات، بڑے بڑے شہروں کی جائے وقوع کا ذکر ہے، دوسرے میں دنیا کے حیوانات، جمادات اور اقوام کا۔ حیوانات میں چرندوں، پرندوں، کیڑے مکوڑوں کا، جمادات میں غلّوں پھلوں، ترکاریوں اور کانوں کا، اور اقوام میں شرق و غرب کے نئے پرانے بسنے والوں کا۔ مؤلف نے اسلامی دنیا کے مشہور سیاسی، اور اداری شخصیتوں، طبیبوں، عالموں اور فقیہوں کے سوانح اور حالات بھی دئے ہیں اور ہر ملک کی تاریخ سنہ وار ۷۴۴ ہجری تک بیان کی ہے۔ چنگیز خانی مغلوں، ہندوستانیوں، ترکوں اور کُردوں کے حالات خاص اہتمام اور تفصیل سے پیش کئے ہیں۔" (تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، از جرجی زیدان، مصر ۱۹۳۱ء ۳ / ۲۲۷)

قاہرہ کے دارالکتب میں مسالک الأبصار کے دوؔ نسخے ہیں: ایک مُصَوَّر تینتالیس جلدوں میں، دوسرا ہاتھ کا لکھا۔ دونوں میں کتابت کی غلطیاں بہت ہیں اور وہ حصہ زیادہ مسخ ہے جس میں ہندوستان کا ذکر ہے۔ فوٹو والا نسخہ نسبتۃً بہتر ہے۔ اس کے علاوہ دونوں میں مضمونی کمی بیشی، تقدیم و تاخیر اور لفظی اختلاف بھی ہے۔ مؤلف نے ہندوستان کے حالات دوؔ عنوانوں کے تحت قلم بند کئے ہیں، ایک عجائب الہند، جس میں پرانے ہندوستان کے کچھ انوکھے رسم و رواج عقاید اور کلچر کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ دوسرا عنوان مملکت الہند والسند ہے، اس میں اپنے ہم عصر سلطان محمد بن تغلق کے حالات، سیرت اور داد و دہش پر سیاحوں اور سفیروں کی زبانی روشنی ڈالی ہے۔ یہ ذکر خاصہ تفصیلی ہے اور اس سے تغلق شاہ[1]، ان کی حکومت اور ان کے عہد میں ہندوستان کی اقتصادی و اجتماعی حالات کے بعض اہم پہلوؤں پر ایسے حقایق بیان ہوئے ہیں جن سے ہندوستان میں لکھی فارسی تاریخوں کا دامن خالی ہے۔

مملکت ہند و سند

۵/۶ "یہ ایک عظیم الشان مملکت ہے، روئے زمین پر کوئی دوسری سلطنت نہ تو وسعتِ حدود، اور نہ کثرت دولت و لشکر میں اس کا مقابلہ کر سکتی ہے اور نہ سفر و حضر میں اس کے بادشاہ کی ٹھاٹ باٹ اور اس کے پایۂ تخت کی شان و شوکت میں۔ ساری دنیا میں اس سلطنت کا شہرہ ہے۔ میں اس کے بارے میں جو خبریں سُنتا اور کتابوں میں جو حالات پڑھتا وہ مجھے بہت بھاتے اور میرے اوپر اثر ڈالتے لیکن یہ مملکت چوں کہ بہت دور تھی، اس لئے متعلقہ خبروں کی توثیق سے قاصر تھا۔ جب میں نے یہ کتاب (مسالک الأبصار) لکھنا شروع کی اور

---

[1] دورِ حکومت چھبیس ۲۶ سال ۷۲۵ — ۷۵۲ھ / ۱۳۲۵ — ۱۳۵۱ء

ثقہ راویوں سے اس کے حالات دریافت کئے تو میں نے جو سنا تھا اور اُس کے بارے میں جو رائے قائم تھی، اُس سے اُس کو بہت بڑھا چڑھا پایا. مختصراً یہ سمجھ لو کہ اس ملک کے سمندر میں موتی ہوتے ہیں، خشکی میں سونا، پہاڑوں میں یاقوت و الماس، وادیوں میں صندل و کافور، شہروں میں بادشاہوں کے تخت ہیں، یہاں ہاتھی اور گینڈا (کرگدن) پایا جاتا ہے، اس کے لوہے سے مشہور ہندی تلواریں بنتی ہیں، یہاں لوہے، پارہ اور سیسے کی کانیں ہیں، اس کا ایک پودا زعفران ہے، اس کی بعض وادیوں میں بلّور ملتا ہے، انسانی منافع کا سامان اس ملک میں فراواں ہے، چیزوں کے نرخ سستے ہیں، فوج بے شمار ہے اور ریاستیں اَن گنت. یہاں کے لوگ بڑے دانا اور فلسفی عقل ہوتے ہیں، خواہشات نفس پر قابو رکھنے اور تقرب الٰہی کی خاطر مستعدی سے جان دینے میں اپنی مثال آپ ہیں۔

اپنی کتاب تحفۃ الألباب میں (أندلسی مؤلف) محمد بن عبدالرحیم غرناطی نے لکھا ہے:۔ "ہند اور چین میں شاندار حکومتیں ہیں، یہاں اعلیٰ درجہ کا انصاف ہوتا ہے، خدا نے بڑی بڑی نعمتیں ان کو عطا کی ہیں، یہاں کی سیاست و حکومت عمدہ ہے، یہاں خوش حالی اور امن کا ہمیشہ دور دورہ رہتا ہے، فلسفہ، طب، ہیئت اور صنعت گری میں اہلِ ہند، سب قوموں سے بازی لے گئے ہیں.

ہند کے پہاڑوں اور جزیروں میں صندل اور کافور پیدا ہوتا ہے اور ہر قسم کی خوشبودار بوٹیاں جیسے لونگ، جائفل (جوزبوا) بالچھڑ، دارچینی، سنج بید کے پھل کا خوشبودار تیل، الائچی، کبابہ، تباسہ (جاوتری) اور مختلف قسم کی طبی جڑی بوٹیاں مشکی ہرن اور زبادبلی بھی پائی جاتی ہے. یہاں لیکن زیادہ تر لنکا میں مختلف قسم کے یاقوت کی کانیں ہیں.

ابن عبد ربہ نے اپنی عِقد الفرید میں نُعَیم بن حمّاد کی سند پر بیان کیا ہے کہ
شاہِ ہند نے عمر بن عبدالعزیز (۹۹ - ۱۰۲) کو ایک مراسلہ بھیجا جس کا مضمون تھا:

"شاہِ شاہان کی طرف سے جو ہزار بادشاہوں کا بیٹا ہے اور
جس کی بیوی ہزار شاہوں کی بیٹی ہے، جس کے اصطبل میں ہزار
ہاتھی ہیں، جس کے دو دریا[1] ہیں جن کے پانی سے صندل، ناریل
اور کافور اُگتا ہے جن کی مہک بارہ[2] میل دور تک جاتی ہے، اُس
عرب سلطان کے نام جو خدا کی ذات و اختیار میں کسی کو شریک
نہیں ٹھہراتا، واضح ہو کہ میں آپ کی خدمت میں ایک تحفہ بھیج
رہا ہوں، تحفہ تو کیا، سلام و آداب، میری خواہش ہے کہ
آپ میرے پاس کوئی عالم بھیجیں جو اسلام کی تعلیم مجھے سمجھادے، والسلام"

مجھے شیخ عارف، بقیۂ سلف کرام، مبارک بن محمود اَنباتی نے بتایا جو
بڑے ثقہ ہیں اور جن کو شاذن صاحب خاصی (؟) کی اولاد میں ہونے کا شرف
حاصل ہے، اور چوں کہ وہ اور ان کے اسلاف اس ملک کے چھوٹے بڑے
سلاطین کے مقرب رہے ہیں، ان کے بیانات صحیح معلومات پر مبنی ہیں، وہ کہتے
ہیں کہ اس ملک میں آباد شہروں اور مزروعہ دیہاتوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جن
کی صحیح تعداد تو مجھے نہیں معلوم، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ صوبہ قنوج ایک سو بیس
لاکھ دیہاتوں پر مشتمل ہے (؟) ایک لاکھ سو ہزار کے برابر ہوتا ہے۔ اس حساب
سے کل دیہاتوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ اور چھ سو ہوئی (؟) مالوہ کا صوبہ
قنوج سے بڑا ہے لیکن اس کے گاؤوں کی تعداد بھی مجھے نہیں معلوم۔ معبر کا صوبہ کئی
جزیروں پر مشتمل ہے جو اتنے بڑے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک بذات خود ایک شاندار

[1] خط کشیدہ عبارت قلمی نسخہ میں نہیں ہے، اس کو عقد الفرید سے لیا گیا ہے۔ (عقد الفرید طبع سنہ ۱۹۴۰ء، تحقیق احمد امین ۲/۲۰۲)

سلطنت ہے، جیسے کولم، دفتن، لنکا اور مالابار (ملیبار)۔ دریائے کنوتی (؟) پر دو لاکھ چھوٹی کشتیاں دوڑتی پھرتی ہیں، ان کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ اگر تیرانداز ان کے آخر میں تیر مارے تو وہ کشتی کے وسط میں آکر لگے (؟) بڑی کشتیوں کی تعداد کم ہے۔ ان میں ایسے جہاز بھی ہیں جن میں پن چکیاں لگی ہیں اور تنور اور بازار ہیں یہ اتنے لمبے چوڑے ہوتے ہیں کہ بعض اوقات ان کے ایک حصہ کے مسافر دوسرے حصوں میں کے مسافروں سے عرصہ تک ناواقف رہتے ہیں۔۔۔۔ (؟)

۷/۵

دلی ہندوستان کا پایۂ تخت ہے، دوسرا پایۂ تخت قبۃ الاسلام (دیوگیر) ہے دلی اقلیم رابع میں واقع ہے۔ مؤلف کہتا ہے کہ سلطان حماہ (ابوالفدار) نے اپنی کتاب تقویم البلدان میں بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔ شیخ مبارک نے کہا: "قبۃ الاسلام تیسری اقلیم میں ہے، میں نے جب اس کو چھوڑا تو وہ پوری طرح تعمیر نہیں ہوا تھا، مجھے وہاں سے آئے چھ سال ہوتے ہیں، میرا خیال ہے کہ وہ اب تک ادھورا ہے، کیوں کہ تعمیر بہت بڑے رقبہ میں شروع ہوئی تھی، اور بڑی بڑی عمارتیں بنانے کا پروگرام تھا۔ تغلق شاہ نے شہر کے نقشہ میں ہر طبقہ کے لئے محلے بنانے کی رعایت رکھی تھی، ایک محلہ فوج کے لئے تھا، دوسرا وزیروں اور سکریٹریوں کے لئے، تیسرا قاضیوں اور عالموں کے لئے، چوتھا صوفیوں اور فقیروں کے لئے، پانچواں تاجروں اور پیشہ وروں کے لئے، ہر محلہ میں عام ضروریات کا انتظام کیا گیا تھا، جیسے مسجد، اذان کا منارہ، بازار، حمام، چکیاں، تنور، اور ہر صنف کے کاریگر بسائے گئے تھے جیسے سنار، رنگریز، چرم ساز، تاکہ ایک محلہ کے لوگ خرید و فروخت اور لین دین میں دوسرے محلہ کے محتاج نہ رہیں اور ہر محلہ پوری طرح خود کفیل ہوجائے

اس سلطنت میں غیر آباد علاقہ یا تو بیس دن کی مسافت کے بقدر غزنہ سے متصل ہے اور اس کی وجہ شاہ ہند کی شاہ ترکستان و ماوراء النہر سے باہمی جنگ و پیکار

ہے، یا غیر آباد پہاڑ یا تہ بہ تہ پہاڑ کی گھاٹیاں، لیکن یہاں جو خوشبودار اور طبی پوٹیاں فراہم ہوتی ہیں ان سے زراعت کے مقابلہ میں بہت زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ فاضل نظام الدین یحییٰ بن حکیم نے مجھے ایک پرانی کتاب سے روشناس کیا جو ہندوستان کے بارے میں ہے اور جس میں لکھا ہے کہ ملتان کی عمل داری میں ایسے ایک لاکھ چھبیس[۱۲۶] ہزار گاؤں ہیں جن کا سرکاری رجسٹروں میں اندراج ہے۔ ملتان اور دہلی چوتھی اقلیم میں واقع ہیں اور ہندوستان کے باقی حصے دوسری اور تیسری ہیں۔ مملکت ہند کا رقبہ بہت بڑا ہے اور یہاں کی آب و ہوا اچھی ہے، سوائے اس مضر صحت اراضی کے جہاں چاول کی کاشت ہوتی ہے۔ اس کتاب میں یہ تصریح بھی ہے کہ محمد بن یوسف ثقفی نے سندھ میں چالیس سھار سونا پایا، ایک سھار تین سو تینتیس[۳۳۳] سیر کے برابر ہوتا ہے۔ ۵/۸ سلطنت ہند کی حد غزنہ اور قندھار کی عمل داری تک پہنچتی ہے۔

میں نے شیخ مبارک سے اندرونِ ہند اور اس کے ساحلی مضافات کے حالات پوچھے تو انھوں نے کہا: ہند میں قریب دو ہزار چھوٹے بڑے دریا ہیں، ان میں سے کچھ اتنے بڑے ہیں جتنا نیل۔ دریاؤں کے کنارے گاؤں اور شہر آباد ہیں ہند میں بڑے بڑے مرغزار اور گھنے درخت پائے جاتے ہیں۔ ملک کی آب و ہوا معتدل ہے، موسموں میں فرق نہیں ہوتا، سال بھر بہار کا موسم رہتا ہے، ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ بارش چار مہینے برابر ہوتی ہے، بالعموم بہار کے آخر سے لے کر گرمی تک۔ یہاں مختلف قسم کے غلے پیدا ہوتے ہیں: گیہوں، چاول، جو، چنا، مسور، اُرد، لوبیا، تل، فُول مٹر تقریباً نہیں ہوتا، میرا خیال ہے (مؤلف کا) کہ فُول نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ ہند مفکروں اور فلسفیوں کا ملک ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ فُول سے جوہر عقل کو نقصان پہنچتا ہے، اس لئے صابیہ فرقے نے اس کا کھانا ممنوع قرار دیا ہے۔ شیخ مبارک نے کہا: پھلوں میں انجیر اور انگور کم ہوتے ہیں، انار کھٹا، میٹھا اور کڑوا تینوں قسم کا، کیلا، خوبانی، کھٹا، لیمو،

لیم (؟) نارنگی، گولر، کالا شہتوت، خربوزہ، تربوز، ککڑی، کھیرا، گول کدو خوب ہوتا ہے. امرود ہوتا ہے اور باہر سے بھی منگایا جاتا ہے. ناشپاتی اور سیب بہت کم ہے وھو دامت السفرجل (؟) اس کے علاوہ ہند میں ایسے پھل بھی ہوتے ہیں جو مصر، شام اور عراق میں نہیں ہوتے جیسے آم، بیر، کچ (؟) کرلیکا (؟) انجکی (؟) بکی (؟) نغزک آم۔ ان کے علاوہ اور بھی لذیذ اور بڑھیا پھل ہیں. فاما النارجیل فھو شجر بری حلو الجبل والنارجیل (؟) کیلا خوب پیدا ہوتا ہے لیکن دہلی میں کم ہے. گنے کی بھی افراط ہے، ایک قسم کا گنا سیاہ اور سخت چھلکے کا ہوتا ہے، چوسنے کے لئے اس سے بہتر کوئی قسم نہیں، یہ گنا کسی اور ملک میں نہیں ہوتا. گنے کی باقی قسموں سے بڑی مقدار میں شکر بنائی جاتی ہے جو مصری سے سستی ہوتی ہے یہ ڈلی کی شکل میں نہیں ہوتی بلکہ سفید میدہ کی طرح باریک ہوتی ہے. ہندوستان میں جیسا کہ شیخ مبارک نے مجھے بتایا اکیس قسم کے چاول ہوتے ہیں، شلجم، گاجر، کدو، بینگن، مارچوبہ (ھلیون) ادرک بھی ہوتی ہے، ہری ادرک کو گاجر کی طرح پکایا جاتا ہے، اس کی ہانڈی اتنی لذیذ ہوتی ہے کہ کوئی دوسری چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی. چقندر، لہسن، پیاز، پودینہ اور ثمار (؟) بھی پایا جاتا ہے. گوناگوں اقسام کے پھول ہوتے ہیں جیسے گلاب، نیلوفر، بنفشہ، مشک بید، نرگس، گل مہدی، تل کا تیل ہوتا ہے اور جلانے کے کام آتا ہے، لیکن زیتون کا تیل نہیں ہوتا، اور باہر سے منگایا جاتا ہے، شہد کی فراوانی ہے. موم بتی صرف شاہی محل میں پائی جاتی ہے، عوام اس کو نہیں رکھ سکتے.

ہندوستان میں چرنے والے مویشی اور پالتو پرند بے شمار ہیں. بھینس، گائے، بکری بھیڑ، مرغی، کبوتر، بطخ، گھٹیا قسم کے پرندا تنے ہیں کہ ان کی نہ مانگ ہے نہ قیمت. (؟) یہاں بازاروں میں قسم قسم کے کھانے بکتے ہیں: بھنا گوشت، مطنجن، تلا گوشت، منوع (؟) اور ایک دو نہیں بیسیوں قسم کا حلوا، پھلوں کا رس اور ایسے شربت جو مشکل سے کہیں اور ملیں گے.

۱۰/۵ ہندوستان میں تلوار، تیر، نیزے، زرہ بکتر اور دوسرے قسم کے ہتیار بنانے والے، نیز سنار، زرکار، زین ساز، اور دوسرے صنعت گر، خواہ ان کی عورتوں کے لئے مخصوص ہو یا مردوں کے لئے، یا اہلِ قلم کے لئے، یا اہلِ تلوار کے لئے، یا عوام کے لئے، بے شمار پائے جاتے ہیں۔

ملک میں اونٹ کم ہیں، بس بادشاہ، یا بڑے عہدے دار، خان، امیر اور وزیر اونٹ رکھتے ہیں، گھوڑوں کی کوئی کمی نہیں، ان کی دو قسمیں ہیں: ایک عربی نسل، دوسرے دوغلے۔ اکثر گھوڑے اچھا کام نہیں دیتے، اس لئے آس پاس کے سارے ترکی ملکوں سے منگائے جاتے ہیں، عربی گھوڑے بحرین، یمن اور عراق سے برآمد ہوتے ہیں، اچھی نسل کے عراقی گھوڑے جن کی بھاری قیمت وصول کی جاتی ہے ہند میں ہیں لیکن کم تعداد میں زیادہ دن یہاں رہنے سے ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں خچر اور گدھے دونوں کی سواری معیوب خیال کی جاتی ہے، کوئی فقیہ اور عالم خچر پر سواری پسند نہیں کرتا اور گدھے پر سوار ہونا تو ہندیوں کی نظر میں سخت عار کی بات ہے۔ اِس لئے سب کی سواری کا جانور گھوڑا ہے۔ کھاتے پیتے اور عہدہ دار لوگ بار برداری کے لئے گھوڑا استعمال کرتے ہیں اور عام لوگ گائے پر پالان ڈال کر۔ گائے کی رفتار تیز اور قدم لمبے ہوتے ہیں۔

شیخ مبارک نے کہا: یہ مملکت بے حد لمبی چوڑی ہے، درمیانہ چال سے تین برس چاہئیں اس کی لمبائی طے کرنے کے لئے، اس کا عرض سومنات ولنکا کے بیچ سے غزنہ تک اور طول عدن کے سامنے والے بندرگاہ (؟) سے سد سکندر تک، جہاں بحر ہند، (؟) بحر محیط سے نکلتا ہے۔ اس لمبے چوڑے رقبہ میں بڑے شہروں کا ایک سلسلہ ہے جہاں شاہی نمایندے

اور تخت نشین حاکم رہتے ہیں، جن کی عمل داری میں شہر، قصبے، گاؤں، جائدادیں اور بازار ہیں، جہاں ہر طرف آبادی اور زراعت ہے. شیخ مبارک کی رائے کہ یہ مملکت لمبائی میں تین سال کی مسافت کے برابر ہے غور طلب ہے، کیوں کہ تین سال کی مسافت تو کل آباد دنیا کی بھی نہ ہوگی. ہاں اگر شیخ مبارک کا مطلب یہ ہے کہ اس مملکت کے سارے شہروں کا گشت کرنے کے لئے تین سال درکار ہیں تب کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا. شیخ مبارک نے بتایا کہ اہل قراجل (؟) سلطان دہلی کے تابع ہیں انھوں نے ایک مقررہ خراج کے مقابلہ میں سلطان سے عارضی صلح کرلی ہے. قراجل پہاڑ میں سونے کی سات کانیں ہیں، جن سے بے شمار دولت حاصل ہوتی ہے. خشکی اور سمندر کی یہ بڑی سلطنت چند غیر مفتوح جزیروں کو چھوڑ کر موجودہ سلطان دہلی (محمد بن تغلق) کے قبضہ میں ہے. ساحل کی ایک بالشت زمین بھی ایسی نہیں جس پر اس کا عمل دخل نہ ہو. اس ساری حکومت کے طول و عرض میں اس کا سکہ چلتا ہے اور اس کے نام پر خطبہ پڑھا جاتا ہے اور کہیں اس کا کوئی حریف نہیں.

(باقی)

رفاہ عام

از

(جناب مولوی محمد انظر شاہ صاحب استاذ دار العلوم دیوبند)

(۵)

بیت المقدس میں مسلمانوں کی طرف سے جو ہسپتال کھولا گیا تھا اس کے متعلق لکھا ہے

"یہ ایک اعلیٰ درجہ کا دار الشفا ہے جس کے لئے زر کثیر وقف کیا گیا ہے ہزار ہا بیماروں کو یہاں دوا اور غذا دی جاتی ہے بہت سے تنخواہ یاب طبیب مقرر ہیں جو ہر وقت شفاخانہ میں موجود رہتے ہیں" (ناصر خسرو ص ۲۶)

دمشق کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ یہاں تقریباً ۲۰ کالج ہیں انگریز مصنف جی۔ بی اسٹرینج لکھتا ہے

"یہاں دو بیمارستان ہیں ایک پرانا اور ایک نیا، نیا شفاخانہ زیادہ وسیع اور بہتر بنا ہوا ہے اس کے وقف کی آمدنی ۱۵ پونڈ روزانہ ہے بیماروں کو دیکھنے کے لئے اطبا مقرر ہیں اور غذا، و دوا کے سرکاری طور پر پہنچانے کا انتظام ہے" بلاد فلسطین وشام ص ۲۰۵

اور مورخ صلیبی معرکوں کے مشہور شہسوار سلطان صلاح الدین ایوبی کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ قاہرہ میں جو شفاخانہ سلطان نے تیار کرایا تھا وہ ایک نہایت خوبصورت اور شاندار ایوان ہے ہر کمرہ نہایت صاف اور پاکیزہ اور تمام کمروں میں چادر لگے ہوئے سلیقہ سے پلنگ بچھائے گئے ہیں اس کے لئے دواساز اور منشی مقرر ہیں۔ دواخانہ کا انتظام ایک سکریٹری کے متعلق ہے جس کے ماتحت بہت سے نوکر ہیں جو صبح و شام مریضوں کو دیکھتے ہیں۔ دوائیں غذائیں بہم پہنچائی جاتی ہیں اور مریضوں کی بڑی دلسوزی کے ساتھ خدمت کی جاتی ہے اس کے بعد یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ

"عورتوں کے علاج کے لئے ایک جداگانہ قطعہ ہے اور ان کی خدمت خبر گیری اور علاج کے لئے عورتیں ہی مامور ہیں"

اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ

"پاگلوں کے علاج کے لئے الگ مکانات ہیں جن کا احاطہ نہایت وسیع اور دریچوں میں لوہے کی جالیاں ہیں"

اور آخر میں سب سے زیادہ حیرت انگیز جو بات سنائی گئی ہے وہ یہ ہے

"جو لوگ شفاخانوں میں علاج کسرِ شان سمجھتے ہیں ان کے لئے طبیب و جراح مقرر ہیں جو گھر پر جا کر ان کا علاج کرتے ہیں" حیات ایوبی ص ۲۱۱

کوئی ٹھکانہ ہے سلطان کی اس بلند حوصلگی کا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کا یہ دردمند ترجمان اپنے الوالعزمانہ کارناموں کی وجہ سے تاریخ میں ایک شاندار کردار کا مالک ہے۔ سلطان کے ساتھ معاشرت اور ایسے فیاض و کشادہ دل انسان کے ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے خود سلطان کی بیگم عصمیہ خاتون جس درجہ کی سخی و جواد تھی اس کے متعلق اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے

"اس نے فقراء کے مواجب مقرر کئے تھے۔ فقیہوں اور زاہدوں کے لئے سرائیں بنوائی تھیں۔ معلمین کی تنخواہیں مقرر کیں۔ طلباء کو کھانا اور پوشاک اس کے ہاں سے ملتا تھا۔ اس کے وقف کئے ہوئے مکانات و انعامات سے مدت دراز تک لوگوں نے فائدہ اٹھایا" (ایضاً)

دیانت پسند مورخ کا قلم، اس فیاض اور پاک نہاد خاتون کے تذکروں سے تاریخ کی کتابوں کو یقیناً زینت بخشے گا، اور انسانیت نواز حلقوں میں عصمیہ خاتون کی فیاضی ہمیشہ یاد رہے گی۔

لنگر خانے اور محتاج گھر جا بجا لنگر خانوں کا انتظام بھی مسلمانوں کی طرف سے کیا گیا تھا جن سے عام طور پر کھانا دونوں وقت ملتا اور محتاج خانوں میں ان کے رہنے سہنے کا آرام دہ اور راحت بخش انتظام کیا جاتا۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے

"ایک لنگر خانہ قائم کیا جس سے فقیروں، مسکینوں اور مسافروں کو کھانا ملتا تھا" طبری ص ۱۳۶۴

ولید نے

"غرباء اور مساکین کے لئے محتاج خانے قائم کئے اندھوں کے واسطے راہبر اور اپاہجوں کے لئے خدمت گار مقرر کئے اور ان کو وظیفہ دیا" (تاریخ امت جلد ۳ ص ۱۲۷)

وظائف | ان لنگر خانوں اور محتاج گھروں کے علاوہ جن کا انتظام جابجا، غربا و فقرا کے لئے کیا گیا تھا، وظائف کی شکل میں ایک بڑی بھاری وہ رقم بھی تھی۔ جو مسلمانوں کی طرف سے مفلس اور قلاش لوگوں کو پہنچتی رہتی تھی۔ گویا کہ اس طرح غریب و حاجت مند لوگوں کی ضروریات و حوائج کو پورا کرنے کی سینکڑوں صورتیں پیدا کی گئی تھیں۔ یہ واقعہ ہے کہ غریب کو اپنے سرمایہ میں شریک کرنے کے جو سینکڑوں راستے اسلام نے پیدا کر دیئے ہیں۔ اگر ان راہوں سے قلاش لوگوں تک ضرورت کے مطابق امک پہنچتی رہے تو بلاشبہ سرمایہ دار اور غریب کے درمیان جھگڑے ختم ہو کر، اشتراکیت و سرمایہ داری کے لاینحل مسائل خود بخود طے ہو جائیں بہرحال مہدی کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے حکم دیا تھا

"ہر جذامی کو بیت المال سے وظیفہ دیا جائے تاکہ روزی کی تلاش میں جابجا ان کو گھومنا نہ پڑے اور یہ متعدی مرض پھیلنے نہ پائے۔ نیز قیدیوں کے عیال کو بھی جن کے گزر کی کوئی صورت نہیں۔ روزینہ دیا جایا کرے۔
تاریخ امت دوم صفحہ ۸۱)

متعدی امراض کے سلسلے میں مہدی کی یہ عجیب و غریب تجویز، بڑی مناسب اور موزوں ہے اگر آج بھی حکومتیں۔ اس قسم کی تجاویز پر عمل کریں تو کافی حد تک موذی بیماریوں کا سدِ باب ہو سکتا ہے۔ وظائف کی شکل میں غریبوں تک اچھی خاصی مقدار میں روپیہ پہنچانے کا یہ نظم مسلمانوں کے دور میں کافی طویل تھا اور یہاں تک کہ عورتیں بھی اس سے دلچسپی لیتی تھیں، سلطان ایوبی کی بیگم عصمیہ خاتون کے متعلق آپ مجھ سے ہی سن چکے ہیں کہ اس نے اپنے وظائف سے ایک بڑی جماعت کو کسبِ معیشت کے جھنجٹوں سے آزاد کر رکھا تھا۔

اوقاف | امیر شکیب ارسلان نے ان تمام اوقاف کی تفصیل سنائی ہے جو مسلمانوں کی طرف سے قائم تھے۔ اس تفصیل کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اوقاف کے کاموں سے مسلمان کس قدر دلچسپی لیتے تھے امیر نے اوقاف کے سلسلہ میں لکھا ہے

"دمشق میں ایک وقف کا مصرف صرف یہ ہے کہ کسی غلام سے چینی کے برتن اگر ٹوٹ جائیں تو فوراً غلام کی طرف

سے اس برتن کا معاوضہ برتن ہی کی شکل میں مالکوں کے پاس پیش کردیا جائے ہر سال اس وقف میں چینی ظروف کا ایک بڑا ذخیرہ اسی لئے محفوظ رکھا جاتا ہے"

کیا ٹھکانہ ہے مسلمانوں کی اس بلند حوصلگی کا۔ کہ رفاہِ خلق کے لئے ان کے نیک جذبے خدمت کی کیا کیا شکلیں نکال لیتے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ صدیوں تک مسلمانوں نے عام انسانوں کی خدمت جس انداز میں کی ہے۔ بلا مبالغہ، اقوام کی تاریخ اس نوعیت کی خدمات سے قطعاً خالی ہے امیر نے ایک دوسرے وقف کے متعلق اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے

"اس وقف سے مختلف علاقوں میں غربار کی لڑکیوں کی شادی کے انتظام ہوتے تھے"

بعض اوقاف اس لئے بھی تھے کہ

"جن عورتوں کے پاس زیور نہ ہو ان کو عاریۃً زیور دیئے جائیں"

ٹیونس میں ایک خاص موسم میں لذیذ مچھلی نمایاں ہوتی ہے لیکن اتنی گراں قیمت کہ ہر شخص خرید کر کھا نہیں سکتا، ایک صاحبِ خیر مسلمان نے

"جائداد وقف کردی کہ اس کی آمدنی سے یہ موسمی مچھلیاں غربار کو مہیا کی جائیں"

مراکش میں ایک بڑا وقف مجنوں اور پاگلوں کی خبر گیری کے لئے تھا۔ اور اسی وقف سے غربار کے لئے ہر سال موسم سرما میں گرم کپڑوں کا انتظام ہوتا تھا۔ مراکش ہی میں ایک فرانسیسی سیاح نے ایک اسلامی وقف کے متعلق بتایا ہے کہ

"اس کے مصارف سے اتنا بڑا مکان بنایا گیا ہے جس میں چھ ہزار اندھوں کو پناہ ملی ہوئی تھی ان کے کھانے، پینے، لباس اور تمام ضرورتوں کا کفیل یہی وقف تھا" حاشیہ حاضر العالم الاسلامی ا ص ۲۹۲

بعض مجسم خیر لوگوں نے تو یہاں تک اوقاف کی خدمات کے حدود بڑھا دیئے کہ اگر میاں اور بیوی میں جھگڑا ہو اور ناراض ہو کر بیوی شوہر سے علیحدہ ہو جائے تو اس پورے زمانے میں اوقاف کی طرف سے عورت کو اخراجات ملتے تھے۔ بعض ایسے بھی اوقاف تھے جو غریب گھرانوں میں شادی کے وقت فرش و فروش کا انتظام کرتے۔ بہرحال یہ اوقاف اور ان کی تفصیل بہت

زیادہ ہے۔

رسل ورسائل | مسلمانوں نے رسل ورسائل اور ڈاک کا سلسلہ بھی قائم کرکے اس کے حدود تمام ممالک اسلامیہ میں پھیلا دیئے تھے جیسا کہ انگریز مورخ لکھتا ہے کہ

"ملک شام میں سلطنت اسلامی کے دوسرے ملکوں کی طرح ڈاک کی سڑکوں کا جال سا بچھا ہوا ہے اور جابجا برید خانے ہیں جن میں سرکاری خرچ سے سوار متعین رہتے ہیں" (بلاد فلسطین وشام ص۵۹)

اس سے معلوم ہوا کہ دوسرے اسلامی علاقوں میں بھی اسی اہتمام کے ساتھ رسل ورسائل کا باقاعدہ نظام قائم کیا گیا تھا اور رفاہِ خلق کے اس شعبہ سے مسلمان غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ مورخین کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر معاویہ کے زمانہ میں اس شعبہ نے منظم طور پر کاروبار شروع کیا۔ چنانچہ لکھا ہے

"برید کے نام سے مستقل شعبہ انھوں نے قائم کیا تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر چابک دم گھوڑے تیار رہتے جو ادھر کی خبریں ادھر پہنچاتے" الفخری ص۹۷

مہدی نے بھی مکہ، یمن، عراق کے شہروں میں ڈاک کا سلسلہ قائم کیا تھا۔ بہر حال رفاہِ خلق کے اس شعبہ میں بھی مسلمانوں کی خدمات دوسری قوموں سے کم نہیں۔ بلکہ یوں کہنا صحیح ہوگا کہ ڈاک کا موجودہ مرتب سلسلہ، مسلمانوں کی اس سلسلہ میں ایجادات کی ایک صاف ستھری شکل ہے۔

یوسف بن عمر کے زمانہ میں ڈاک کا خرچ چالیس لاکھ روپیہ سالانہ تھا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسلمان اس شعبہ سے کس قدر دلچسپی لیتے تھے۔

نصیبین کے بچھو | زہریلے جانوروں کے مارنے کی مہم موجودہ وقت کا ایک دلچسپ اور مفید مشغلہ ہے۔ مچھر، مکھیاں مارنے کی ترغیب حکومتوں کی طرف سے عوام کو دی جاتی ہے۔ اور ہزارہا بیماریوں کے پھیلنے کے خطرہ کا اس طرح مقابلہ کیا جاتا ہے۔ پچھلے سال چین میں ماؤسی تنگ صدر جمہوریہ کی طرف سے مکھیوں کو مارنے کی ایک کامیاب مہم چلائی گئی تھی۔ شاید موجودہ وقت میں جبکہ مچھر اور مکھی مار مہم سے عوام کی دلچسپیاں بڑھ رہی ہیں یہ انکشاف دلچسپ ہوگا کہ

رفاہِ خلق کے اِس شعبہ کی بھی بنیاد مسلمان اپنے دور میں ڈال چکے تھے۔ چنانچہ امیر معاویہ کے متعلق لکھا ہے

"ان کو نصیبین کے عامل نے لکھا کہ میرے ساتھیوں کی ایک جماعت کو بچھوؤں سے اذیت پہنچی ہے معاویہ نے اس کے جواب میں لکھا کہ شہر کے تمام محلہ والوں پر بچھوؤں کی تعداد مقرر کر دو کہ وہ روزانہ اتنے بچھو لایا کریں اس نے یہی کیا وہ لوگ بچھولے کر آتے اور وہ ان کو مار ڈالنے کا حکم دیتا" فتوح البلدان ص ۲۹۶

بلکہ صرف یہی نہیں بعض شہروں میں بچھوؤں کے طلسم کا بھی انتظام کیا گیا تھا تاکہ ڈنک مارنے کی صورت میں علاج کیا جا سکے اب میں اس کی تفصیلات کہاں تک سناؤں۔

بندرگاہیں مسلمانوں نے اپنے دور میں بندرگاہیں بنائیں وہی بندرگاہیں جو اس ارتقائی دور میں کسی ملک کا سب سے بڑا قیمتی ذخیرہ سمجھا جاتا ہے۔ اور بحری راستوں سے نقل و حمل کا جو سب سے بڑا ذریعہ ہے چنانچہ بندرگاہ غسان کی

"اسلامی عہد میں از سر نو تعمیر ہوئی" دمشقی ص ۲۰۸

اس کے علاوہ دوسری بھی بندرگاہیں تعمیر ہوئیں۔ طوالت کے خوف سے ان کا ذکر چھوڑ رہا ہوں! بہر حال اسلامی عہد میں رفاہِ عام کے سلسلہ میں جو کچھ ہوتا رہا یہ اس کا ایک ناقص اور غیر مکمل مرقع ہے۔ بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ ابھی تو سینکڑوں رفاہِ خلق کے ایسے شعبہ ہیں جن کا ذکر میں نے قصداً چھوڑ دیا ہے۔ مثلاً تعلیم سے متعلق مسلمانوں کی دلچسپی۔ اور اس میں کروڑہا کی رقم کا صرفہ۔ جا بجا مدارس، مکتب، کالج اور یونیورسٹیاں، طلبار اور اساتذہ کے لئے، ہر قسم کے آرام دہ انتظام اور ان کی متعلقہ تفصیل۔ اسی طرح زراعت و باغبانی اور تقلیم کے حیرت انگیز کارنامے، چراگاہوں سے متعلق اسلامی قوانین، دکانیں، بازار، تفریح گاہیں، عجائب خانے، اور چڑیا گھر، اس قسم کے سینکڑوں امور ہیں جن کا ذکر بھی نہ آسکا۔ میرے سامنے ابھی اتنے عنوانات باقی ہیں جن کے پیشِ نظر میں سمجھتا ہوں کہ اس مقالہ میں مسلمانوں کے رفاہ عام سے متعلق جس قدر تفصیل ہونا چاہیے تھی۔ نہیں ہو سکی۔ اسی طرح ہندوستان میں مسلمانوں کے رفاہِ خلق سے متعلق امور کا ذکر بھی نہ آسکا۔ حالانکہ ہندوستان میں

بیٹھ کر لکھنے والے کو اپنی رفاہیت عامہ کا تذکرہ کرنا چاہئے تھا۔ جو اس ملک کے گوشہ، گوشہ میں مسلمانوں نے انجام دیئے اور جن کے مٹے ہوئے کچھ نشانات اب بھی باقی ہیں۔ انشاءاللہ کسی فرصت میں ہندوستان کے متعلق تفصیلات پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اب تو صرف یہ چاہتا تھا کہ رفاہِ عام سے متعلق ایک ہلکی سی تفصیل سامنے آجائے تاکہ خدمتِ خلق کے جو امور مسلمانوں نے انجام دیئے ان کی نوعیت مکمل نہیں تو ادھوری ہی سامنے ہو۔ اور اس تڑپتی ہوئی انسانیت کو معلوم ہو کہ عروج وارتقار کے بعد اس مسلم قوم پر جو تنزل و انحطاط کا دور شروع ہوا ہے اس کے نتیجے میں انسانیت نے اپنے ایک بہترین اور کارآمد خادم کو کس طرح ضائع کر دیا۔ اور رفاہیت عامہ کے جو عظیم الشان کام مسلمان انجام دے رہے تھے اور جن سے بلا تخصیص مذہب وملت سب ہی فائدہ اٹھاتے تھے ان کا سلسلہ منقطع ہونے سے کیا نقصان پہنچا۔ ہر وہ قوم جس میں فکرِ آخرت، اور آخرت کا یقین، موجود نہ ہو۔ اور جو اس زندگی کے بعد شروع ہونے والی دوسری زندگی سے انکار کرتی ہو۔ رفاہیت کے اتنے شاندار کارنامے اس قوم سے بعید ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے دور میں خدمتِ خلق کے جو نرالے کارنامے انجام دیئے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ اس دنیا کو آخرت کی کھیتی ان کو سمجھایا گیا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رفاہِ عام اور خدمتِ خلق کے لئے اس قوم کو بیدار کرنا ہوگا جو اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی پر یقین رکھتی ہے۔ اور جس کو سمجھایا گیا ہے کہ حیاتِ اخروی کی فوز وفلاح اس کائناتِ انسانی کی اخلاص کے ساتھ خدمت کرنے پر ہے۔ مضمون نگار کا قلم جس درد و دل سوزی کے ساتھ سوچنے کے لئے یہ نقاط پیش کر رہا ہے کاش کہ انسانوں کا عام ہجوم اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا کرے اور اس طرح انسانیت کے جسم زار پر مرہم ومداوا کے صحیح ذخیروں کا تلاش کرنے والوں کو سراغ مل سکے۔

ادبیات

غزل

از

(جناب الم مظفرنگری)

لئے ساغر میں ہر گل بادۂ گل فام آتا ہے
بہار آتی ہے یا گلشن میں دورِ جام آتا ہے

کسی کی خلوتوں میں جامِ بعدِ جام آتا ہے
کوئی تا میکدہ جا کر بھی تشنہ کام آتا ہے

جسے فرصت نہیں دیتے ہیں عیش و غم کے ہنگامے
وہ تیرے دام میں اے گردشِ ایام آتا ہے

حقیقت تم نہ پوچھو اس متاعِ بے حقیقت کی
یہ ٹوٹا دل بتاؤں کیا تمھیں کس کام آتا ہے

فضائیں گونجتی ہیں اور ہوائیں تھرتھراتی ہیں
سنبھل جاؤں کہ اب اُن کا کوئی پیغام آتا ہے

خدا شاہد کہ یہ سب جبرِ فطرت کے کرشمے ہیں
نہ خود کوئی قفس میں اور نہ زیرِ دام آتا ہے

مرے نقصِ خودی و بے خودی سے میکدے والو
مجھی پر ہی نہیں ساقی پہ بھی الزام آتا ہے

میں اس کی تابشوں میں اپنے جلوے دیکھ لیتا ہوں
کبھی جب سامنے وہ جلوۂ بے نام آتا ہے

ہمیں محروم رہتے ہیں تری محفل میں اے ساقی
کہ ہم تک جب کبھی آتا ہے خالی جام آتا ہے

سرِ رخسار زلفیں دیکھ کر دل کیوں نہ کھنچ آئے
کہ ہر پروانہ گردِ شمع وقتِ شام آتا ہے

پئے تنظیمِ نغماتِ ازل بیدار ہوتے ہیں
سرِ محفل کوئی جب صاحبِ الہام آتا ہے

الم کو نسبتِ دیرینہ ہے مے خانۂ دل سے
وہیں سے اس کی خاطر بادۂ خیام آتا ہے

تبصرے

فتوح الغیب اردو تقطیع متوسط۔ ضخامت ۲۲۸ صفحات۔ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۲ ؎ پتہ:۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن (آندھرا پردیش)

فتوح الغیب کے نام سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال و ملفوظات کا ایک مجموعہ عام طور پر مشہور ہے۔ سب سے پہلے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اس کا ایک نسخہ حجاز سے لائے اور فارسی میں اس کا ترجمہ کیا اس کے بعد سے اب تک اس کتاب کے متعدد ترجمے شائع ہو چکے ہیں مگر چوں کہ مروجہ تراجم کی زبان سہل نہیں تھی اس لئے اب اس کا ایک اور نیا ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب جس کو مقالات کہا جاتا ہے درحقیقت مقالات مبنی اقوال و ملفوظات ہے چنانچہ اس میں بلا کسی ربط و تسلسل کے حکمت و موعظت کی مختلف باتیں یک جا کر دی گئی ہیں چوں کہ اس میں اتباعِ شریعت اور اتباعِ سنت پر جگہ جگہ بہت زور دیا گیا ہے اس لئے جو لوگ تصوف میں غلو کے باعث شریعت کے معاملات میں تساہل برتتے ہیں یا اس کو چنداں اہمیت نہیں دیتے ان کو اس سے بہت فائدہ پہنچے گا علاوہ ازیں کتاب میں جگہ جگہ دنیا کی بے ثباتی، یومِ آخرت کی اہمیت، ذات باری تعالےٰ کے ساتھ محبت کا ولولہ اور لقائے رب کا شوق اعلیٰ و بلند اخلاق وغیرہ یہ تمام مضامین پائے جاتے ہیں۔ پھر زبان و بیان نہایت موثر اور ولولہ انگیز ہے شروع میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے حضرت شیخؒ کے سوانح و حالات ہیں۔ جو مولانا کی ایک تصنیف سے ماخوذ ہیں۔ امید ہے کہ مسلمان اس کے مطالعہ سے فائدہ اُٹھائیں گے۔

بُرہان

جلد ۴۱ شمارہ ۲

اگست ۱۹۵۸ء مطابق محرم الحرام ۱۳۷۸ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں مغرب کے استعمار پرستوں نے عربوں کو ترکوں سے ٹکرایا۔ اور جب جنگ ختم ہوگئی تو عربوں کو اس وفاداری کا صلہ یہ دیا کہ ان کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں اور ریاستیں قایم کردیں۔ یہ حکومتیں اگرچہ کہنے کو آزاد تھیں لیکن مختلف معاہدوں اور اجارہ داریوں کے ذریعہ مغربی طاقتوں نے ان عرب ممالک میں اس طرح اپنے پنجے جمالئے کہ دراصل اقتدارِ اعلیٰ انھیں طاقتوں کا تھا اور عرب ممالک کی حیثیت ایک باجگذار ملک سے زیادہ نہیں تھی ان ملکوں میں مغربی طاقتوں کے سیاسی استیلا و اقتدار کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب قومیت کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ ایک خاص طبقہ کے علاوہ ملک میں غربت و افلاس عام ہوگئے اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ عربوں کی دینی و اخلاقی حالت بے حد سقیم ہوگئی جو پسماندہ طبقے تھے وہ اپنی غربت اور جہالت کے باعث اور جو اونچے طبقہ کے لوگ تھے وہ مغربی تعلیم و مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات کی وجہ سے اسلامی تعلیمات سے بہت دور جا پڑے۔

لیکن دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب ایشیا کی آزادی کا دور آیا۔ اور مغربی استعماریت کی زنجیریں ایک ایک کرکے ٹوٹنے لگیں تو اُس کے اثرات عرب ممالک پر بھی پڑنے شروع ہوئے اور اُس کا جو نتیجہ ہوا وہ ہر ایک کے سامنے ہے۔ مصر کا عظیم الشان انقلاب۔ نہر سوئز کے معاملہ پر برطانیہ اور فرانس کی شکستِ فاش و سخت ذلت و رسوائی۔ شام، یمن اور مصر کا متحد ہوکر ایک جمہوریہ بنالینا۔ لبنان میں مسلسل بغاوت۔ شرق اردن میں اضطراب و بے چینی۔ اور پھر سب سے آخر میں عراق میں عظیم الشان انقلاب۔ یہ سب اس بات کی کھلی نشانی ہیں کہ عرب قومیت کا شیرِ عرین عرصہ دراز کی خوابِ غفلت کے بعد پوری قوت کے ساتھ بیدار ہوچکا ہے اور اس نے عزم بالجزم کرلیا ہے کہ وہ زنجیرِ استعماریت کے ہر ہر حلقہ کو پاش پاش کرکے رکھ دے گا۔ اور اپنے لئے مکمل آزادی

اور خود مختاری حاصل کر کے دم لے گا اور پوری عرب قوم متحد و متفق ہو کر دنیا کی ایک عظیم اور آزاد طاقت کی حیثیت سے زندگی بسر کرے گی۔

یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اگرچہ عربوں کی اس تحریک آزادی و استقلال کا سر عنوان قومیت ہے اور وہ خود بھی یہی کہتے ہیں۔ لیکن اس قومیت میں اور مغرب کی مصطلح قومیت میں بہت بڑا فرق ہے۔ مغرب کی اصطلاح میں جس کو قومیت کہتے ہیں اس کا دار و مدار اتحادِ ملک و وطن پر ہے اور وہ ایک ایسا بت ہے جس کی لوگ پوجا کرتے ہیں لیکن عربوں کی قومیت کی بنیاد وحدتِ مذہب اور وحدتِ زبان پر ہے۔ اس بنا پر جب کبھی عرب کہتے ہیں کہ ہم ایک قوم ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارا ایک مخصوص نظامِ حیات اور دستورِ زندگی ہے جس کو اسلام کہتے ہیں۔ اور قومیت کے لیے اُن کی جدوجہد کا ایک بالواسطہ مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کو اجنبی اثرات سے آزاد کر کے پھر اُس کی شوکت و عظمت کا پرچم لہرانا چاہتے ہیں اس لیے عربوں کی اس جدوجہد کا نتیجہ صرف یہ نہیں ہو گا کہ عرب بحیثیت ایک قوم کے آزاد و سربلند ہو جائیں گے بلکہ یہ بھی ہو گا کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا دور شروع ہو گا۔ چنانچہ صدر جمال عبدالناصر پہلی مرتبہ روس گئے تو وہاں انھوں نے شراب کو ہاتھ لگانے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ اسلام میں حرام ہے اس کے علاوہ جو لوگ اُن کو کمونسٹ ہو جانے کا طعنہ دیتے ہیں اُن کے جواب میں وہ بار بار اعلان کر چکے ہیں کہ ایک مسلمان کس طرح کمونسٹ ہو سکتا ہے صدر ناصر کے علاوہ عراق کی انقلابی حکومت کے وزیر اعظم عبدالکریم قاسم کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ بڑے مذہبی آدمی اور نماز روزہ کے پابند ہیں اور ۲۶ ر اور ۲۷ ر جولائی کی درمیانی شب میں انھوں نے اور ان کے ساتھ دوسرے وزراء نے جو اعلان کیا ہے اُس میں صاف کہا ہے کہ ملک کا مذہب اسلام ہو گا۔

اس موقعہ پر ایک واقعہ یاد آگیا ۳۶ء یا ۱۹۳۷ء کی بات ہے۔ ایک روز میں ماسٹر (اور اب ڈاکٹر) عبداللہ چغتائی کے ساتھ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کی خدمت میں عصر و مغرب کے درمیان ان کی کوٹھی پر حاضر تھا۔ ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ڈاکٹر صاحب ایک سپرنگ دار مسہری پر نیم دراز تھے۔ عرب ممالک کا ذکر آگیا تو ڈاکٹر صاحب نے ان ممالک کے سیاسی، دینی اور اخلاقی انحطاط پر بڑے دکھ اور درد کا اظہار فرمایا لیکن یہ ذکر کرتے کرتے اچانک حقہ کا اک کش لیا اور پھر جذباتی انداز میں کہنے لگے کہ "میں بہرحال مایوس

نہیں ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ ایشیا کی تمام قومیں آزاد ہوں گی اور اُس وقت عرب بھی اپنی عظمت رفتہ واپس لینے کے لئے متحد و متفق ہو کر بحیثیت ایک قوم کے ابھریں گے اور اُن کی قیادت مصر کرے گا۔ میں نے پوچھا کہ مصر تو مغربیت میں سب سے زیادہ ڈوبا ہوا ہے" فرمایا "مصر کا ذہن بیدار ہے۔ اُن کو اسلام سے سچی محبت ہے۔ علوم جدیدہ میں وہ سب عربوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ اور پھر جسمانی لحاظ سے بھی وہ سب سے زیادہ مضبوط اور تندرست ہیں۔ اس بنا پر قیادت کی صلاحیت سب سے زیادہ انھیں میں ہے رہی اُن کی مغربیت تو میں اس سے نہیں گھبراتا۔ اگر ذہن مسلمان ہو تو یہی مغربیت اپنی انتہا کو پہنچ کر اور زیادہ پختگی ایمان کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ خود میرا حال یہ ہے کہ یورپ میں رہ کر اسلام پر میرا عقیدہ جتنا پختہ ہوا پہلے ایسا نہیں تھا، آج یہ واقعہ یاد آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ ترجمانِ حقیقت کی چشم بصیرت نے اب سے تیس سال قبل کس طرح ان واقعات کو دیکھ لیا تھا جو آج پیش آرہے ہیں۔

اسلام کے اعلیٰ ترین نظامِ زندگی ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ لیکن بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ کوئی حکومت ایسی قایم نہیں ہے جو اس نظامِ حیات کا عملی نمونہ پیش کرتی ہو۔ اس بنا پر اسلام صرف ایک فلسفہ ہو کر رہ گیا ہے اور اُس میں وہ جذب و کشش باقی نہیں رہی جو اپنوں اور غیروں کو پوری قوت کے ساتھ متاثر کر سکے۔ اکبر الہ آبادی کے بقول

نہ ہو مذہب میں گر زورِ حکومت — تو وہ مذہب نہیں اک فلسفہ ہے

صرف یہی ایک جذبہ تھا جس کی وجہ سے بہت سے قوم پرور مسلمان زعما اور علما بھی جو اپنے وطن سے محبت بھی رکھتے تھے اور جن کو برادرانِ وطن کے ساتھ کسی قسم کا کوئی عناد بھی نہیں تھا قیام پاکستان کے حامی ہو گئے تھے، لیکن آج اس ملک کے اربابِ اقتدار کے ہاتھوں اس جذبہ کو جس مایوسی سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ ان حالات میں مشرقِ وسطیٰ کی طرف سے امید کی ایک کرن پھوٹی ہے۔ کیا عجب ہے کہ کل جو قوم قرآن کی اولین مخاطب اور اسلام کی اولین حامل و مبلغ تھی۔ تاریخ کے اس دورِ انقلاب میں پھر وہ اپنے اُس دیرینہ فریضہ و منصب کو ادا کرنے کے لایق بنے

کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

گذشتہ ماہ کی روداد سفر حیدرآباد میں ایک بڑی فروگذاشت یہ رہ گئی کہ حیدرآباد کے اخبارات کا شکریہ ادا کرنا بھول گیا جو میرے ورود حیدرآباد کی خبر اور مجھ سے متعلق دوسری خبریں بھی روزانہ شائع کرتے رہے اس سلسلہ میں، جناب مولوی منیر احمد صاحب صدیقی خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے آمد کی خبر کے ساتھ ساتھ ایک تعارفی نوٹ بھی لکھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ حیدرآباد کے اسٹیشن پر کافی حضرات تشریف لائے تھے لیکن جب میں لاعلمی کی وجہ سے سکندرآباد سٹیشن پر ہی اُتر کر وہاں سے سیدھا

پہونچنے کی اطلاع ان حضرات کو بروقت نہیں ہو سکی۔ ان حضرات سے بھی معذرت خواہ ہوں اور ارباب جرائد کا شکر گزار ہوں۔

مرزا رحیم بیگ محمد درویش عظیم آبادی شہیدؒ

از تبرکات

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ)

ہم اس مقالہ کے لئے اپنے دوست سُہیل صاحب عظیم آبادی کے ممنون ہیں جنہوں نے اُس قدیم و عمیق تعلق کی بنا پر جو حضرت مولانا مرحوم کو " برہان " اور اُس کے کارکنوں سے تھا، یہ مضمون مرحمت فرمایا ایک وقت تھا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین سے " برہان " کا کوئی نمبر مشکل ہی سے خالی جاتا تھا، ایک یہ وقت ہے کہ اُن کے مقالات کی دید کے لئے آنکھیں ترستی ہیں، آج بے اختیار اس عالم بے بدل کی یاد تازہ ہو رہی ہے اور ہم اس تبرک کی اشاعت کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

" برہان "

" ہندوستان، خراسان ماوراء النہر یعنی ترکستانی علاقوں کے سوا تاتاری ممالک کے وہ حصے جہاں اسلام پایا جاتا ہے، اسی طرح عراق جزیرہ عرب، شام، قسطنطنیہ اور ان کے آس پاس مسلمانوں کی آبادیوں میں اس شخص کا طریقہ پہنچا زبانوں پر اس طریقہ کی مدح وستائش اور دلوں کو اس کی عظمت و عزت کے اثر سے لب ریز پائے گے لوگ اس طریقہ کی طرف منسوب ہونے کو سرمایۂ افتخار بنائے ہوئے ہیں اور اپنے لئے اس انتساب کو موجب برکت و سعادت خیال کرتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ افریقہ کے دور دست علاقے مثلاً) مغرب اقصےٰ، فاس مراکش تک اس طریقہ کی شہرت ہی نہیں پھیلی ہوئی ہے، بلکہ عملاً افریقہ کی ان اسلامی آبادیوں میں بھی یہ طریقہ داخل ہو چکا ہے " الیانع الجنی صہ ۹۲

یہ عربی زبان کی مشہور و متداول کتاب الیانع الجنی[۱] کی عبارت کا لفظی ترجمہ ہے

---

[۱] فصیح و بلیغ بلکہ گونہ مسجع و مقفی عربی میں یہ کتاب بہار ہی کے عالم مولانا محسن الترحتی نے مدینہ منورہ (بقیہ حاشیہ برصفو آئندہ)

سرزمین ہند میں مہاتما بدھ کے بعد جہاں تک میرا خیال ہے، یہ دوسری شخصیت ہے جس کے دینی اور روحانی کارناموں کا چرچا ہندوستان کے حدود کو پھاند کر بیرون ہند کے ان علاقوں تک پھیل گیا، جن کا ذکر مذکورہ بالا تاریخی وثیقہ میں کیا گیا ہے۔

یہ اکبری وجہانگیری عہد کے مشہور روحانی پیشوا سیدنا شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات تھی حضرت مجدد ہندوستان (سرہند) میں پیدا ہوئے ایک دن کے لئے بھی ہندوستان سے باہر جانے کا موقعہ آپ کو نہیں ملا۔

ایک ہزار سال کے بعد دین اسلامی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق آپ کے تجدیدی اور انقلابی کارنامے جن سے دنیائے اسلام متاثر ہوئی، سب ہندوستان ہی میں انجام دئے گئے، یہ ایک طویل داستان ہے اور اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک اہم اور غیر معمولی حصہ ہے۔

جس تحقیق و توجہ کا قدرتی استحقاق ہماری تاریخ کے اس حصہ کو حاصل ہے گو اس کا یہ حق اب تک ادا نہیں ہوا ہے۔ پچھلے چند دنوں سے کام کرنے والوں کے سامنے کچھ چیزیں آئی بھی ہیں تو وہ بھی حد سے زیادہ تشنہ، ناقص اور ادھوری شکلوں میں، جیسے جیسے دن گذرتے جائیں گے ہندوستان میں اسلام کی تجدید پر یہ کام جس طریقہ سے انجام پایا ہے، لوگوں کے سامنے خود وہ اور اس کی اہمیت واضح ہوتی چلی جائے گی کچھ نہیں تو مضمون کی پیشانی پر جس تاریخی شہادت کو میں نے درج کیا ہے اس کو پڑھ کر پڑھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام کی تجدید کا یہ مذہبی قالب کہاں کہاں پہنچا، اور کن کن

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں لکھی اور ہندوستان سے شائع ہوئی، کتاب میں ضمناً جن معلومات کا تذکرہ کیا گیا ہے، حد سے زیادہ قیمتی ہیں۔ مولانا محسن مرحوم کے پاس عربی مخطوطات کا بہترین کتب خانہ خضر چک (ضلع مونگیر) متصل بارہ میں اس وقت تک موجود ہے، گو بہت سی کتابیں ضائع ہو چکی ہیں لیکن کافی ذخیرہ اب بھی موجود ہے کاش (خضر چک) کا وقف ان کتابوں کی نگرانی کا حق ادا کرے ۱۲

علاقوں کے مسلمانوں کی دینی زندگی اس سے متاثر ہوئی ۔

اس وقت تک اسلام کا زیادہ تر اپنا وطن ایشیا، اور افریقہ ہی میں ہے، آگے کیا ہوگا یہ تو خدا جانے لیکن واقعہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خصوصی وطن (ایشیا، اور افریقہ) میں آپ دیکھ رہے ہیں، کوئی قابل ذکر مقام یقیناً ایسا باقی نہیں رہا ہے جہاں اسلام کے اس ہندی قالب یعنی طریقہ مجددیہ کی تاثیری و تسخیری وسعتوں کا ذکر مذکورہ بالا شہادت میں نہ پایا جاتا ہو ۔ اور جاننے والے جانتے ہیں کہ مورخ کی اس شہادت میں قطعاً مبالغہ یا غلو سے کام نہیں لیا گیا ہے مواصلات و رسل و رسائل میں آج تو دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے لیکن طریقہ مجددیہ ایشیا و افریقہ کے ان علاقوں میں جب روشناس ہوا تو کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک جہاتما بدھ کے زمانے میں ان کا جو حال تھا اس میں مشکل ہی سے ترمیم و ترقی ہوئی تھی، وہی سواریاں تھیں، راستوں کا حال بھی وہی تھا، پھر جیسے تاریخ کے اس واقعہ کو ہم حیرت کے ساتھ سنتے ہیں کہ بدھ کا پیغام ہندوستان سے نکل کر ایک طرف چین و جاپان اور دوسری طرف ترکستان و ایران، شام و مصر تک پہنچ گیا تھا ۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اسلام کی تجدید و صیقل گری کا جو انقلابی کارنامہ ہندوستان کے لئے مقدر تھا، وہی ہندوستان سے باہر نکل کر وسط ایشیا، عرب، مصر، شام، ٹرکی سے گذرتے ہوئے مغربی افریقہ کے حدود تک پہنچنے میں کیسے کامیاب ہوگیا، چاہیئے کہ ہندوستان کی تاریخ کی یہ عجیب و غریب کامیابی بھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے ۔

اس کی تحقیق کی جائے کہ بیرون ہند کے ان دور دست علاقوں تک طریقہ مجددیہ کیسے پہنچا، پتہ چلایا جائے کہ آخر کیا صورتیں پیش آئیں، جن کی بدولت اس زمانہ میں جب مواصلات کی ...... موجودہ آسانیوں سے دنیا محروم تھی اسلام کی تجدید کا یہ پیغام ہندوستان سے ان ممالک تک پہنچا ہی نہیں بلکہ غیر معمولی حسن قبول اس کو کیسے حاصل ہوا جہاں آج بھی ہندوستان کی باتوں کا پہنچنا یا پہنچانا آسان نہیں ہے ۔

ہندوستان کی تاریخ کا عموماً اور اسلامی ہند کی تاریخ کا خصوصاً یہ ایک بڑا اہم سوال ہے جس کے تفصیلی جواب کے لئے تو غالباً دفتروں کی ضرورت ہوگی، سر دست اس سوال کے جواب کی صرف ایک کڑی کا میں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ جس کا تعلق ہمارے وطن کی خاک پاک بہار سے ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں ہندوستان کے اطراف و اکناف، بلکہ تقریباً ہر صوبہ میں آپ کے خلفاء اور مریدوں کی کافی تعداد پھیل چکی تھی، اسی زمانہ میں مجدد صاحب کے تعلقات بیرون ہند کے بعض علاقوں مثلاً کابل بدخشاں، بخارا، کاشغر وغیرہ کے لوگوں سے قائم ہو چکے تھے[1] آپ کی وفات کے بعد بھی کچھ ایسے اسباب پیدا ہوتے رہے کہ آہستہ آہستہ ہندوستان کے باہر کے مسلمانوں کی توجہ بھی آپ کی طرف اور آپ کے تجدیدی کارناموں کی طرف کسی نہ کسی شکل میں منعطف ہوتی رہی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خداداد حسن قبول کی نعمت سے آپ سرفراز تھے۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ تحریری اور کتابی شکل میں بجز چند مختصر رسالوں کے حضرت مجددؒ کی یادگار صرف آپ کے مکتوبات اور خطوط کا وہ مجموعہ ہے، جو تین جلدوں میں مرتب ہو کر مشہور اور لوگوں میں متداول ہوا، آپ کے یہ خطوط عموماً فارسی زبان میں ہیں لیکن ان ہی خطوط کا ترجمہ مشرقی روس کے ایک قازانی مسلمان ملا مراد نے عربی زبان میں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان کی معتبر کتابوں میں حضرت مجدد کے اقوال نقل ہونے لگے، خصوصاً مشہور بغدادی عالم علامہ شہاب محمود آلوسی کی مشہور تفسیر جو سلطان عبد الحمید ترکی خلیفہ کے عہد میں روح المعانی کے نام سے نو جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اس تفسیر میں تو مجدد صاحب کے مکتوبات کے حوالہ

---

[1] کابل پر مجدد صاحب کے اثر کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ مرحوم امیر حبیب اللہ خاں والی کابل ہندوستان جب تشریف لاتے تھے تو انگریزی حکومت محض ان کی خاطر سے سرہند جہاں حضرت مجدد کا روضۂ پاک ہے ایک خاص قسم کی ٹرین کے پہنچانے پر مجبور ہوئی جو صرف ایک ہی لائن پر چل کر سرہند پہنچتی تھی بعد کو بھی یہ سلسلہ جاری رہا اب غالباً معمولی دو پٹری والی لائن بچھا دی گئی ہے ۱۲

سے بکثرت اقتباسات پیش کئے گئے ہیں۔

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ منجملہ دوسرے اسباب کے ایک بڑا سبب جس کی وجہ سے سمجھا جاتا ہے، کہ بیرونِ ہند کے اسلامی علاقوں میں طریقہ مجددیہ کا غیر معمولی چرچا پھیلا، وہ یہ ہے کہ شہر زور (علاقہ کردستان) کے ایک بزرگ شیخ خالد کردی اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں شہر زور سے دلّی پہنچے۔ اس زمانہ میں مجددیہ طریقہ کے ایک بزرگ حضرت مولٰنا غلام علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت مرزا مظہر جانجاناں شہید قدس اللہ سرہ کے خلیفہ دلّی میں اس طریقہ کے سب سے بڑے شیخ کی حیثیت سے لوگوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف تھے، کل چار واسطوں سے مولٰنا غلام علی شاہ کا سلسلۂ ارادت وخلافت حضرت مجدد سے مل جاتا ہے، یعنی وہ مرید حضرت مرزا[۱] صاحب شہید کے مرزا صاحب مرید تھے سیّد[۲] نور محمد بداؤنی کے اور ان کو بیعت تھی شیخ سیف الدین[۳] سے، شیخ سیف الدین خلیفہ اور جانشین تھے شیخ محمد معصوم[۴] کے یہی شیخ محمد معصوم حضرت مجدد کے فرزندِ جسمانی اور روحانی تھے۔ شیخ خالد کردی حضرت غلام علی شاہ صاحب سے مرید ہوئے اور دلّی میں (۹) مہینے قیام کر کے شاہ صاحب کی زیرِ نگرانی رہ کر طریقہ مجددیہ کے سلوک کی تکمیل کرنے کے بعد باضابطہ سندِ خلافت کے ساتھ کردستان اپنے وطن واپس ہو گئے، ہندوستان سے واپسی کے بعد لوگوں میں شیخ خالد کردی کی ہر دل عزیزی بڑھتے ہوئے اس نوبت کو پہنچی کہ دیکھنے والوں نے لکھا ہے۔

"گویا سلطنت آں دیار بایشاں تعلق یافت" ص۲۷ ضمیمہ مقامات مظہری

کردستان اس وقت ترکی حکومت کے محروسہ میں داخل تھا۔ چند ہی دنوں میں سارے ترکی مقبوضات عرب، شام، ایشیا کوچک قسطنطنیہ وغیرہ میں شیخ خالد کردی کی شہرت پھیل گئی۔ بیان کیا گیا ہے کہ

"خلفاء ایشاں وخلفاء خلفاء ایشاں ہزارہا کس باشند" ضمیمہ ص۲۷

خلفاء کی تعداد "ہزارہا" تک جس کے پہنچی ہوئی ہو، ظاہر ہے کہ اس کے عام مریدوں اور عقیدت مندوں کا حال کیا ہوگا مولانا شبلی مرحوم نے روم و شام کی سیاحت اپنی جوانی میں کی تھی۔ جب جہاز پر قسطنطنیہ جا رہے تھے۔ تو اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ جہاز ہی میں ان کی ملاقات ایک شامی عالم سے ہو گئی، جو رشتہ میں شیخ خالد کردی سے تعلق رکھتے تھے لیکن قسطنطنیہ پہنچ کر دیکھا کہ بڑے چھوٹے، امراء وزراء عام لوگوں میں ان ہی شامی عالم کو احترام کا ایسا مقام حاصل تھا کہ ان کی وجہ سے خود مولانا شبلی کو اس اجنبی شہر (قسطنطنیہ) میں بڑی آسانیاں میسر آئیں[1]، یہ سارا احترام محض شیخ خالد کردی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کی وجہ سے تھا، اور مولانا شبلی کو ہندی ہونے کی وجہ سے یہ فائدہ پہنچا کہ شامی عالم کے پیر طریقت کے دیس سے ان کا وطنی تعلق تھا، کچھ بھی ہو یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ طریقہ مجددیہ کو ہندوستان سے باہر روشناس کرانے میں شیخ خالد کردی ہی کے وجود باجود کو بہت زیادہ دخل ہے۔

یہاں یہ تاریخی سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیخ خالد کردی تک اس طریقہ کا ذکر اور مولانا غلام علی شاہ جو دلی میں اس طریقہ کے سب سے بڑے مرکزی معلم اور شیخ تھے۔ ان کا علم شیخ خالد کردی کو کس ذریعہ سے ہوا اسی سوال کا میں جواب دینا چاہتا ہوں، مولانا شاہ عبدالغنی مجددی رح جو علماء دیوبند کے بزرگوں کے حدیث میں استاذ ہیں وہی شیخ خالد کردی کے متعلق اطلاع دیتے ہیں کہ اپنے ملک (کردستان) کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے۔

---

[1] شامی عالم کا نام عبدالفتاح بتلاتے ہوئے مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ ان کی اتفاقی معیت میری تمام کامیابیوں کی دیباچہ تھی صـ۲۲ یہ بھی مولانا شبلی ہی کا بیان ہے کہ شیخ خالد سے یہاں کے یعنی قسطنطنیہ کے لوگوں کو اس قدر ارادت ہے کہ ان کا نام نہیں لیتے بلکہ "حضرت" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، شیخ عبدالفتاح شیخ خالد کے بھتیجے تھے، افسوس ہے کہ اس موقعہ پر مولانا شبلی کے قلم سے بعض خلاف واقعی باتیں نکل گئی ہیں۔ مثلاً شیخ خالد کو مولانا نے لکھ دیا ہے کہ دمشق کے رہنے والے تھے۔ حالانکہ وہ شہرزور کردستان کے باشندہ تھے اسی طرح شیخ خالد کو مرزا مظہر جانجاناں کا لکھا ہے کہ مرید تھے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے مرزا صاحب کے خلیفہ حضرت مولانا غلام علی شاہ کے مرید و خلیفہ شیخ خالد محمد کردی تھے ۱۲

"در ہر فن استعدادِ عجیب داشتند"

حتیٰ کہ فارسی اور عربی زبان کی شعر و شاعری میں جو ملکہ شیخ خالد کو حاصل تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"سبقت از فردوسی و فرزدق بردہ بود" ص۲۷

شہر زور میں ان کا مدرسہ تھا، وہیں درس و تدریس کا کام کرتے تھے مگر اسی کے ساتھ

"داعیہ خدا طلبی در سر داشتند"

اب یہیں سے حضرت مولانا عبد الغنی مجددی کی بات سننے کی ہے، فرماتے ہیں کہ جس زمانہ میں شیخ خالد پڑھنے پڑھانے کے مشغلوں میں منہمک تھے کہ

"اتفاقاً مردے مرزا رحیم اللہ بیگ کہ جہاں گشتہ بود بر ایشاں شد"

یعنی شیخ خالد کردی کے وطن شہر زور میں مرزا رحیم اللہ بیگ کا گذر ہوا، جو جہاں گشتہ آدمی تھے۔ شیخ خالد اور مرزا رحیم اللہ بیگ میں ملاقات ہوئی، باتوں باتوں میں لکھا ہے کہ شیخ خالد کردی نے ایک دفعہ

"شکایت از عدم وجدانِ مرشد نمود"

یعنی اللہ کی راہ بتانے والا آدمی اس زمانہ میں میسر نہیں آتا، اس کی شکایت مرزا رحیم اللہ بیگ سے شیخ خالد کردی نے کی جس کے جواب میں مرزا رحیم اللہ بیگ نے اپنے دہلوی پیر و مرشد حضرت مولانا غلام علی شاہ مجددی کا تذکرہ کیا، مولانا عبد الغنی مجددی نے ارقام فرمایا ہے کہ

"بحسن دلالت مرزا صاحب (یعنی مرزا رحیم اللہ بیگ) بحضرت دہلی (شیخ خالد) رسیدند" ص۲۷ ضمیمہ مقامات مظہری، مطلب جس کا یہی ہوا کہ طریقۂ مجددیہ کو ہندوستان سے باہر روشناس تو حضرت شیخ خالد کردی نے کرایا، لیکن شیخ خالد کردی تک اس طریقہ کا ذکر مرزا رحیم اللہ بیگ کے ذریعہ پہنچا، دوسرے لفظوں میں منطقی نتیجہ اس کا اگر یہ نکالا جائے کہ طریقۂ مجددیہ کا ہندوستان سے باہر جو کچھ بھی چرچا پھیلا۔ لوگوں میں حُسنِ قبول

اس طریقہ کو حاصل ہوا۔ اس کا ایک بڑا ذریعہ مرزا رحیم اللہ بیگ ہی کا وجود تھا، تو اس کے انکار کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

اب یہی مولانا عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ اپنی اسی کتاب میں مرزا رحیم اللہ بیگ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مرزا رحیم اللہ بیگ مسمی بہ محمد درویش عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ ترک علاقہ روزگار نمودہ بحضرت ایشاں شتافتند، کسب نسبت نمودند، و با جازت و خلافت مشرف شدند ص۳۵ ضمیمہ مقامات مظہری

مرزا رحیم اللہ بیگ جو لوگوں میں محمد درویش عظیم آبادی کے نام سے مشہور تھے۔ ہر قسم کے روزگار سے بے تعلق ہو کر آپ کی (یعنی شاہ غلام علی کی خدمت میں) حاضر ہوئے اور (مجددیہ طریقہ) کی نسبت حاصل کی، اجازت اور خلافت کی نعمت سے بھی سرفراز ہوئے۔

یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ مضمون کی پیشانی پر جس تاریخی وثیقہ کو میں نے نقل کیا ہے، جس کو پڑھنے کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ مہاتما بدھ کے بعد شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی دوسرے بزرگ ہیں، جن کو اور جن کے تجدیدی کارناموں کو ہاتھوں ہاتھ ہندوستان سے باہر دور دست علاقوں میں لیا گیا۔ بجائے خود اس واقعہ کی تفصیل جو کچھ بھی ہو۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ کے اس حصہ پر کام کرنے والے جب کام کریں گے تو ان کو نظر آئے گا، کہ جیسے بدھ اور بدھ کی تعلیمات سے بہار کی سرزمین کا خصوصی تعلق ہے اسی طرح طریقہ مجددیہ کو عالمگیر بنانے میں بھی بہار ہی کے خاک کو ماننا جائے گا۔ کہ بہت بڑا دخل ہے۔

افسوس ہے کہ مرزا رحیم اللہ بیگ کے متعلق بجز اس بات کے کہ وہ "عظیم آبادی" تھے۔ باوجود تلاش و تحقیق کے اب تک پتہ نہ چل سکا کہ براہِ راست ان کا گھر عظیم آباد (پٹنہ) ہی تھا، یا عظیم آباد کے علاقے کی کسی دوسری آبادی میں وطن تھا، اور دستور کے مطابق لوگ ان کو عظیم آبادی کہنے لگے۔ الغرض مرزا صاحب کا بہار سے کیا تعلق تھا۔ اس کی تفصیل اب

تک تشنۂ تحقیق ہے مگر اتنی بات یقینی ہے کہ تھے وہ بہر حال عظیم آبادی ہی، اس کے سوا مرزا صاحب کے کچھ ذاتی حالات اب تک جو کچھ معلوم ہو سکے ہیں وہ بھی کم عبرت انگیز نہیں ہیں۔ اب اس کی مختصر داستان عرض کرتا ہوں۔

ہر قسم کے روزگار اور معاشی ذرائع سے قطع تعلق کر کے دلی حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں مرزا رحیم اللہ بیگ حاضر ہو گئے تھے اس کا ذکر تو آپ مولانا عبد الغنی مجددی کے حوالہ سے سن چکے، وہی اپنی اس کتاب میں یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ

"از والدین حقوق معافنہ کنانیدند"

یعنی مرزا رحیم اللہ بیگ جو اب محمد درویش عظیم آبادی کے نام سے مشہور تھے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ غلام علی صاحب سے اجازت و خلافت حاصل کرنے کے بعد بہار اپنے وطن واپس ہوئے والدین اس وقت تک مرزا صاحب کے زندہ تھے۔ ان کی خدمت کے جو حقوق تھے ماں باپ سے عرض کیا کہ ان کو معاف کر دیں۔ اور اللہ کی راہ میں کام کرنے کی اجازت عطا فرمائیں کیوں کہ معافی حقوق کے بعد شاہ عبد الغنی صاحب نے لکھا ہے کہ

"در امر معروف و نہی عن المنکر خوفے نداشتند" ص۳۵

سیدھے سادے لفظوں میں جس کا مطلب یہی ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی مطالبات کی تعمیل پر آمادہ کرنے میں خوف اور خطرے کے خیال کو مرزا رحیم اللہ بیگ نے اپنے سامنے سے ہٹا دیا تھا، اور اسی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس مہم کے لئے وہ اٹھے تھے اپنے والدین سے حقوق جس خدمت کے ذوق میں مرزا صاحب نے معاف کرائے تھے، یہ مہم اور خدمت کچھ اس نوعیت کی تھی جس میں خوف اور خطرہ کے پیش آنے کا اندیشہ کیا جا سکتا تھا۔ مولانا عبد الغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کی اس اجمالی خبر کو ان معلومات کی روشنی میں جو اب آپ کے سامنے رکھے جاتے ہیں، سوچیے

(۱) بالاتفاق مرزا رحیم اللہ بیگ کے تمام تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ ۱۲۶۴ھ ۱۸۴۷ء میں ہزارت کے علاقہ ستہ وارہ میں وہ شہید کر دئے گئے۔

(۲) یہ وہ زمانہ ہے جب مشرق پر یورپ والوں کی یورش اپنے عروج کے آخری نقطہ تک گویا پہنچ چکی تھی، ہندوستان پر برطانیہ کا تسلط عملاً ہو چکا تھا، اسی تسلط کے مقابلہ میں مرزا صاحب کی شہادت کے کل دس سال بعد ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی شورش ہوئی اور وسط ایشیا کی اسلامی ریاستوں کو پامال کرتے ہوئے روس دوسری طرف اپنے پنجے کو ان ممالک میں مضبوط کر چکا تھا، بخارا، خیوہ وغیرہ کے امیروں کو روس اپنے زیر اقتدار لا چکا تھا۔ کابل کی طرف للچائی ہوئی نظریں ڈالتے ہوئے ہرات کے علاقہ میں سازش کا جال روسی حکومت بچھا چکی تھی، جس سے انگریز ہندوستان میں خطرہ محسوس کرتے تھے۔

(۳) مرزا رحیم اللہ بیگ محمد درویش عظیم آبادی کے پیر و مرشد اور شیخ طریقہ حضرت مولانا غلام علی شاہ مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے اندرونی رجحانات کا پتہ ان کے اس تاریخی مکتوب سے چلتا ہے جو فتاویٰ عزیزیہ کے مجموعہ میں اس وقت تک شریک ہے اور مطبوعہ شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس خط کا قصہ یہ ہے کہ کلکتہ کو اپنا پایۂ تخت بنانے کے بعد ہندوستان پر اپنے اقتدار کو مستحکم و مضبوط کرنے کے لئے انگریز جہاں بیسیوں الٹی سیدھی تدبیریں کر رہے تھے۔ ان میں ایک تدبیر یہ بھی سوچی گئی کہ مسلمانوں کو مانوس بنانے کے لئے کلکتہ میں "مفتی اعظم" کا ایک امتیازی عہدہ قایم کیا جائے۔ حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے اور دلی میں ان کے جانشین برحق تھے۔ اس زمانہ میں ہندی مسلمانوں کے ماویٰ و ملجا وہی بنے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی عمومیت پر شاہ عبد العزیز کا جتنا اثر تھا۔ اس میں کوئی دوسرا مولوی اقطار ہند میں ان کا مدمقابل نہ تھا دہلی میں شاہ عبد العزیز کا مدرسہ بھی تھا، اور اس کے سوا بھی سارے دینی کاروبار کا مرکز ان کا آستانہ بنا ہوا تھا۔ کلکتہ میں انگریزوں کے کوئی بڑے مسلمان عہدہ دار مولوی رعایت علی نامی تھے جو اس زمانہ میں "مختار کار فرنگی" سمجھے جاتے تھے، انگریزی حکومت کے اشارہ سے مولوی رعایت علی صاحب باضابطہ سرکاری مراسلے شاہ عبد العزیز کی خدمت میں اس

.... مضمون کے مسلسل روانہ کر رہے تھے کہ کسی اچھے مستعد دین دار عالم کو جو رشوت نہ لے، کلکتہ روانہ فرمائیے۔ تاکہ ان کو "مفتی اعظم" کے عہدہ پر بحال کر کے تمام مقدمات میں ان ہی سے مشورہ لے کر فیصلہ کروں، شاہ صاحب نے پہلے تو جواب میں حیلوں حوالوں سے کام لیا، خود ہی لکھا ہے کہ میں نے مولوی رعایت علی کو لکھا کہ بھائی! تم فرنگیوں کے ملازم ہو۔ ہم جس مولوی کو بھیجیں گے۔ ممکن ہے کہ اس سے تم انگریزوں کی مرضی کے مطابق فتوے لو، اس بے چارے کا دین غارت ہو جائے گا۔ اور تم اس سلسلہ میں کچھ کر بھی نہیں سکتے کہ نوکر ہو، نوکر تو اپنے آقا کے آگے بے دست و پا ہوتا ہے، اس کے جواب میں مولوی رعایت علی نے لکھا کہ مفتی صاحب جو یہاں مقرر ہوں گے۔ ان کو تو انگریزوں کی صورت دیکھنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ اور مذہب کے خلاف ان سے قطعاً فتویٰ نہ لیا جائے گا۔ ان کو قطعی آزادی حاصل ہوگی کہ اپنے علم کے مطابق مجھے مشورہ دیں۔ اس کا اطمینان بھی مولوی رعایت علی نے شاہ عبدالعزیز صاحب کو دلایا کہ کلکتہ میں ان کو انگریزوں کے علاقہ سے کسی دور جگہ پر مستقل مکان رہنے کے لئے دیا جائے گا۔ اور اپنے اسی مکان میں بیٹھ کر

"آنچہ موافق شرع محمدی باشد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بے دغدغہ و بے وسواس حکم نمائید"

(فتاویٰ عزیزیہ ص۹۱)

بار بار کلکتہ سے دلّی شاہ صاحب کی خدمت میں مولوی رعایت علی کے مراسلے اسی مضمون کے جب پہنچے تو اپنے مدرسہ کے ایک مستعد عالم کو جن کا نام مولوی عبدالحیّ تھا کلکتہ جانے کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی کہ

"مولوی عبدالحیٰ صاحب ازیں جا روند اگر مفاسد مظنونہ موہومہ نباشد فبہا، والا برخاستہ بیایند" ص۹۲

یعنی کلکتہ پہنچ کر تجربہ کریں انگریزوں کے دباؤ کی وجہ سے جن باتوں کا خطرہ ہے اگر یہ خطرہ پیش نہ آئے تو خیر ورنہ فوراً واپس ہو جائیں۔

بہر حال یہ خبر کہ شاہ عبدالعزیز نے فرنگیوں کی نوکری کی اجازت مولوی عبدالحئی کو دے دی ہے، آگ کی طرح دلی میں پھیل گئی، شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ مرزا رحیم اللہ بیگ کے پیر و مرشد کو شاہ عبدالعزیز کی اس اجازت کی جب خبر ملی تو آپے سے باہر ہو گئے، حالانکہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا غیر معمولی احترام کرتے تھے ان کے علم پر بھی اور دین پر بھی بھروسہ فرماتے تھے۔ جب ضرورت پیش آتی، شاہ صاحب سے ہی فتوی پوچھتے، لیکن اس خبر نے ان کو بے تاب کر دیا، اسی وقت قلم اٹھا کر ایک خط شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں رقام فرمایا ان کے اسی مکتوب گرامی کا ذکر کرنا میرا مقصود ہے جس سے ان کے باطنی احساسات اور اندرونی رجحانات کا پتہ چلتا ہے خط فارسی زبان میں ہے ترجمہ کے ساتھ اسے درج کرتا ہوں اصل مکتوب فارسی مولنا غلام علی شاہ مجددی

حضرت سلامت سلمکم اللہ تعالی علی رؤس الفقراء	حضرت سلامت اللہ آپ کو ان فقیروں کے سر
باختیار الفقر علی الغنا بعد تسلیمات کثیرہ	پر صحیح و سلامتی کے ساتھ رکھے جو فقیری کو امیری
معروض می دارد کہ دریں وقت شخصے	کے مقابلہ میں اختیار کر چکے ہیں بعد تسلیمات کثیرہ
ظاہر نمود کہ در مدرسہ ما فقیران مذکور	یہ عرض ہے کہ ابھی ایک شخص نے آکر یہ بیان
"نوکری کفار فرنگ" و قبول خدمت	کیا کہ "کفار فرنگ" کی نوکری کا ذکر ہم فقیروں
افتا می شود خدا آگاہ ست کہ فقرا	کے مدرسہ میں ہے اور افتا یعنی مفتی ہونے کی نوکری
شرف علم و علم را شرف بنی آدم گردانیدہ	قبول کر لی گئی ہے، خدا جس نے علم کو برتری اور
ازیں خبر ایں فقیر "بسیار تاسف نمود"	بنی آدم کی بزرگی و شرافت کا ذریعہ اس کو بنایا ہے
خاک نشینی فقرا بہ از صدر نشینی اغنیاء	وہی واقف ہے کہ اس خبر سے اس فقیر کو کتنا
ہرگز مولوی عبدالحئی صاحب قصد	غم و رافسوس ہو رہا ہے، فقیروں کی خاک
ایں امر نامبارک نکنند، بناں پارہ	نشینی امیروں کی صدر نشینی سے کہیں بہتر ہے
قناعت ساختہ للہ فی اللہ درس	ہرگز مولوی عبدالحئی صاحب اس (منحوس)

طالبانِ علم فرمایند و اوقات بذکر
و مراقبہ معمور دارند دریں جا ہرگز
ہرگز متعلق بعلاقہ نشوند بہ ترک و
تجرید در سازیم و ہر نفس را نفس
آخریں انگاریم برائے خدا باشیم بطور
بزرگانِ خود سلف صالح خود،
زیادہ امیدوار عفو گستاخی ست
و لشنیدن خبر نیک آنجا دل خوش
می شود و بانچہ لایق شانِ درویشی
نیست مشوش، معذور خواہند
داشت زیادہ چہ -

(فتاوی عزیزیہ صـ۹۱)

نامبارک کام کا ارادہ نہ کریں، اپنے آپ کو
روٹی کے ٹکڑے پر چاہیئے کہ قانع بنالیں، اللہ
کے واسطے اللہ ہی کی راہ میں طالب العلموں کو
پڑھاتے رہیں اور اپنی زندگی کے اوقات کو اللہ
کے ذکر و مراقبہ میں مشغول رکھیں اور اس جگہ میں
ہرگز ہرگز تعلق پیدا نہ کریں چاہیئے کہ ہم لوگ (دنیا)
کو چھوڑ کر اس سے علیحدگی پر دل کو راضی کرلیں
اور اپنی ہر سانس کو تصور کریں کہ دنیا کی آخری
سانس ہے، بس اللہ ہی کے لئے ہم لوگ بن
جائیں اپنے بزرگوں، اور سلف صالح کے طریقہ
پر۔ آگے اور کیا لکھا جائے، بجز اس کے اپنی
اس گستاخی کی معافی کا امیدوار رہوں! اس
جگہ (یعنی شاہ عبدالعزیز کے مدرسے سے) جب
اچھی خبر آتی ہے تو دل خوش ہوجاتا ہے، اور
ایسی بات جو درویشی کے مناسب نہیں ہے
جب اس کی خبر ملتی ہے تو دل پریشان ہوجاتا
ہے مجھے معذور خیال فرمایا جائے گا۔ اس سے
زیادہ اور کیا عرض کیا جائے۔

بجائے خود شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نامۂ مبارک اس عہد کی تاریخ کا ایک زریں
صحیفہ ہے جب اپنی حکومت کھو چکنے کے بعد مسلمان فیصلہ کر رہے تھے کہ انھیں اب کیا
کرنا چاہیئے یہ کون جانتا تھا کہ "نوکری کفار فرنگ" کا یہی قصہ آئندہ چل کر اتنی مہیب شکل

اختیار کرلے گا، کہ ملک کے باشندے دو مستقل صفوں میں بٹنے کے بعد جو ایک ملک تھا انجام
کار اس کو دو مستقل ملکوں کے قالب میں ڈھال کر رہیں گے اور کیسے دو ملک کہ شاید دنیا کے
دو ملکوں کے درمیان آنے جانے والوں پر اتنی پابندیاں زمین کے اس خاکی کرے پر کہیں نہیں
پائی جاتیں، جتنی پابندیاں آج اس ایک ملک کے دو تقسیم شدہ حصوں میں پائی جاتی ہیں، خیر
اس قصے کو تو چھوڑیے۔ اسی "نوکری کفار فرنگ" کے عشق کی آگ میں جو ملک کا امن و
امان جل کر بھسم ہوا مالی اور جانی نقصانوں کا طوفان ہی ابل پڑا ہے، اور کون جانتا ہے کہ
شاہ غلام علی نے جس چیز کو "امر نامبارک" قرار دیا تھا اس کی نحوست کہاں تک پھیلتی ہے
اللہ ہی اپنے بندوں پر رحم فرمانے والا ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ بیسویں صدی میں سوچا گیا
تھا، اور ترک موالات یا نان کوآپریشن کے جس حربہ کو لے کر ہندوستان بالآخر کھڑا ہو گیا۔ اسی
ہندوستان میں ٹھیک اسی ہتھیار کو لے کر کھڑے ہونے والے انیسویں صدی ہی میں کھڑے
ہو چکے تھے۔ ان بے چاروں کا مضحکہ اڑایا گیا، یہ ہمارے شاہ غلام علی صاحب جو "نان
کوآپریشن" کے اس زمانہ میں سب سے بڑے علم بردار تھے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ اپنے
یہاں آنے جانے والوں کو ابھارتے ہوئے کبھی کبھی فرمایا کرتے

لنگگے زیر و لنگگے بالا نے غم دزد نے غم کالا
گزک بوریا و پوستکے دلقے پر ز درد دوستکے

یہی زندگی اس زمانہ میں اختیار کر لینا چاہیے۔ گویا "نوکری کفار فرنگ" سے بے نیازی،
اور نان کوآپریشن کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے شاہ صاحب کا مشورہ تھا کہ اسی لنگگے
زیر و لنگگے بالا والے لباس کو اختیار کر لیا جائے (دیکھو خزینۃ الاصفیاء ص ۶۹۷) شاہ غلام علی
رحمۃ اللہ علیہ کی وفات دلی ہی میں ۱۸۵۷ء کی کش مکش سے ۳۳ سال پہلے یعنی ۱۸۲۴ء مطابق ۱۲۴۰ھ
میں ہوئی، سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر بیسویں صدی میں جو تماشا پیش ہوا، اور آج
اسی قدرتی تماشے کا نتیجہ ہمارے سامنے ہی کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی ہی میں اس

کا خواب دیکھنے والوں کو دکھایا جا چکا تھا، گویا خواب انیسویں میں دیکھا گیا اور تعبیر بیسویں صدی میں پوری ہوئی، بہرحال اس وقت حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کے باطنی رجحانات کے جس پہلو کو میں پیش کرنا چاہتا تھا اس کے لئے مذکورہ بالا مکتوب گرامی کافی ہو سکتا ہے وہ اپنے وقت کے بڑے آدمی تھے۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ ہندوستان ہی نہیں ہندوستان سے باہر کے رہنے والے بھی دور دور سے ان کی خدمت میں آ آکر مستفید ہوتے تھے شیخ خالد کردی بیرونِ ہند سے آنے والوں میں تنہا نہیں تھے۔ ان کے سوا بھی آخوند شیر محمد ملا گل محمد غزنوی، مولوی ہراتی سید عبداللہ مغربی مولوی عبدالکریم ترکستانی وغیرہم آپ کے مشہور خلفار تھے جو دلی سے کسب کمال کے بعد واپس ہوئے۔ آپ کے ایک مشہور خلیفہ مولانا محمد جان نامی مکہ معظمہ میں مقیم تھے اور شیخ حرم کے نام سے مشہور تھے۔ اسی کے ساتھ آپ کا دربار مسلم وغیر مسلم معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوا تھا، ضمیمہ مقامات مظہری میں ایک دلچسپ لطیفہ برہمن زادہ کا نقل کیا ہے، جو کافی جمیل و شکیل تھا خدمت والا میں حاضر ہوا اس کی شکل و صورت دیکھ کر حضرت والا کو رحم آگیا لکھا ہے کہ ایک خاص نظر سے اس کی طرف دیکھا، اسی وقت "از زیور کلمہ شہادت بیارا ست وحسن را از نورِ اسلام جلا داد" ص۱۲

کچھ بھی ہو، مرزا رحیم اللہ بیگ محمد درویش عظیم آبادی پر رنگ اپنے پیر کا اتنی شدت سے چڑھا ہوا تھا کہ دنیا بھر میں پھرنے پھرانے کے بعد بھی کہتے تھے کہ "مثل شاہ غلام علی شیخ نیافتم" ص۳۵ ضمیمہ مرزا صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ اپنے والدین سے عقوق معاف کرانے کے بعد دلی واپس ہوئے گلیم سیاہ پوشید، یعنی "ایک کالا کمبل اوڑھ لیا" یہی ایک سامانِ سفر تھا، لیکن اس کمبل کے نیچے جو کچھ تھا۔ خزینۃ الاصفیار کے اس فقرے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے

"در علومِ ظاہری و باطنی طاق و یگانۂ آفاق بود" ص۰۶

اندر علومِ ظاہری و باطنی کے اس سرمایہ کو لئے ہوئے اوپر سے کالے کمبل کو ڈالے ہوئے لکھا ہے کہ دلی سے روانہ ہوئے اور

"اکثر بلاد اسلام مثل روم و شام و حجاز و عراق و مغرب و ماوراء النہر و خراسان و ہندوستان سیر نمود مذ(صـ۳۵ ضمیمہ)

خزینۃ الاصفیار میں ہے کہ "تمام ہندوستان را نیز زیر قدم آورد"، صـ۲۰۶ حاصل جس کا یہی ہوا کہ ہندوستان کے ایک ایک صوبا ور علاقہ میں بھی گھومتے رہے اور ہندوستان کے بعد ایشیار و افریقہ کے اسلامی ممالک کی سیر میں بھی محمد درویش عظیم آبادی مشغول رہے ٹھیک اس زمانہ میں جب برطانیہ اور روس کے دو پاٹوں کے درمیان اسلامی ممالک پسے جارہے تھے شاہ غلام علی کے خلیفہ محمد درویش عظیم آبادی کا ان ہی ملکوں میں گھومنا اور صرف گھومتے پھرنا نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ممالک کے ان حکمرانوں سے جو حد سے زیادہ بے لبسی کی زندگی گذار رہے تھے ان سے اسی عظیم آبادی درویش کا عموماً تعلق قایم ہوجاتا تھا۔ مولٰنا شاہ عبدالغنی مجددی نے لکھا ہے کہ ہرات کا اس زمانہ میں جو والی تھا، اور نام اس کا کامراں تھا آپ کے مخلصوں میں شریک ہوگیا تھا اسی طرح خوقند خوا جب پہنچے تو وہاں کا حکمراں بھی آپ کا عقیدت مند بن گیا یہی نہیں شاہ عبدالغنی نے آگے لکھا ہے کہ

"ہم چنیں دیگر ولاۃ ترکستان غاشیہ بر دوش ایشاں شدند" صـ۳۵

اسی سلسلہ میں بالآخر وہ شہر سبز[1] پہنچے، شہر سبز ہرات کے علاقہ کا مشہور زرخیز حصہ کا مرکزی شہر تھا، لکھا ہے کہ وہاں کے حکمراں سے بھی اس عظیم آبادی کمل پوش فقیر کا ایسا قوی ربط قایم ہوگیا کہ اس نے اپنے علاقہ میں قیام پر آپ کو مجبور کیا اور یہ کہ

"دیہہ کلاں نذر نمود"

کوئی بڑا گاؤں اسی سیر حاصل خطہ میں جو کشت زاروں اور باغوں، نہروں سے بھرا ہوا تھا

---

[1] ہرات مشہور شہر ہے بجانب جنوب ترنخ جانے والی سڑک پر یہ شہر واقع ہے پہلے اس کو اسفزار کہا کرتے تھے، بعد کو اسی کا نام سبزہ وار ہو گیا، اسی نام کا ایک شہر نیشاپور کے پاس بھی تھا، اس لئے اس کو سبزہ وار ہرات کہتے تھے۔ لیکن آج کل اب صرف شہر سبز کے نام سے موسوم ہے ہر زمانہ میں یہ علاقہ سیر حاصل زمینوں اور باغوں کے لئے مشہور تھا باغوں میں انگور انار کی کثرت ہے ایک دریا ہر دو سیستان اس علاقہ میں بہتا ہے جس کے سرچشمے شہر سبز ہی کے قریب ہیں (دیکھو جغرافیہ خلافت مشرقی مصنفہ جی لی اسٹرانج کا ترجمہ صـ۴۳۲)

ان کو بطور جاگیر ہی کے نہیں دیا گیا بلکہ آگے مولانا شاہ عبد الغنی کے جو یہ الفاظ ہیں کہ

"تعین حکومت خود ازاں دیہ برداشت"

اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مرزا رحیم اللہ بیگ کو اس "دیہ کلاں" کی حکمرانی سپرد کر دی گئی تھی، مرزا صاحب نے اسی میں جیسا کہ خزینۃ الاصفیار میں ہے

شیخ درآنجا خانقاہے بنا کرد، وخدمت مسافرین ومساکین بذمہ خود گرفت ولنگر کلاں انداخت وطعام بکثرت می پخت وبصادر و وارد تقسیم نمود صـ۷۰۶	شیخ یعنی مرزا رحیم اللہ بیگ نے ایک خانقاہ تعمیر کی اور مسافروں مسکینوں کی خدمت کرنے لگے، بہت بڑا لنگر خانہ جاری کیا، بڑی مقدار میں کھانے پکواتے اور آنے جانے والوں میں اس کھانے کو تقسیم کیا کرتے تھے۔

مولانا عبد الغنی مجددی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ شہر سبز کے اسی علاقہ میں قیام کرنے کے بعد، نکاح بھی اس ملک کی کسی خاتون سے اسی عظیم آبادی درویش نے کر لیا تھا (صـ۳۵)

خزینۃ الاصفیار، کے مصنف نے اسی سلسلہ میں یہ خبر بھی دی ہے، کہ

"اکثر بلادِ ترکستان سیر کرد، وفرماں فرمایاں ہر ایک مقام باخلاص پیش می آمدند" صـ۷۰۶

لیکن اسی کے ساتھ ان ہی لوگوں کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ شہر سبز کے حکمراں کے سوا مرزا صاحب مرحوم کی کسی امیر اور والی ملک سے بنی نہیں، کیوں نہیں بنتی تھی؟ اس کی وجہ وہی تھی کہ ممن مسلمان امیروں کو اسلامی مطالبات کی تعمیل کی طرف توجہ دلاتے تھے۔ مولانا عبد الغنی مجددی نے اسی وجہ کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ

"از ہر جا رنجیدہ شدہ برمی آمدند"

تو تنہا یعنی خیوہ کے فرماں روا سے بھی رنجیدہ ہو کر خیوہ کو انھوں نے چھوڑ دیا تھا۔ صرف یہی شہر سبز کا والی ایسا آدمی تھا، جو اول سے آخر تک ان کا ہم نوا رہا۔ خزینۃ الاصفیار میں ہے کہ مرزا صاحب نے شہر سبز کے اس دیہ کلاں میں جب قیام اختیار کر لیا تو شہر سبز کے والی کے جو دشمن تھے وہ

"بہ سبب دعاء و امداد حضرت مرزا صاحب بر دو دست نبی یافتند" ص۲۱

جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ ترکستان جن سیاسی حالات سے اس زمانہ میں گذر رہا تھا۔ اُسی سلسلہ میں کچھ ایسی صورتیں پیش آگئی تھیں کہ شہر سبز کے والی کے لوگ مخالف ہو گئے تھے۔ اور مرزا صاحب دعاء ہی سے نہیں بلکہ دعاء کے سوا دوسرے طریقوں سے بھی اس کی امداد کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ لکھنے والوں نے حد سے زیادہ اجمالی اشاروں سے کام لیا ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ شہر سبز کے والی اور ترکستان کے دوسرے حکمرانوں میں اختلافات کی نوبت کیا تھی؟۔

انیسویں صدی کے وسط میں روسی حکومت ترکستان میں جو کچھ کر رہی تھی اس کی تفصیلات سے جو واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ آخری مقام جہاں سے امیر کابل کے مقبوضات میں زمین تیار کرنے کی کوشش روسی حکومت کر رہی تھی۔ بظاہر ہندوستان ہی کی طرف اس کا رخ تھا، یہ مقام ہرات ہی کے آس پاس کے خطے تھے[1] یقینی طور پر تو کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن ذہن سوچنے والوں کا اگر اُدھر منتقل ہو کہ شہر سبز کے والی اور محمد درویش عظیم آبادی یعنی مرزا رحیم اللہ بیگ میں رفاقت اور باہمی امداد کی یہ صورت جو پیش آگئی تھی، ممکن ہے کہ اس کا تعلق کچھ اسی روسی برطانوی سازشوں سے ہو، برطانیہ بھی اور روس بھی افغانستان و ترکستان کے اکثر امیروں کو بنگال کا جعفر اور دکن کا صادق بنا چکے تھے، اور کچھ تعجب نہیں کہ مرزا صاحب کے سوانح نگاروں نے جو یہ لکھا ہے کہ

"بعض حکام ترکستان کہ از والی شہر سبز غبار داشتند ایشاں را (یعنی مرزا رحیم بیگ را) باخفار قتل کنانید"

(ص۳۵ ضمیمہ مقامات منظری)

یہ بعض حکام ترکستان، ترکستان کے کوئی جعفر یا صادق ہوں، اور یورپین حکومتوں کے اشارے سے پٹنہ کے اس کمل پوش فقیر کو بحالت غربت و مسافرت وطن سے دور

"شہادت رسانیدند" ص۲۱ (خزینۃ الاصفیاء)

[1] امیر دوست محمد خاں جو روس کے زیر اثر ہو گئے تھے ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے ان کو معزول کر کے شاہ شجاع کو کابل کا امیر بنا دیا تھا۔

کچھ نہیں معلوم کہ شہر سبز کے اس علاقے میں اب بھی اس عظیم آبادی درویش کی کوئی یادگار کم از کم مزار وغیرہ ہی کی صورتوں میں پائی جاتی ہے یا نہیں، بزرگی اور عظمت و احترام کے لحاظ سے دستور کے مطابق چاہیے تو یہی کہ ان کی خانقاہ وغیرہ نہ سہی لیکن مزار مشہور ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہم مرزا رحیم اللہ بیگ کی سوانح عمریوں میں ایک اور چیز بھی جو پاتے ہیں، یعنی شہر سبز کے علاقے میں مقیم ہو جانے کے بعد لکھا ہے کہ

"مذہب شافعی اختیار نمود"

اور یہ کوئی چھپی ڈھکی بات نہ تھی مولانا عبد الغنی مجددی کا بیان ہے کہ

"لہٰذا در بخارا وغیرہ ملقب ایشاں بہ شافعی ہستند" ص ۳۵

خزینۃ الاصفیار میں ہے کہ ان ہی ترکستانی علاقوں میں

"باسم مرزا شافعی اشتہار یافت ص۶"

جیسا کہ معلوم ہے کہ ماوراء النہر اور خراسان کے یہ سارے ممالک جہاں اہل سنت یا سنی مسلمان آباد تھے۔ حنفیت میں ان لوگوں کا غلو حد سے گذرا ہوا تھا۔ ایسی صورت میں اس کٹر حنفی قلمرو میں عظیم آباد کے "یہ مرزا شافعی" اگر بھلا دئے گئے ہوں، تو یہ بھی خلافِ توقع واقعہ شاید نہیں ہو سکتا۔

باقی یہ مسئلہ کہ مرزا صاحب مرحوم جن کے سلسلے کے سارے مشائخ حنفی المذہب تھے بلکہ طریقۂ مجددیہ کے بانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی حنفیت پر جو غیر معمولی اصرار تھا۔ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے آخر ان کے شافعی بن جانے کی ضرورت یا مصلحت کیا تھی؟

کوئی تفصیلی جواب اس سوال کا بھی اب تک کتابوں میں نہیں ملا ہے۔ بظاہر یہی خیال گذرتا ہے کہ دنیا کے عام مذاہب میں یہ حادثہ جو پیش آیا یعنی مذہب کی بنیادی کتابوں سے دور ہوتے ہوئے آخر میں ایسی کتابوں پر ان کا دارمدار رہ گیا۔ جن کی حیثیت بنیادی کتابوں کے

مقابل چنداں قابلِ لحاظ نہ تھی مثلاً ہندوستان ہی میں دیکھئے ویدک دھرم کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے وید ہے، وید سے کچھ علمی نتائج و کلیات نکالے گئے کہ جو اپنشد ا کے نام سے مشہور ہوئے وید سے زیادہ اہمیت اپنشدوں کو حاصل ہو گئی۔ پھر شاستروں کا دور آیا اور اپنشدوں سے بھی توجہ ہٹ گئی، شاستروں کے بعد پرانوں کا دور شروع ہوا اور ان ہی پرانوں میں ویدک دھرم کے ماننے والے مختلف فرقے ڈوب گئے، آخر زمانہ میں تو صورتِ حال یہ ہو گئی، کہ سنسکرت زبان کی دو رزمیہ نظمیں رامائن اور مہا بھارت، یہی لوگوں کا اوڑھنا بچھونا بن گئیں۔ وہ تو خیر یورپ میں سنسکرت زبان، اور ہندوستانی علوم و فنون کے مطالعہ کا ذوق جب سے بیدار ہوا ہے تو ایک "نئی نشاۃ" کا ویدک دھرم میں معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں سے آغاز ہوا ہے اور وید ا اپنشد ا شاستروں کا ذکر اور تھوڑا بہت مطالعہ کا رواج ہندوستان میں شروع ہوا ہے۔ تفصیل کا تو موقعہ نہیں ہے مختصر یہ ہے کہ اسلام میں بھی زیادہ دنوں کے بعد نہیں بلکہ دوسری صدی ہجری کا درمیانی عہد تھا، اس زمانہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جوانی کے زمانہ میں بغداد پہنچ کر دیکھا کہ جامع بغداد میں چالیس درس کے حلقے قائم ہیں جس حلقہ میں بھی پہنچے ان ہی کا بیان ہے کہ استاذوں اور شاگردوں کی زبانوں پر نہ قال اللہ تھا اور نہ قال الرسول یعنی کوئی نہ قرآن ہی کا حوالہ دیتا تھا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث پیش کرتا تھا۔ بلکہ جو بھی تھا صرف اپنے استادوں کے اجتہادی نتائج ہی کا ذکر کر رہا تھا۔ اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ انجام اس طریقہ کار کا آخر میں کیا ہونے والا ہے اس پر امام شافعی کی توجہ مبذول ہوئی اس کے بعد پورے عزم اور پختہ ارادہ کے ساتھ وہ کھڑے ہو گئے فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو جائے میں مسلمانوں کو اپنے دین کے بنیادی سرچشموں (قرآن و حدیث) سے بچھڑنے اور دور ہونے نہ دوں گا، اسی مہم کے سر کرنے میں اپنی ساری عمر امام شافعی نے صرف فرما دی ان کے زمانہ تک قرآن و حدیث سے جو کچھ اجتہادی نتائج نکالے گئے تھے۔ سب ہی کی بے دردی کے ساتھ امام نے تنقید کی اس باب میں اپنے استاذ اعظم

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی بھی پروانہ کی، جس کی داستان طویل ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ قایم کی ہوئی سنت وقفہ وقفہ سے مسلمانوں میں زندہ ہوتی رہی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں جیسے مذہبی کاروبار کرنے والی اور دینی راہوں سے آمدنی پیدا کرنے والی کوئی خاص نسل اس لئے پیدا نہ ہوسکی کہ شروع ہی میں اس کا انسداد کر دیا گیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہی کے متعلق اس کا خطرہ ہو سکتا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر و خیرات دان پن، بھکشا، وغیرہ آمدنیوں کو اپنی اولاد اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے خاندانوں میں پیدا ہونے والوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام کر دیا تھا، اسی طرح مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں مذہبی طبقہ کو "کلیسا" جیسی کوئی چیز پیدا کرنے کا موقعہ اگر نہ ملا تو میرا خیال ہے کہ اس میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے طریقۂ عمل کو دخل ہے، دوسری صدی ہجری ہی سے امام شافعی کے بعد احتجاجی ذہنیت رکھنے والے لوگ وقتاً فوقتاً مسلمانوں میں اُٹھتے رہے اور مذہبی طبقہ سے مطالبہ کرتے رہے کہ مسلمانوں میں جس دین کو تم لوگ پھیلا رہے ہو، اسلام کی بنیادی کتابیں قرآن و حدیث کے تعلیمی معیار پر اس کو جانچ کر دکھاؤ، ایک رواج تھا جس کی بنیاد امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ میں ڈال دی، حسب ضرورت رواج زندہ ہوتا رہا میرا خیال ہے کہ مرزا رحیم اللہ محمد درویش عظیم آبادی ترکستانی علاقوں میں شافعی کے نام سے جو مشہور ہوئے اس میں ان کے اسی احتجاجی اور تنقیدی مطالبات ہی کو دخل معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ کچھ بھی ہو، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ باوجود ان احتیاطوں کے مسلمان بھی مختلف ممالک میں گرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں کہ ہر وہ کتاب جو فقہ کے نام سے لکھی گئی۔ اس نے کبھی کبھی اعتماد و وثوق کا ایسا مقام مسلمانوں میں حاصل کر لیا جس کا استحقاق شاید قرآن اور دین کے متواترات کے سوا کسی چیز کو حاصل نہیں، کیدانی فقہ کے متن کی ایک عبارت کی بدولت سرحد، کابل اور ترکستان وغیرہ میں ایک معمولی[1] فقہی جزئیہ کی وجہ سے جو فتنہ صدیوں برپا رہا

---

[1] یعنی نماز میں بیٹھ کر التحیات پڑھتے ہوئے تشہد کے موقعہ پر انگلی اُٹھائی جائے یا نہ اُٹھائی جائے، کیدانی

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

اہل علم اس سے واقف ہیں گویا کوئی ایسی صورت پیش آجاتی تھی کہ ہر وہ شخص جو ہم سے پہلے مذہب یا دین کے نام سے کچھ لکھ کر مر گیا، وہی ہمارا دین بن جاتا تھا آج کل کلچر کے لفظ کا جادو جس کام کو انجام دے رہا ہے، ہر بُری بھلی بات، حد سے زیادہ احمقانہ ہی کیوں نہ ہو، لیکن صرف اس لئے کہ والد مرحوم یا دادا جان یہی کرتے تھے، کلچر کا نام دے کر اس زمانہ میں بھی اصرار کرنے والے اصرار کر رہے ہیں اور کیسا اصرار؟ حالاں کہ ہم میں ہر شخص چند ہی سالوں کے بعد خود ہی والد مرحوم اور دادا جان بن جانے کا فخر حاصل کر لیتا ہے۔ والد یا دادا جان ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی خبر کی صحت اور سچائی کا معیار کیسے بن سکتا ہے، بشی میتوں میں بھی والد مرحوم اور دادا جان بنتے چلے جانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے بہر حال "پروہت" اور "کلیسا" وغیرہ قصے مسلمانوں میں نہیں پیش آئے لیکن اسی کے ساتھ انحطاط و تنزل کے زمانہ میں یہ تو سنا جاتا ہے کہ امیر حمزہ کی داستان تک بعض علاقوں میں مذہب کی مقدس کتاب کی حیثیت سے پڑھی جاتی تھی، اور یہ تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ معجزہ آلِ نبی، قصہ شاہ روم، نور نامہ کا پاٹ لوگ شفا حاصل کرنے کے لئے کر رہے ہیں گویا ان نظموں کے ایک ایک شعر کی حقیقت ناطق حجت کی تھی۔ پچھلے دنوں ہندوستان میں اہلِ حدیث یا غیر مقلدیت کی تحریک سچ پوچھئے تو مرزا رحیم اللہ بیگ محمد درویش عظیم آبادی کے شافعی المذہب بن جانے ہی کی ایک شکل تھی، جس میں فی زمانہ غلو اور تشدد پیدا ہو گیا تھا، بجائے خود یہ تحریک جو کچھ بھی ہو، لیکن اس کو تسلیم کرنا چاہئے کہ اپنے دین کے اساسی سرچشموں (قرآن و حدیث) کی طرف توجہ ہندوستان کے حنفی مسلمانوں کی جو پلٹی اس میں اہلِ حدیث اور غیر مقلدیت کی اس تحریک کو بھی دخل ہے۔ عمومیت غیر مقلد تو نہیں ہوئی، لیکن تقلید جامد اور کورانہ اعتماد کا طلسم ضرور ٹوٹا، کہا جا سکتا ہے کہ اصلاح و تجدید کی اس ضرورت کی طرف اہلِ حدیث والی تحریک سے پہلے اس بہاری درویش کا ذہن منتقل ہوا۔ اور اسی میں جہاں تک میرا خیال ہے ان کی شافعیت کا راز غالباً مستور تھا، فرحمۃ اللہ علیہ[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے ایک فقرے سے معلوم ہوتا تھا کہ انگلی اٹھانا نہیں چاہیئے، اسی فقرے پر اصرار کرنے والے... ...اصرار کرتے تھے اور جو اٹھاتا تھا، یہ تاریخی واقعہ ہے کہ بسا اوقات ان کی انگلیاں توڑ دی گئیں یا تراش لی گئیں، علامہ رشید رضا مصری نے براہ راست بعض افغانیوں سے پوچھا انھوں نے اس کا اقرار کیا، ۱۲ ۔ [1] مضمون جن لوگوں کی نظر

امیر البحر

خیر الدین باز بروسہ

از

(جناب لیفٹنٹ کرنل خواجہ عبد الرشید صاحب)

مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ حکومت اسپین اپنے آخری دموں پر تھی۔ سولھویں صدی عیسوی کا آغاز تھا اور مسلمانوں کو پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں، بلکہ مسلمان کا اخراج اس جزیرہ نما سے شروع ہو چکا تھا۔ باوجود ان حالات کے ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہسپانیہ پر قبضہ حاصل کرنے کی جو جد و جہد کی وہ تاریخ میں جستہ جستہ کہیں کہیں ہمیں رنگین الفاظ میں ملتی ہے۔ مگر یہ واقعات اس قدر منتشر اور بکھرے ہوئے ہیں کہ ہمیں ان کا یکجا کہیں بھی نشان نہیں ملتا۔ اس جد و جہد کا ایک پہلو صرف اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اور وہ مسلمانوں کے بحری کارنامے ہیں جن کا بیان کرنا یہاں مقصود ہے۔

سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں جہاں ایک طرف ہم ہسپانیہ سے مسلمانوں کو نکلتے دیکھتے ہیں دوسری طرف ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ ترکوں کی حکومت شمالی افریقہ میں ہر طرف پھیل گئی تھی اور ترکوں نے ایک عجیب تازگی کے ساتھ نہ صرف ہسپانیہ کو واپس لینے کی کوشش کی بلکہ اروپا کے غصب شدہ ممالک بھی حاصل کرنے کا اہتمام کیا۔ تاریخ کم از کم ایک واقعہ ایسا ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جب کہ ترکوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ جبل الطارق کو فتح کر لیا۔ مگر انھیں اسے چھوڑنا پڑا کیوں کہ بری فوجوں کی طرف سے انھیں کوئی امداد بر وقت نہ پہنچ سکی۔ اس مہم کے ہیرو خیر الدین باز بروسہ تھے جنہیں تاریخ میں باز بروسہ دوئم کے نام نامی سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے سلطان سلیم اول و دوئم، دونوں کا زمانہ پایا ہے مگر

ان کے کارنامے زیادہ تر سلیم دوئم کے قیام سلطنت سے متعلق ہیں۔

ترکوں کی فتوحات منجملہ دیگر مقامات کے شمالی افریقہ میں تونس، مراکش، فیض طرابلس اور الجیریا کو بھی حاوی کیئے ہوئے تھیں۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں سے طاریف اور طارق نے اپنے حملہ آور دستے اولین مرتبہ کھڑے کیئے تھے جنھوں نے اسپین کو فتح کیا۔ یہ یاد رکھنے کے قابل امر ہے کہ طارق سے پہلے طاریف اسپین پر حملہ آور ہو چکا تھا اور مقام طاریفہ پر اپنا بیڑا اُتار چکا تھا۔ اس کے بعد طارق نے جبل الطارق کے مقام پر قبضہ کیا اور اسپین میں گھس گیا۔ چنانچہ مستشرقین جن لوگوں کو سراسنیز (Saracens) کہتے ہیں وہ اسی علاقے کے لوگ تھے! تو پھر مقام تعجب کیوں ہو جو ہم اس وقت تاریخ کو دہراتے دیکھ رہے ہیں۔ فی الیوم یہی لوگ ہیں جو از سرِ نو جنگ آزادی میں ہمہ تن مشغول ہیں اور اندلس اور اشبیلا کی حسین وادیوں میں از سرِ نو قبضہ جمانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور کیا عجب جو یہ پھر اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرلیں۔ ع
دُر اَفشِ ملت عثمانیاں دوبارہ بلند —— کی تعبیر انھی کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچ جائے۔ تانہ بخشد خدائے بخشندہ!

خاندان باربروسہ | اس خاندان کے متعلق بہت سی روایات ہیں۔ ہم پہلے ان تمام روایات کو مختلف ماخذوں سے مستعار لے کر یک جا کرتے ہیں اور پھر اپنی رائے کا اظہار کریں گے جو ان روایات سے مختلف ہے۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ خیرالدین باربروسہ کا بڑا بھائی پہلے پہل مسلمان ہوا۔ یہ ایک یونانی الاصل شخص تھا جو جزیرہ میٹی لین کا رہنے والا تھا (Mitylene)۔ اس کا باپ نصرانی تھا اور مٹی کے برتنوں کی تجارت کیا کرتا تھا خیرالدین کے بڑے بھائی کا نام ہورش تھا (Horush)۔ اور اسے عموماً بابا ہورش کہا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی سُرخ رنگ کی ڈاڑھی تھی۔ ہورش کی عمر اس وقت ستائیس (۲۷) برس کی تھی جب وہ حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ ہورش ہی باربروسہ اوّل

Russia Turkish War Vol II London 1878

کہا جاتا ہے اور یہی وہ اول باربروسہ تھا جس نے بحیرہ متوسط میں مسلمانوں کا دبدبہ قائم کیا۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ اسی نام بابا ہورش کی وجہ سے یہ باربروسہ کہلایا۔ یہ نام اس کو عیسائیوں نے ہی دیا تھا جن کے لئے یہ ایک ہوا بنا ہوا تھا۔ اور وہ اس سے بہت ڈرتے تھے۔ اس نظریے کی تصدیق ایک[1] اور مقام سے بھی ہوتی ہے۔ کیپٹن والسین نے اپنی تاریخ میں کچھ ایسا ہی لکھا ہے مگر وہ ہورش کے بجائے عروج کا نام تجویز کرتے ہیں۔ اسی طرح رنگ اور[2] ڈیوس نے جو مقالات 1837ء میں شائع کئے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ عیسائیوں نے یہ نام محض خیرالدین کو ہی دیا تھا نہ کہ ہورش کو۔ مگر انسائیکلوپیڈیا[3] برٹینیکا کا یہ بیان ہے کہ اس خاندان کا مورث اعلیٰ ایک شخص یعقوب نامی تھا۔ جس کے چار بیٹے تھے۔ الیاس، عروج، اسحاق اور خضر۔ اور ان چاروں میں سے عروج اور خضر ہی تھے جنہیں ہورش اور خیرالدین کہا جاتا ہے۔ برٹینیکا کے اس بیان سے کم از کم یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ چاروں بھائی ایک مسلمان باپ کے بیٹے تھے اور ان میں سے کوئی بھی حلقہ بگوش اسلام نہ ہوا تھا بلکہ پیدائشی مسلمان تھے۔ ہماری تحقیق کے مطابق باربروسہ کے نام کی وجہ تسمیہ یہ نہ تھی کہ یعقوب کا کوئی بیٹا اس نام سے منسوب ہوا کیوں کہ اس کی سرخ ڈاڑھی تھی، بلکہ یعقوب خود ایک باربروسہ خاندان کا فرد تھا جس نے خود یا اس کے آباء واجداد نے دینِ اسلام کو قبول کیا۔ ہمیں تاریخ میں اور اسی مقام پر، جہاں کا یعقوب باشندہ تھا، ایک باربروسہ خاندان کا پتہ ملتا ہے۔ کم از کم ہم اس کے ایک فرد سے بخوبی آشنا ہیں کیوں کہ اس نے تیسری صلیبی جنگ میں صلاح الدین ایوبی کے خلاف لڑائی کی۔ اس کا نام فریڈرک[4] باربروسہ ہے۔ یہ تیسری صلیبی جنگ ۱۱۸۹ء میں

---

[1] History of the Turkish Rule in Africa by Captain Walsin Esterhazy 1840

[2] Arab Chronicle by S. Rang & F Davis 1837

[3] Encyclopaedia Britanica.

[4] Intellectual Development of Europe By William Draper

ہوئی۔ اور فریڈرک دورانِ جنگ ہی میں یروشلم کے قریب ایک جھیل کو عبور کرتے ہوئے ڈوب کر مر گیا تھا۔ اس جنگ میں صلاح الدین ایوبی نے یروشلم پر مکمل قبضہ کر لیا۔ ہمارا خیال ہے کہ مورخین کو باربروسہ خاندان کے تعین میں سہو ہو گیا ہے۔

باربروسہ اول| عیسائی مورخین نے ہورش کو بحری قزاق کہا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو کیوں کہ شروع شروع میں جب ہورش نے اپنا سکہ جمایا تو یہ نصرانی بیڑوں کو لوٹا کرتا تھا۔ اس کا دبدبہ تمام بحیرہ متوسط میں پھیلا ہوا تھا اور عیسائیوں کے جنگی بیڑے اس کے قریب سے گذرتے بہت گھبرایا کرتے تھے۔ ہورش کا قاعدہ تھا کہ یہ ساحل کے ساتھ ساتھ اپنے جہازوں کو لئے گھومتا پھرتا رہتا تھا اور جہاں کہیں یہ عیسائی جہاز تجارت کا مال لے جاتے اسے نظر آتے، یہ انھیں لوٹ لیتا۔ ممکن ہے کہ اس کا ذریعہ معاش شروع شروع میں یہی رہا ہو، کیوں کہ بالآخر اس کو بھی تو اپنے ساتھیوں کا پیٹ پالنا تھا اور اپنے جہازوں کی مرمت اور تعمیر پر روپیہ صرف کرنا ہوتا تھا۔ اس کا یہی دبدبہ تھا جس کی وجہ سے عرب اور ترک سپاہی جوق در جوق اس کے ساتھ شامل ہوتے چلے جاتے تھے اور اس نے ایک بڑا مضبوط بیڑہ تیار کر لیا تھا۔ اس کے ان کارناموں کو دیکھ کر سلطنت ترکیہ نے اسے بحری قیادت کے لئے منتخب کر لیا اور سلطان سلیم اوّل نے اس کو امیر البحر کا عہدہ سونپ دیا۔ چنانچہ اس زمانے سے یہ ترکوں کے بحری بیڑے کا کمانڈر مقرر ہوا۔ اس ہورش کو اوّلین مرتبہ امیر البحر کا عہدہ دیا گیا اور یہی وہ لفظ ہے جس سے بعد میں انگریزی کا لفظ ایڈمیرل (Admiral) تخلیق کیا گیا اس کے ساتھ مراکشی نوجوان بھی شامل تھے۔ امیر البحر بن جانے کے بعد ہورش نے تیونس کی بندرگاہ غولیتہ کو اپنا ہیڈکوارٹر بنایا، اور چوں کہ یہ جگہ چاروں طرف حملوں کے لئے ایک وسطی پوزیشن رکھتی تھی، اس نے پے در پے مشرق و مغرب کی طرف حملے کرنے شروع کر دئیے۔ جس سے ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ عموماً یہ یہاں سے مراکشی ساحل پر حملے کرتا۔ کیوں کہ اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ کسی طرح اسپین پر حملہ آور ہو کر اس

پر قبضہ کر سکے۔

ان تمام حملوں میں اس کا چھوٹا بھائی خیرالدین ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا اور ہورش کے نائب کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں خیرالدین کی ٹریننگ کا بھی سلسلہ جاری رہا، خیرالدین نے بڑے کارہائے نمایاں سر انجام دئے۔ اور اپنے بھائی کی وفات کے بعد یہ اس کا جانشین منتخب کیا گیا کہ اس سے بہتر اور تجربہ کار اور کوئی امیرالبحر بننے کے قابل نہ تھا۔

اس زمانے میں مولے محمدؒ، تونس کا گورنر ہوا کرتا تھا۔ اور یہ ہورش کو اسپین کے خلاف ہر قسم کی امداد دیا کرتا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب عیسائیوں نے مسلمانوں کو اسپین سے نکالنا شروع کر دیا تھا اور وہ ایک کثیر تعداد میں ہجرت کرنے لگ گئے تھے۔ انھی دنوں میں ہورش نے الجزیرہ سے تمام ہسپانیوں کو نکال بھگایا تھا۔ اور ان کے ساتھ متعدد جنگیں کی تھیں ایک لڑائی کے دوران میں ہورش کا ایک بازو کام آیا۔ یہ واقعہ ۱۵۱۲ء کا ہے جب وہ بوجل کے مقام پران سے لڑ رہا تھا۔ ۱۵۱۶ء میں اس نے ہسپانیوں سے جیجالی کا مقام لے لیا۔ مگر اس کی ان کامیابیوں کو دیکھ کر مولے محمد کچھ حسد کرنے لگ گیا اور جو امداد وہ دیا کرتا تھا اُس سے اُس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ مگر ہورش بڑا دوراندیش انسان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عیسائیوں پر اگر کسی کا رعب و دبدبہ ہے تو وہ اسی کا ہے اور وہ اس سے خوف زدہ تھے، اس لئے اس نے مولے محمدؒ کو تونس سے مار بھگایا اور وہاں خود قابض ہو گیا۔ ۱۵۱۶ء میں اس نے اپنے آپ کو وہاں کا حکمراں ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور ایک خود مختار سلطان کی حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ اپنی دارالحکومت کے حدود اس نے فیض تک بڑھا لئے۔ اب ہسپانیوں کو اور خطرہ لاحق ہو گیا جب انھوں نے اس کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھی۔ چنانچہ ۱۵۱۸ء میں انھوں نے ایک بہت بڑی بحری فوج اس پر حملہ کرنے کے لئے بھیجی۔ ہورش اس لڑائی میں دلیری سے لڑتا ہوا شہید ہوا۔ یہ مقام ری اد سلادو (Rio Salado) تھا۔ مگر ہورش کی شہادت کے بعد اس کا چھوٹا بھائی خیرالدین اس کا جانشین مقرر ہوا اور اس نے بڑی خوش اسلوبی

سے اس حملہ کو روک دیا۔

باربروسہ دوئم | خیرالدین باربروسہ جب اپنے بھائی کی جگہ پر مقرر ہوا تو ایک آزمودہ اور تجربہ کار قائد تھا۔ حکومت عثمانیہ نے فوراً اس کی قیادت تسلیم کر لی اور اسے امیر البحر کا عہدہ عطا کیا۔ چنانچہ یہ اپنے بھائی کی مہموں کو از سر نو تازہ کرنے میں مشغول ہوا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے بحری بیڑے کو ترتیب دیا۔ خیرالدین باربروسہ اپنے بھائی ہورش سے بھی زیادہ عیسائی حکومت کے لئے خطرناک ثابت ہوا۔ بحری جنگوں میں اس کی مہارت ایک جانی پہچانی بات تھی اور عیسائی حکومتیں اس سے بخوبی واقف تھیں۔ ۱۵۱۹ء میں جب سلطنت عثمانیہ نے اسے بطور قائد قبول کیا تو اول اول اس کو الجیریا کا گورنر جنرل مقرر کیا۔ اس زمانے میں الجیریا کا حدود اربعہ کچھ آج کل کے الجیریا سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ ۱۵۳۴ء میں اس نے تونس کو از سر نو فتح کر لیا جو مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ تونس کی فتح کے وقت سلطان سلیم نے اسے کپتان[1] پاشا کا خطاب عطا کیا۔ لین پول[2] بھی اس بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ مگر ہماری دانست میں جو خطاب اس کو اس وقت ملا وہ کپتانِ دریا کا اعزازی عہدہ تھا۔ اس کا اصل نام ترکی زبان میں قپوتانِ دریا تھا اور اسی سے انگریزی لفظ کپتان تخلیق کیا گیا ہے۔ قپوتانِ دریا کا ترجمہ کیپٹن آف دی سیز ہوتا ہے (Captain of the Seas.)۔ اور اسی کے ہی معنی ہیں امیر البحر جہاں سے لفظ ایڈمیرال (Admiral) مرتب کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں۔

اس زمانے سے[3] ترکی بحری طاقت بحیرہ متوسط پر کنٹرول کر رہی تھی۔ اور کوئی بھی یورپین طاقت اس قابل نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کر سکتی۔ یہ ایک عجیب حقیقت ہے جو عام مورخین کی نگاہ سے پوشیدہ رہی ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کی بحری طاقت گھٹنا شروع ہو گئی اور چار سو برس کے لئے ایک خلا پیدا ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی مختلف ممالک مسلمانوں

---

1 Ency. Brit

2 Muhammadan dynasties By Lanepool.

3 Russio-Turish War Vol II london.

کے ہاتھوں سے نکلتے چلے گئے۔ الحمد للہ کہ زمانہ اب پھر پلٹا کھا رہا ہے اور تاریخ نے اپنے آپ کو دہرانا شروع کر دیا ہے۔ ترکستان، مصر، پاکستان، اور ایران کے بحری بیڑے تیار ہو رہے ہیں۔ اگرچہ اس وقت ان میں اتنی توانائی تو نظر نہیں آتی تاہم ان کی از سرِ نو ترتیب شروع ہو چکی ہے اور کیا عجب جو چند ہی سال میں یہ مجموعی بیڑہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرے۔ تانہ بخشد خدائے بخشندہ! اور ان کا گذشتہ وقار پھر عود کر آئے۔

بحری کارنامے خیر الدین باربروسہ نے عنانِ قیادت سنبھالتے ہی پے در پے یورپین سواحل پر حملے شروع کر دیے۔ اور اس سرعت سے جزیرہ نما اسپین کو دوسرے عیسائی ممالک سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا کہ عیسائی حکومتیں انگشت بدنداں رہ گئیں۔ چنانچہ روما اور اٹلی سے انھیں اپنے بیڑوں کو ہسپانیہ کی حفاظت کے لئے فوری طور پر طلب کرنا پڑا۔ خیر الدین باربروسہ تہیہ کر چکا تھا کہ وہ جبل الطارق کو واپس لے کر ہی دم لے گا۔ اور اس کے بعد اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اسپین میں گھس کر اس پر قبضہ کرے گا مگر اس نے یہ حملہ ملتوی کر دیا جس کی چند ایک وجوہات تھیں۔ مگر اس نے اپنے اس منصوبے کو خفیہ راز میں نہیں رکھا۔ خود اس کے اپنے سپاہی اس کے اس عزم سے واقف تھے اور عیسائی بھی جانتے تھے کہ یہ آج یا کل حملہ آور ہو جائے گا چنانچہ انھوں نے پورے زور شور سے تیاری کرنا شروع کر دی تھی۔ خیر الدین باربروسہ کے پاس تمام وہ سپاہی آکر جمع ہو گئے تھے جو اسپین سے ہجرت کر کے آرہے تھے اور اسے ہر قسم کی خبریں فراہم کر رہے تھے، اس لئے اس کو اسپین کے تازہ حالات سے مکمل شناسائی تھی۔ مگر چند در چند وجوہات کی بنا پر اس نے فوری طور پر حملہ کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ اپنا بحری بیڑہ ترتیب دیتا رہا۔ اسے بری فوجوں کی امداد کی بھی ضرورت تھی جو ساحل پر اُترنے کے بعد اس کی مدد کرتیں شاید یہی وجہ تھی جو یہ حملہ ملتوی کرتا چلا گیا کہ مناسب تعداد میں بری فوجیں تیار نہ ہو سکی تھیں۔

بالآخر ۱۵۲۸ء میں اس نے اپنی فوجوں کو الجیریا سے سمیٹا اور بحری بیڑہ تیار کر کے

جبل الطارق پر حملہ کردیا۔ عیسائیوں نے یہاں دفاع کا بخوبی بندوبست کر رکھا تھا اور دو تین زائد بحری بیڑے بھی اٹلی وغیرہ سے منگوائے ہوئے تھے۔ ڈان برنارڈیو ڈی مینڈوزا (Don Bernandio De Mendoza) جوان کا سسلی (صقلیہ) میں امیر البحر تھا اس کو بھی انھوں نے منگوا بھیجا ہوا تھا۔ چنانچہ بیس اگست ۱۵۴۰ء کے روز خیر الدین باربروسہ نے اللہ کا نام لے کر حملہ کردیا۔ اور آناً فاناً تمام عیسائی بحری بیڑوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہوا دس دن کے قلیل عرصہ میں جبل الطارق کے دروازے جا کھٹکھٹائے۔ اس کے پاس اس وقت صرف سولہ جہاز تھے۔ ایک ہزار سپاہی جہاز چلانے پر مامور تھے اور دو ہزار لڑنے کے لئے سپاہی تھے! خیر الدین باربروسہ بغیر کسی دقت کے ساحل پر اتر گیا۔ شہر کے لوگ اس قدر سہم گئے کہ انھوں نے اپنے آپ کو شہر کی چاردیواری کے اندر بند کرلیا اور ہتھیار ڈال دئے مگر افسوس کہ بری فوج کی مدد نہ ہونے کی وجہ سے اس کو مہم بڑھا دینی پڑی۔ ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمان آج بھی جزیرہ نما اسپین پر حکومت کر رہے ہوتے۔

خیر الدین باربروسہ دوئم نے ۱۵۴۶ء میں وفات پائی اور ان کے بعد ان کا لڑکا حسن ان کا جانشین مقرر ہوا۔ یہ بھی باپ کے نقشِ قدم پر چلا مگر اُدھر دولت عثمانیہ کا ستارہ غروب ہو رہا تھا۔ بحرہ متوسط میں اس کی نقل و حرکت کو بڑی زک پہنچی اور یہ بیڑہ رفتہ رفتہ نابود ہوتا چلا گیا۔ ع　　چہ گو ہمت کہ با تیموریان چہ افتاد ست!

History of Gibraltar By Sayer London 1862

عربی کی ایک قلمی کتاب سے

تاریخ ہند پر نئی روشنی

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق استاذ ادبیات عربی دہلی یونی ورسٹی)

(۲)

شیخ مبارک نے کہا: میں بڑی بڑی فتوحات میں سلطان (محمد بن تغلق) کے ہم رکاب رہا، مختصراً کچھ چشم دید حالات بیان کرتا ہوں۔ سلطان نے سب سے پہلے تلنگانہ فتح کیا، یہ وسیع مملکت ہے، اس میں نو لاکھ نو سو گاؤں ہیں۔ اس کے بعد جاج نگر (اوڑیسہ)، جہاں ستر شاندار شہر ہیں، سب کے سب ساحل سمندر پر۔ جاج نگر کی آمدنی کا ذریعہ جواہرات، ہاتھی، مختلف قسم کا سوتی کپڑا، عطر اور خوشبودار جڑی بوٹیاں ہیں۔ اس کے بعد لکھنوتی (بنگال) کو مسخر کیا، یہاں نو راجاؤں کی حکومت تھی۔ اس کے بعد دیوگیر (دواگیر) کو جہاں چوراسی زبردست قلعے ہیں۔" شیخ برہان الدین ابوبکر بن خلال بزی کی رائے ہے کہ دیوگیر میں بارہ لاکھ گاؤں ہیں، اس جملۂ معترضہ کے بعد اب ہم شیخ مبارک کا بیان جاری رکھتے ہیں: دیوگیر کے بعد سلطان نے دور سمند کی ریاست فتح کی، یہاں سلطان بلال دیو اور پانچ غیر مسلم راجاؤں کی حکومت تھی۔ اس کے بعد معبر کا علاقہ فتح کیا، اس شاندار ریاست میں نوے بندرگاہ ہیں، اس کی آمدنی کا انحصار عطریات، خوشبودار اشیاء، ریشمی کپڑوں، سوتی پارچہ اور غیر ملکی عمدہ اور نادر مصنوعات پر ہے۔

فقیہ علامہ سراج الدین ابو صفار عمر بن اسحاق بن أحمد شبلی عوضی نے جو ہند کے صوبہ عوض (أودھ) کے باشندے اور ممتاز فقہاء کے اُس زمرہ سے ہیں جو سلطان دہلی کی خدمت میں رہتے ہیں، بیان کیا کہ بادشاہ کی عمل داری میں تیئیس [۲۳] بڑے صوبے ہیں:- (۱) دہلی. (۲)- دیوگیر (دواکیر) ۳- ملتان. ۴- کہرام (کہران) ۵- سامانا. ۶- سیوستان (سومنات) ۷- اُچ (وجا) ۸- ہانسی (ہاسی) ۹- سرستی. ۱۰- مَعْبَر ۱۱- تِلنِگانہ (تلنگ) ۱۲- گجرات. ۱۳- بداؤں. ۱۴- عَوض (أودھ) ۱۵- قنوّج. ۱۶- لکھنوتی. ۱۷- بہار. ۱۸- کرہ. ۱۹- مالوہ (ملاق) ۲۰- لاہور (لہاور) ۲۱- کلانور (کانور) ۲۲- جاج نگر. ۲۳- تلنج. ۲۴- دوراسمندر (دورسمند). ان صوبوں میں بارہ سو بڑے شہر ہیں جہاں سلطان کے نائب رہتے ہیں۔

میں نے شیخ مبارک سے دہلی، اس کی بناوٹ اور نظامِ حکومت، کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ کئی شہروں کا مجموعہ ہے جس کے ہر شہر کا ایک مستقل اور جانا بوجھا نام ہے لیکن عملاً دہلی کا اطلاق سارے مجموعہ پر ہونے لگا ہے، دہلی طول و عرض میں دور تک پھیلا ہوا ہے، اس کی آبادی کا دور چالیس میل ہے. عمارتیں پتھر اور اینٹ کی ہیں، چھتیں لکڑی کی اور فرش سنگِ مرمر جیسے ایک سفید پتھر کے. دہلی کے مکان زیادہ سے زیادہ دو [۲] منزلے ہوتے ہیں، مرمر کا فرش صرف شاہی عمارتوں میں لگایا جاتا ہے۔ شیخ ابو بکر بن خلاّل نے کہا کہ یہ پُرانی دہلی کے مکانات کا خاکہ ہے، دہلی میں جو نئی بستیاں وجود میں آئیں، ان کے مکانوں کا انداز مختلف ہے. اس وقت دہلی کا اطلاق اکیس [۲۱] شہروں پر ہوتا ہے (یہاں باغ ایک سیدھے خط پر برابر برابر لگاتے گئے ہیں، ہر خط کی لمبائی مشرق، شمال اور جنوب میں بارہ

میل ہے، مغربی سمت میں باغ نہیں ہیں (اضافہ از فوٹو نسخہ ۲/۱۹۲) وجہ یہ ہے کہ مغرب میں کہا یہ پہاڑ دہلی سے قریب ہیں۔ دہلی میں ایک ہزار اسکول ہیں، ان میں ایک کو چھوڑ کر جہاں شافعی فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے باقی سب حنفی مذہب ہیں۔ بیمارستان یا ہسپتال ستر ہیں، یہاں بیمارستان کو دارالشفاء کہتے ہیں۔ دہلی اور اس کے ماتحت علاقوں میں دو ہزار خانقاہیں اور سرائیں ہیں، شہر میں بڑی بڑی عمارتیں، لمبے چوڑے بازار اور بڑی تعداد میں حمام ہیں شہر کا سارا پانی کھلے کنوؤں سے نکالا جاتا ہے، ان کی گہرائی زیادہ سے زیادہ چودہ فٹ ہوتی ہے اور ہر کنوئیں پر چرخیاں لگی ہوتی ہیں۔ پینے کے لئے بارش کا پانی جو بڑے بڑے حوضوں میں جمع ہو جاتا ہے، استعمال کیا جاتا ہے، ہر حوض کا قطر تیر کی مسافت کے بقدر یا اس سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں وہ جامع مسجد ہے جس کا منارۂ اذان مشہور ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ روئے زمین پر بلندی میں اس کی نظیر نہیں۔ شیخ برہان الدین بن خلال بزی صوفی کی رائے میں قطب مینار کی اونچائی تقریباً بارہ سو فٹ ہے (چھ سو ذراع) شیخ مبارک نے کہا: دہلی میں تغلق شاہ کے جو محل اور کوٹھیاں ہیں وہ ان کے اور ان کی مستورات کے لئے مخصوص ہیں، ان میں ان کی باندیوں، محبوب کنیزوں، نوکروں اور غلاموں کے لئے کمرے ہیں۔ بادشاہ کے ساتھ کوئی خان یا امیر نہیں رہتا۔ یہ فوجی افسر صرف آداب بجا لاتے حاضر ہوتے ہیں، پھر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ آداب و کورنش کے لئے دن میں دو بار حضوری ہوتی ہے، صبح کو اور بعد عصر۔ فوجی افسروں کے عہدوں کی ترتیب اس طرح ہے :- سب سے اوپر خان، پھر ملک، پھر امیر، پھر اصفہلار، پھر سپاہی۔ سلطان کی نوکری میں اسی یا زیادہ خان ہیں اور لشکر نو لاکھ سواروں پر مشتمل ہے، ان کی ایک مقررہ تعداد دہلی میں رہتی ہے اور باقی مملکت کے دوسرے حصوں میں۔ ساری فوج کو سرکار

سے تنخواہ ملتی ہے اور سب پر بادشاہ کے لطف و کرم کا سایہ ہے۔

سلطان کے لشکر میں تُرک، خُطا، فارس، ہند اور دوسرے ملکوں کے لوگ شامل ہیں، ہندی فوج میں دو جنگجو قومیں قابلِ ذکر ہیں: بھالویں (بھیل؟) اور شطارو (چھتری؟)۔ ساری فوج گھوڑوں، اعلیٰ قسم کے ہتھیاروں اور شاندار وردیوں سے لیس ہے۔ اکثر فوجی افسر اور سپاہی فقہ سے دلچسپی لیتے ہیں اور کسی خاص فقہی مسلک سے وابستہ ہیں، لیکن عام مسلمان فقہ حنفی کے پیرو ہیں۔ سلطان کے پاس تین ہزار ہاتھی ہیں جو جنگ کے وقت لوہے کی سنہری پوشش (برگصطوان) پہنتے ہیں، دوسرے اوقات میں مختلف قسم کے ریشم اور کارچوب کی جھولوں میں ملبوس ہوتے ہیں، ان کی پیٹھ پر محل اور تخت بنا کر ان کو سجایا جاتا ہے، تخت پر کیلیں جڑ کر لکڑی کے بُرج بنائے جاتے ہیں اور ہندی سورما ان محلوں اور تختوں پر بیٹھ کر لڑتے ہیں، ایک ہاتھی پر اُس کی طاقت اور جُثّہ کے لحاظ سے چھ سے دس تک آدمی سوار ہوتے ہیں۔ سلطان کے بیس ہزار ترکی غلام ہیں اور بقول ترسی (ترزی؟) دس ہزار خصی لونڈے بھی۔ اس کے علاوہ ہزار خرندار (؟)، ہزار بشمقدار (؟)، اور دو لاکھ ایسے مسلح غلام (۵/۱۲) جو ہر وقت سلطان کے ہم رکاب رہتے ہیں اور اُس کے آگے لڑتے ہیں۔ سلطان کے خان، مَلِک، امیر اور اِصفہلار اپنے سپاہیوں کو گذارے کے لئے جاگیریں نہیں دیتے جیسا کہ شام اور مصر میں دستور ہے بلکہ ہر فرد کو گذارے اور ہتھیار کے لئے تنخواہ ملتی ہے ...... خان کی کمان میں دس ہزار سوار ہوتے ہیں، مَلِک کی کمان میں ہزار، امیر کی کمان میں سو، اور اِصفہلار کی کمان میں اس سے کم۔ ان سب فوجی افسروں کو سرکار سے جاگیریں ملتی ہیں جن کی آمدنی فوج کے مقررہ کوٹے کے لیے کافی ہوتی ہے بلکہ اکثر خرچ کے تخمینہ سے دوچند۔ جاگداد

کے علاوہ ہر خان کو دو لاکھ تنکے ذاتی خرچ کے لئے دئے جاتے ہیں، ایک لاکھ سو ہزار کے برابر ہوتا ہے اور ہر تنکہ آٹھ درہم (چار روپئے[1]) کے مساوی۔ یہ رقم خان کے ذاتی اخراجات کے لئے خاص ہے، اس سے فوج پر کچھ خرچ نہیں کیا جاتا۔ ہر ملک کی تنخواہ ساٹھ ہزار تنکہ سے پچاس ہزار تنکہ تک ہے اور اُمیر کی چالیس ہزار سے تیس ہزار تک، اِصفہلار کی تنخواہ بیس ہزار یا اس کے لگ بھگ۔ سپاہی کی تنخواہ دس ہزار تنکہ سے ہزار تنکہ تک، سلطان کے تُرکی غُلاموں کا مشاہرہ پانچ ہزار تنکہ سے ہزار تنکہ تک، کھانا، لباس اور گھوڑے کا چارہ مفت۔ سپاہیوں اور تُرکی غلاموں کو جائداد نہیں دی جاتی، بلکہ خزانہ سے نقد تنخواہ ملتی ہے۔ سلطان کے ہر غلام کو مہینہ میں دو من گیہوں اور چاول راشن ملتا ہے اور تین سیر گوشت یومیہ اور پکانے کا متعلقہ سامان، اس کے علاوہ ہر ماہ چاندی کے دس تنکے، (چالیس روپئے) سال میں چار جوڑے۔ سلطان محمد بن تغلق کا ایک کارخانہ ہے جہاں ریشم اور کارچوب کا کام ہوتا ہے اور چار ہزار کاریگر ہیں جو خلعتوں، جوڑوں اور وردیوں کے لئے قسم قسم کے ریشمی کپڑے بُنتے اور کاڑھتے ہیں، اس کے علاوہ چین، عراق اور اِسکندریہ سے جو کپڑا درآمد ہوتا ہے وہ بھی یہاں کاڑھا جاتا ہے۔ سلطان ہر سال دو لاکھ جوڑے بانٹتا ہے، ایک لاکھ جاڑے میں اور ایک لاکھ گرمی میں۔ سردی کے جوڑے بیشتر اِسکندریہ کے کپڑے سے بنائے جاتے ہیں، اور گرمی کے اُس ریشم سے جو دہلی کے "دارالطراز" (کارچوب گھر) میں بُنا جاتا ہے، یا چین و عراق سے درآمد ہوتا ہے شاہی جوڑے خانقاہوں کے درویشوں کو بھی بانٹے جاتے ہیں۔ سلطان کے چار ہزار زرکار

---

[1] چاندی کا تنکہ چار روپئے اور تانبے کا چھ آنے کے برابر تھا کہ میری رائے میں یہاں موخر الذکر کو مراد لینا حقیقت سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔

ہیں جو اس کے اور اس کے حرم کے کپڑے تیار کرتے ہیں اور خلعتیں بناتے ہیں جو سلطان کی طرف سے ارباب دولت، اور ان کی خواتین کو عطا کی جاتی ہیں۔ ہر سال تغلق شاہ دس ہزار عربی گھوڑے بانٹتا ہے، ان میں سے کچھ زین و لگام کے ساتھ دئے جاتے ہیں اور کچھ بغیر زین و لگام کے۔ زین اور لگام والے گھوڑوں کی قسمیں ہیں: ان میں سے کچھ کو محض پوشش یا وردی دی جاتی ہے اور کچھ پوشش کے علاوہ زیور سے بھی آراستہ ہوتے ہیں، بعض وردیوں پر چاندی کا کام ہوتا ہے اور بعض پر سونے کا، اور بعض کے زیور چاندی کے ہوتے ہیں اور بعض کے سونے کے، عربی گھوڑوں کے علاوہ ترکی یا دوغلے گھوڑوں کی داد و دہش شمار سے باہر ہے۔ باوجودیکہ سلطان کی سلطنت میں گھوڑے خوب ہوتے ہیں، اور بڑی تعداد میں باہر سے بھی در آمد کئے جاتے ہیں، لیکن چوں کہ وہ گھوڑے بانٹنے میں بڑا فیاض ہے، اس لئے ہر ملک سے گھوڑے منگاتا ہے اور اس مد میں بڑی رقمیں صرف کرتا ہے، اور چوں کہ ہند میں شاہی داد و دہش کے علاوہ، بڑے بڑے لشکروں کی ضروریات اور ملک کی بڑھی ہوئی آبادی کے زیر اثر گھوڑوں کی مانگ زیادہ ہے اس لئے یہاں گھوڑے بہت مہنگے ہوتے ہیں اور ان کے تاجر خوب نفع کماتے ہیں

بحرین کے اُن رئیس تاجروں میں سے جو سلطان کو عربی گھوڑے فراہم کرتے ہیں، ایک بڑے تاجر علی بن منصور عُقیلی نے مجھے بتایا کہ ہند کے لوگ عمدہ گھوڑے کی ایک خاص پہچان رکھتے ہیں، اس پہچان والے گھوڑے کو وہ ہر قیمت میں خرید لیتے ہیں۔

سلطان محمد بن تغلق کا بڑا وزیر (نائب) ایک خان ہے جس کو اُمیرت کہتے ہیں، اُس کی سرکاری جائداد حکومتِ عراق سے کم نہیں ہوگی، سلطان (۶)

کا ایک وزیر ہے جس کی جائداد بھی عراق کے لگ بھگ ہے۔ بادشاہ کے چار مزید نائب ہیں جن میں سے ہر ایک کو "شق" کہتے ہیں، اور ہر ایک کا مشاہرہ بیس ہزار تنکہ سے لے کر چالیس ہزار تنکہ ہے، سلطان کے چار دبیر یا سکرٹری ہیں ہر سکرٹیری کو حکومت کی طرف سے بڑی آمدنی والا ایک بندرگاہ ملا ہوا ہے۔ ہر سکرٹیری کے ماتحت تین سو کلرکوں کا عملہ ہے، صفِ آخر کے کلرک کی تنخواہ دس ہزار تنکہ (دس تنکہ - فوٹو نسخہ) ہے، صفِ اول کے کلرکوں کو سرکار کی طرف سے گاؤں اور جائدادیں ملتی ہیں، بعض کے پاس پچاس پچاس گاؤں ہیں۔ صدر جہاں یا قاضی القُضاۃ کمال الدین بن بُرہان کی جائداد دس دیہاتوں پر مشتمل ہے جن سے قریب ساٹھ ہزار تنکہ آمدنی ہوتی ہے، قاضی القضاۃ کو صدرُ الأسلام بھی کہتے ہیں، شیخ الأسلام یا شیخ الشُیُوخ کی جائداد بھی اسی قدر ہے، مُحتَسِب کا مُشاہرہ ایک گاؤں ہے جس سے سالانہ آٹھ ہزار تنکے وصول ہوتے ہیں۔ سلطان کے بارہ سو طبیب ہیں، دس ہزار یزدار (؟) یہ گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اور سدھائے ہوئے پرندوں سے شکار کھیلتے ہیں۔ تین ہزار آدمی شکار ہکالنے پر مامور ہیں۔ ندیموں کی تعداد پانچ سو ہے، گانے بجانے والے بارہ سو ہیں، یہ تعداد اُن ہزار غلاموں کے علاوہ ہے جو خاص طور سے گانا سیکھنے کے لئے رکھے گئے ہیں۔ شاہی دربار میں ایک ہزار لطیف ذوق عربی، فارسی اور ہندی کے شاعر ہیں۔ شاہی انعامات کے ماسوا ان کو سرکار سے تنخواہ بھی ملتی ہے۔ سلطان کا کوئی گویا اگر کسی غیر کو گانا سنا دے تو اس کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔ مؤلف کہتا ہے کہ میں نے شیخ مبارک سے گانے بجانے والوں کی تنخواہ دریافت کی تو انھوں نے لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ ندیموں کی تنخواہ بتا سکتا ہوں: کسی کو ایک گاؤں، کسی کو دو، اس کے علاوہ علی حسبِ مراتب بیس

ہزار تنکہ سے تیس اور چالیس ہزار تنکہ نقد روپیہ اور خلعتیں، جوڑے اور جنس (۹)
شیخ مبارک نے کہا: سلطان محمد بن تغلق کے دستر خوان پر صبح شام بیس ہزار آدمی کھانا کھاتے ہیں، اِن میں خان، ملوک، امیر، اصفہلار، اور فوج کے دیگر اکابر بھی ہوتے ہیں۔ دسترخوانِ خاص پر سلطان کے ساتھ دو سو فقیہ ہوتے ہیں جو مختلف مسائل پر اس کے سامنے بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ شیخ ابوبکر بن خلّال بزّی نے کہا کہ میں نے شاہی باورچی سے پوچھا کہ ہر دن کتنی راسیں ہوتی ہیں تو اس نے بتایا: "ڈھائی سو گائیں، دو ہزار بکریاں، ان کے علاوہ موٹے گھوڑے اور قسم قسم کے پرند بھی کاٹے جاتے ہیں"۔ شیخ مبارک نے کہا: سلطان کی مجلس میں صرف بڑے فوجی افسر حاضر ہوتے ہیں یا وہ سپاہی جن کی موجودگی ناگزیر ہو۔ اسی طرح بادشاہ کی 'مجلسِ خاص' میں صرف بڑے فوجی افسر حاضر ہوتے ہیں یا وہ سپاہی جن کی موجودگی ناگزیر ہو۔ اسی طرح بادشاہ کی 'مجلس خاص' میں ندیم اور گویئے ایک ساتھ نہیں آتے بلکہ باری باری سے، اور اسی طریقہ پر سکریٹری، طبیب اور ان کے دوسرے ہم رتبہ عمل کرتے ہیں، شاعروں کی باریابی مخصوص تقریبوں اور تہواروں پر ہوتی ہے جیسے عیدِ رمضان اور عیدِ حج یا نئی فصل کے وقت یا رمضان پر، یا فتح کی خوشی پر یا کسی ایسی تقریب پر جب بادشاہ کو مبارک باد یا مدح پیش کی جاتی ہوں اور فوجی معاملات کا انتظام وزیرِ اعلیٰ یا امیریت کے ہاتھ میں ہے۔ ہندی اور نو وارد فقہار اور عالموں کے تمام معاملات کا انچارج صدر جہان ہے اور شیخ الاسلام، ہندی و نو وارد درویشوں کے معاملات کا۔ ہندی و نو وارد عام افراد اور اسی طرح ہندی و نو وارد شعراء کے ناظم امور سکریٹری ہوتے ہیں۔

قاضی القضاۃ ابو محمد حسن بن محمد غوری حنفی نے مجھے بتایا کہ سلطان محمد

بن تغلق نے اپنے سکریٹری بیغصان (بیغضان ؟) کو (ایران کے ایلخانی سلطان) ابوسعید کے پاس سفیر بنا کر بھیجا اور اس کی تحویل میں ایک لاکھ تنکے دیتے اور کہا کہ یہ رقم بصرہ، کوفہ اور عراق کے مزاروں کے مجاوروں میں بانٹ دینا، بیغصان کی نیت خراب تھی، اس نے اپنی ساری دولت ساتھ لی اور یہ ارادہ کر کے عازمِ سفر ہوا کہ پھر لوٹ کر سلطان کے پاس نہیں آئے گا، اتفاق کی بات ہے کہ وہ اس وقت پہنچا جب ابوسعید کا انتقال ہو چکا تھا بیغصان کی بن آئی اور وہ بغداد چلا گیا، اُس کے اور اُس کے ساتھیوں کے ساتھ تقریباً پانچ سو گھوڑے تھے، بغداد سے وہ دِمشق آیا، راوی کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہوا کہ وہ پھر عراق لوٹ گیا اور وہاں مستقل اقامت اختیار کرلی ہے۔ شیخ ابوبکر تبریزی نے کہا کہ سلطان تغلق کا جاہ و جلال دیکھ کر دل کانپتے ہیں اور جب اس کا جلوس نکلتا ہے تو زمین لرزتی ہے۔ وہ امورِ مملکت سے گہری دلچسپی لیتا ہے اور بہ نفس نفیس انصاف کرنے بیٹھتا ہے خواجہ احمد بن خواجہ عمر بن مُسافر نے کہا کہ سلطان رعایا کی درخواستوں پر غور کرنے کو عام دربار کرتا ہے، اُس وقت سکریٹری کو چھوڑ کر کسی انسان کو ہتیار تو کیا چاقو تک لے کر اس کے حضور میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی، لیکن وہ خود پوری طرح ترکش (۱۵/ہ) کمان اور تیر سے مسلح ہوتا ہے، اس کا معمول ہے کہ جہاں بیٹھتا ہے ہتیار ساتھ ہوتے ہیں۔

سلطان کی سواری کبھی جنگ کے لئے نکلتی ہے، کبھی دہلی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ یا ایک محل سے دوسرے محل کو جانے کے لئے۔ جب وہ میدانِ جنگ کو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے پہاڑ چل رہے ہیں، ریگ بہ رہا ہے، سمندر اُمنڈ آئے ہیں، بجلیاں چمک رہی ہیں اور ایسے منظر دکھائی دیتے

ہیں جن کو آنکھیں باور نہیں کرتیں، اور جن کے بیان سے زبان قاصر ہے۔
بادشاہ کی ہتنی پر ایک شہر یا مستحکم قلعہ ہوتا ہے (جس میں وہ بیٹھتا ہے) ہر طرف دھول ہی دھول نظر آتی ہے اور دن کے رُخِ روشن پر خاک کے سیاہ بادل چھا جاتے ہیں۔ سلطان کا شعار کالا جھنڈا ہے جس کے بیچ میں ایک سنہری پٹی ہوتی ہے۔ کسی اور کو کالا جھنڈا رکھنے کی اجازت نہیں۔ فوج کے میمنہ میں کالے جھنڈے ہوتے ہیں اور میسرہ میں لال، ان پر بھی سنہری پٹیاں ہوتی ہیں۔ باقی افسروں کے جھنڈے حسب حیثیت ہوتے ہیں۔ (باقی)

دنیائے اسلام

از

(جناب مدیر لائف انٹرنیشنل نیویارک)

مترجم

(جناب پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے)

(لائف انٹرنیشنل، نیویارک، نے ۷ / اگست ۱۹۵۵ء کے شمارے میں "دنیائے اسلام" کے عنوان سے یہ مقالہ شائع کیا تھا جس کا ترجمہ پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر صاحب ایم - اے، صدر شعبۂ فارسی و اُردو، سینٹ زیویرس کالج، بمبئی نے کیا ہے اور اسی کے ساتھ اس خط کا ترجمہ بھی جو مولوی عبدالصمد شرف الدین صاحب نے "لائف انٹرنیشنل" کے مدیر کو روانہ کیا تھا، اب یہ دونوں ترجمے "برہان" میں شائع کئے جارہے ہیں۔

عرب میں حضرت محمدؐ نے ایک مذہب توحید کی بُنیاد ڈالی۔ جس نے آگے چل کر پورے عالم انسانی کے ساتویں حصے کو اپنا حلقہ بگوش بنالیا۔

اسلام جو دنیا کے عظیم اور عالم گیر مذاہب میں سب سے کم سن ہے، کئی طرح سے سادہ ترین اور واضح ترین مذہب بھی ہے۔ اس مذہب کے ماننے والے صرف ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں جو ہر چیز پر قادر ہے۔ مذہبِ اسلام کے داعی حضرت محمدؐ نہ تو مسیحا تھے اور نہ نجات دہندہ بلکہ ایک ایسے انسان تھے جنھیں خدا نے اپنا پیغام بندوں تک پہنچانے کے لئے ایک ذریعہ کی حیثیت سے منتخب کیا تھا۔ اسلامی عقیدہ، جو منطقی موشگافیوں سے مُبرا ہے، اس دنیا میں انسان کے اخلاق سے اتنا ہی تعلق رکھتا ہے جتنا کہ دوسری دنیا میں اس کے حشر اور جزا وسزا سے دوسرے مذاہب کے برعکس، جن کی پیدائش کی روایات مبہم اور داستانی ہیں اور جو طویل و سُست ارتقاء کا نتیجہ ہیں، اسلام تاریخ کی پوری روشنی میں وجود میں آیا اور طوفان کی رفتار

سے پھیلا۔

حضرت محمدؐ کی وفات (واقع ۶۳۲ء) کے چند ہی سال بعد اسلام تمام مشرق وسطیٰ پر چھا گیا اور تقریباً ایک صدی کے اندر اس کی حدودِ اقتدار جبل الطارق سے لے کر ہمالیہ تک پھیل گئیں۔ آج اس کے کم وبیش ۳۰ کروڑ[1] مقلدین ہیں جو مجموعی طور پر دنیا کی آبادی کا ساتواں حصہ ہیں۔

(دنیا کی آبادی کے بعض نقشے مسلمانوں کی تعداد پچاس کروڑ سے بھی زیادہ بتاتے ہیں۔ برہان)

اسلام کی شاندار ابتدائی فتوحات کے وجوہ، تاریخی حالات یعنی بحر روم کے اطراف وجوانب کے ممالک کی افراتفری اور عربوں کے جوش وخروش اور جنگی قابلیت میں مضمر ہیں۔ لیکن اسلام کی دائمی طاقت اور پائداری کی وجہ اس کی سادہ، واضح اور مثبت مرافعت ہے جس نے اسلام کے اتحاد کو تیرہ سو سال سے برقرار رکھا ہے۔

اسلام صرف عبادات کے مجموعے کا نام نہیں ہے۔ وہ ایک ہمہ گیر طریقہ زندگی ہے جو انسانی خیالات اور اعمال کی اس حد تک رہنمائی کرتا ہے جس کا ہمسر مغرب میں بھی کوئی نہیں۔ اس کی عظمت کی کلید خود لفظ "اسلام" ہے۔ جس کے معنی ہیں "تابع ہونا" یعنی خود کو خدا کی رضا کا تابعدار اور فرمانبردار بنانا۔ لفظ "مسلم" اسی مخرج سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں "وہ جو تابعدار ہوتا ہے"، لہذا ہر سچا مسلمان خود کو ہر وقت خدا کے سامنے حاضر، ناظر سمجھتا ہے۔ اسلام کے ماننے والوں کے لئے مذہب اور زندگی، دین اور سیاست ناقابلِ تفریق ہیں۔

یہ اعتقاد کہ "خدا حاضر وناظر حاکم اور علیم وخبیر منصف ہے" دنیا کے مسلمانوں میں ایسا وقار اور خود اعتمادی پیدا کر دیتا ہے جس کے ہوتے ہوئے ان کے اسلام سے پھر جانے اور دکھ سے گھبرا جانے کا کوئی خطرہ نہیں۔

اپنے وسیع ترین مفہوم میں اسلام خدا کے زیر سایہ انسانوں کی اخوت کا نام ہے جو نسل و

قوم کی بندشوں سے نکل کر خدا کے حکم کی تعمیل کے لئے متحد ہو کر ایک منظم جد و جہد میں مصروف ہے۔ اسلام کا یہ یقین دلانا کہ محمدؐ کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے کلمات جو قرآن کریم میں محفوظ ہیں خدائے تعالےٰ کا آخری اور مطلق کلام ہے، اسلام کی عظمت اور قوت کا دوسرا قلعہ ہے۔

ایک مسلمان کے نزدیک قرآن پچھلے تمام آسمانی صحیفوں کو منسوخ کرتا ہے اور ان کے تمام حقایق کی تصدیق کرتا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت میں جو الٰہ واحد ہے بنیادی حیثیت سے وہی اسلام کا اللہ ہے۔ لیکن مسلمانوں کی نظر میں قدیم آسمانی صحائف میں خدا کے ارشادات کا اظہار نامکمل طریقہ پر ہوا تھا اور صرف قرآن ہی سے مکمل کیا گیا۔ اسی طرح اسلام حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک انجیل کے تمام پیغمبروں کی تعظیم کرتا ہے اور محمدؐ کو آخری اور معزز ترین پیغمبر گردانتا ہے اور انھیں 'خاتم النبیین' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ جہاں اسلام نے حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت سے انکار کیا وہاں اس نے حضرت محمدؐ پر ربوبیت کے اطلاق کی کوششوں کو بھی بارورنہ ہونے دیا۔ حضرت محمدؐ بار بار یہی کہتے تھے کہ وہ کلام الٰہی کو انسانوں تک پہنچانے کے لئے صرف ایک ذریعہ ہیں۔

حضرت محمدؐ کی ولادت کے وقت (روایۃً ۵۷۰ء) مکہ معظمہ، شام اور ہندوستان کے درمیان گرم مسالوں کے قدیم تجارتی راستہ پر ایک خوش حال تجارتی مرکز تھا۔ مکہ کو ایک مذہبی مرکز کی حیثیت بھی حاصل تھی جہاں بت پرست عرب شہر کے مختلف معبدوں میں تین سو ساٹھ بتوں کی پرستش کے لئے آتے تھے۔ ایک مستطیل عمارت بنام 'کعبہ' کی سب سے زیادہ تعظیم کی جاتی تھی۔ کعبہ میں مختلف بت نصب کئے گئے تھے۔ ایک گوشہ میں ایک حجرِ اسود رکھا ہوا تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جنت سے آیا ہوا پتھر ہے۔ حضرت محمدؐ مکہ کے ایک مقتدر ترین قبیلہ 'قریش' کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ زمانہ شباب ہی میں آپ کو اس وقت کے مروجہ مذہبی رسومات کو پرکھنے کے کافی مواقع ملے۔ کیوں کہ قریش،

خانۂ کعبہ کے محافظ مانے جاتے تھے۔ ابتداء میں حضرت محمدؐ نے بت پرستی سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اس کی وجہ سے یہودیوں اور عیسائیوں کی توحید کی حرمت و تعظیم میں اضافہ ہونے لگا۔

حضرت محمدؐ حساس ہونے کے ساتھ سوچ بچار کی طرف بھی بہت مائل تھے۔ آپ لگاتار کئی کئی دنوں تک مکہ کے اطراف کی پہاڑیوں میں سرگرداں رہتے۔ ایک شب فرشتۂ مقرب حضرت جبرئیلؑ ان کے سامنے نمودار ہوئے اور کہا "اقراء" (پڑھو)۔ اس ابتدائی وحی میں حضرت محمدؐ نے قرآن پاک کی اولین آیات کو ادا کیا۔ پہلے پہل تو آپ پر گھبراہٹ اور دہشت طاری ہوئی لیکن جب وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا تو انھیں یقین ہو گیا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں جو سچا اور واحد خدا ہے کم و بیش دس سال تک آپ پر وحی اُترتی رہی جب آپ کعبہ کے قریب کی گذرگاہوں میں کھڑے ہوتے تو اُن کے منہ سے بے ساختہ موزوں کلمات نکلتے۔ حضرت محمدؐ کی بتوں کی مذمت کی وجہ سے مکہ کے تاجر جنھیں بت پرست زائرین سے کافی آمدنی ہوتی تھی ان کے مخالف ہو گئے اور انھیں قتل کی دھمکی دی۔ آخر کار ۶۲۲ء میں حضرت محمدؐ نے مکہ سے ہجرت کی اور مکہ کے شمال میں ۲۰۰ میل دور ایک مقام یثرب میں جہاں کے باشندوں سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے آ کر مقیم ہو گئے۔

جس سال حضرت محمدؐ نے ہجرت کی وہی سال سنہ ہجری کا پہلا سال ہے۔ یثرب میں جس کا نام بعد میں مدینۃ النبی رکھا گیا حضرت محمدؐ نے بہت جلد ایک کامیاب روحانی پیشوا اور حاکم کی حیثیت حاصل کر لی۔ ان کے پیروؤں اور مکہ کے بسنے والوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے مقابلوں کا سلسلہ آخر کار دونوں شہروں کے مابین ایک جنگ پر منتج ہوا۔ یہ جنگ ۶۳۰ء میں اس وقت ختم ہوئی جب حضرت محمدؐ فاتحانہ مکہ میں داخل ہوئے اور کعبہ میں نصب شدہ تمام بتوں کو مسمار کر دیا۔ بعد کے دو سالوں میں حضرت محمدؐ نے عرب میں پیغمبر اور حکمراں کی حیثیت سے اپنے وقار کو اس قدر مستحکم کیا کہ ۶۳۲ء

میں ان کی وفات دین کی ترقی و اشاعت میں مانع نہ ہو سکی جو اب بے خبر بیرونی دنیا پر آندھی کی طرح ٹوٹ پڑنے کے لئے بالکل تیار ہو چکا تھا۔

یہ امر نامعلوم ہے کہ قرآن کی مکمل ترتیب حضرت محمدؐ کی زندگی میں ہی ہوئی تھی یا نہیں:
لیکن یہ یقینی بات ہے کہ حضرت محمدؐ کی وفات کے فوراً بعد ان کے ایک کاتب نے قرآن کو ایک مستند کتاب کی صورت میں مرتب کیا جسے ان کے صحابیوں کی مجلس نے مستند دینی صحیفہ تسلیم کیا اور اس کے بعد سے اب تک وہ محفوظ ہے اس کی تعلیمات اور کلام کو ہر مسلمان کلام الٰہی کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے اور اسی کی بنیاد پر شریعت اسلام یا اسلام کا قانون بنایا گیا ہے۔ اس کے ابتدائی عقائد سادہ ہیں یعنی توحید خالص اور آخرت۔ گو عرب معبودِ اعلیٰ کے وجود کے پہلے سے قائل تھے لیکن حضرت محمدؐ نے اللہ کو واحد اور یکتا خدا کی حیثیت سے پیش کیا۔
(مسلمانوں کی نظر میں عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث میں شرک کی آمیزش ہے)

آخرت کا عقیدہ خدا کی یکتائی کے اصول کے ذیل میں آتا ہے جو خالق اور منصف ہے۔ جنت کی راحتوں اور دوزخ کی تکلیفوں کے بارے میں قرآن کا بیان انجیل سے کہیں زیادہ واضح اور جان دار ہے۔ جنت میں باغات، فوارے، شراب کی نہریں اور حسین دوشیزائیں یعنی حوریں ہیں جن کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں صدف میں چھپے ہوئے موتیوں کی مانند ہیں۔ دوزخ میں آگ کے گڑھے، تیز و تند ہوائیں اور کھولتا ہوا پانی ہے۔

گو حضرت محمدؐ نے نہ تو منظم مذہبی پیشوائی کا کوئی ادارہ قائم کیا اور نہ کوئی مقدس رسم جاری کی۔ تاہم انھوں نے متعدد مذہبی احکام و فرائض کا حکم دیا جنھیں اسلام کے پانچ ستون بھی کہا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں: (۱) وحدتِ الٰہی کو تسلیم کرنا اور اس پر ایمان لانا جیسا کہ کلمۂ اول لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ خدا کے پیغمبر ہیں (۲) روزانہ پانچ مرتبہ اور جمعہ کو مسجد میں نماز کو ادا کرنا۔ نماز کی ادائیگی کے وقت منہ کعبہ کی طرف ہونا چاہیے۔ خواہ کوئی شخص دنیا کے کسی حصّہ میں کیوں نہ ہو۔ (۳) تقوٰی کی بنیاد پر راہِ خدا

ئیں زکوٰۃ دینا۔ (۴) ماہِ رمضان میں روزے رکھنا۔ (۵) خانۂ کعبہ کی زیارت یعنی حج کرنا۔

ان پانچ اہم عبادات کے علاوہ قرآن ایک عظیم الشان اخلاقی و شرعی دستور العمل بھی پیش کرتا ہے۔ قرآن مسلمانوں کو لحم خنزیر کھانے، جوا کھیلنے اور سود کا کاروبار کرنے سے منع کرتا ہے۔ اس میں نکاح و طلاق کے بنیادی قوانین اور مختلف جرائم کے لئے سزائیں بھی تجویز کی گئی ہیں۔ قرآن کے نزدیک جو امور معیوب ترین ہیں ان میں ایک مجسمہ سازی بھی ہے یہی وجہ ہے کہ ایامِ سلف میں کہیں بھی حضرت محمدؐ کے مجسمے اور تصویریں نہیں پائی جاتی ہیں۔

حضرت محمدؐ کی وفات کے ایک سال بعد اسلامی فوجیں جزیرہ نمائے عرب سے باہر نکل آئیں اور دنیا کی ان قوموں اور ملکوں کو متحیر کر دیا جو عربوں کے وجود سے متعلق بہت کم یا کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ پہلے تین خلفاء یعنی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی مدبرانہ قیادت میں بیس سال سے بھی کم عرصے میں مشرقِ قریب کی دو عظیم الشان سلطنتیں مسلمانوں کے قبضہ میں آگئیں۔ ۶۳۵ء میں شام، ۶۳۷ء میں عراق، ۶۴۰ء میں فلسطین، ۶۴۲ء میں مصر اور ۶۵۰ء میں تمام ایران فتح کیا گیا تھا۔ شروع شروع میں اسلامی فاتح فوجیں اس تیزی سے پیش قدمی کر رہی تھیں کہ انھیں نہ تو صلاح مشورہ کا وقت مل سکا اور نہ ان نئے مفتوح ممالک میں نظم قائم کرنے کا۔[1] انھوں نے خراج لینے پر ہی اکتفا کیا اور جو لوگ خراج ادا کرتے تھے ان سے رواداری برتی جاتی تھی۔ بایں ہمہ بڑھتی ہوئی تعداد میں مفتوحین کے گروہ صحرا سے آئے ہوئے نئے متحرک دین کی آغوش میں آنے لگے۔ فتوحات پر فتوحات حاصل ہوتی گئیں اور فتح کا سرشار کن جذبہ عربوں کو مشرق میں ہندوستان تک، مغرب میں بحر الکاہل تک اور آبنائے جبل الطارق کے اس پار اسپین، پرتگال اور فرانس تک لے گیا۔ آخر کار ۷۳۲ء میں ان کو فرنگیوں نے طورس کے مقام پر روک لیا۔ لیکن اب بھی ان کا جوش اور ولولہ ختم نہیں ہوا تھا۔ نویں، دسویں اور گیارھویں صدی، اسلام کے لئے سنہری زمانہ تھا۔ رومی، یونانی تہذیب کے اثر سے بیدار ہوکر اور بازنطینی و ایرانی میراث سے فیض یاب ہوکر اسلام نے اپنی ایک روشن

---

[1] یہ واقعات کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کا نظم جہانبانی تاریخ کی جانی پہچانی حقیقت ہے۔ (برہان)

اور عظیم الشان تہذیب کی تخلیق کی۔ بغداد اور عرب کے دیگر مشہور شہروں میں فن، فلسفہ اور شاعری کو کافی عروج حاصل ہوا۔ ریاضی اور طب نے ترقی کی۔ مسلمان صنّاعوں اور کاریگروں نے مسجد قرطبہ جیسے شاہکار پیش کئے۔ اسلامی پیغام کی ترویج و اشاعت مسلم تجار اور صوفیاء کے ذریعہ ایشیا اور ہندیشائی جزائر میں ہوتی رہی۔

اسلام کی ان ابتدائی شاندار فتوحات کے باوجود، مسلمانوں میں باہمی اختلافات موجود تھے۔ سب سے پہلا اختلاف حضرت محمدؐ کی جانشینی کے سوال پر پیدا ہوا۔ اور ان ابتدائی اختلافات کی وجہ سے ایسا نفاق پیدا ہوا جو آج تک موجود ہے۔ مختلف ادوار میں عقائد کے اختلافات نے مختلف گروہ اور جماعتیں پیدا کیں لیکن باہر سے ہر طرح اسلام صحیح و سالم رہا ہے اور آج بھی اسلام کی ایک پتھر پر تراشی ہوئی عمارت تین براعظموں کے سینہ پر اسی طرح سر بفلک ایستادہ ہے جیسی وہ مختلف ادوار میں رہی تھی۔ گو اسلام کی شاندار سلطنت کے حصے بخرے ہو چکے ہیں اور جدید قوم پرستی اور معاشی بدحالی نے اس کو کمزور بنا دیا ہے لیکن پھر بھی اسلام ایمان کی قوت کے ذریعہ آج بھی متحد ہے۔ مراقش سے بحر احمر تک مسلمان ایک ہی قسم کا ایمان رکھتے ہیں، ایک ہی طرح کی عبادت کرتے ہیں اور اپنا رُخ عبادت کرتے وقت ایک ہی مقدس شہر کی جانب کرتے ہیں۔ یہی وہ باتیں ہیں جنھوں نے اسلام کو آج بھی لاکھوں انسانوں کے لئے زمین پر خدا کی حکومت بنا رکھا ہے۔

مکہ معظمہ — "اس مقدس شہر کی زیارت ہر مسلمان کو کرنی چاہیئے"

اسلام کے احکام میں اس حکم نے کہ "ہر صاحب مقدرت سچے مسلمان کو اپنی زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور حج کرنا چاہیئے" اسلام کے لئے ایک اتحاد انگیز قوت کا کام کیا ہے۔ دنیا کے ہر حصے سے زائرین مکہ کے مقدس شہر کی جانب ایک خاندان کے افراد کی حیثیت سے سفید بے سلے کپڑے یعنی احرام باندھے ہوئے پہنچتے ہیں۔ ان کے اس اخوت کے جذبے کے تحت نسل و طبقات کی تمام حدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ صرف مکہ کو جانا ہی کافی نہیں بلکہ خاص

ارکانِ مذہبی کو انجام دینا بھی ضروری ہے۔ ان سب میں پہلا فریضہ کعبہ کا طواف ہے جو سات مرتبہ کرنا پڑتا ہے اس سے کم اہم فریضہ مکہ کے قریب دو چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان سات مرتبہ دوڑنا ہے۔ یہ فریضہ حضرت ہاجرہ کی اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کے لئے پانی کی بے تابانہ تلاش کی یادگار ہے۔ تیسرا اہم فریضہ میدانِ عرفات میں ادا کرنا ہوتا ہے جہاں زائرین کو 'جبل الرحمت' کے قریب دوپہر سے غروب آفتاب تک خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑتا ہے۔ یہ سب سے اہم فرض ہے اور جو اسے ترک کر دیتا ہے اس کا حج نہیں ہوتا۔

"اسلام میں عورت کی سماجی حیثیت اور رسومات کی تبدیلی"

جب اسلام اطرافِ عالم میں پھیل گیا تو مفتوح یا نو مسلم اقوام کے رسم و رواج اسلام کے سماجی نظام میں راہ بنانے لگے جس کی بنیاد قرآن کے عائد کردہ اعمال و افعال تھے۔ اسلامی دنیا میں عورتوں کے متعلق جو خیالات اور رجحانات پائے جاتے ہیں وہ اس امر کی ایک مثال ہے۔ کئی ممالک میں صدیوں سے انھیں گوشۂ تنہائی میں رکھا جاتا تھا اور مکانوں سے باہر انھیں بھاری بھرکم برقعوں کا کفن پہنا دیا جاتا تھا۔ تاہم ملایا میں قدیم روایات کے مطابق عورتوں کی آزادی کا تحفظ دوسرے ممالک سے زیادہ کیا گیا۔ دوسرے مقامات پر عورتوں پر جو کڑی پابندیاں عائد کی گئی تھیں وہ قرآن سے ماخوذ نہیں ہیں۔ بلکہ انھیں بعد میں فقہار کی تاویلوں کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے[1]

---

[1] یہ سب باتیں محلِ بحث اور تفصیل طلب ہیں (برہان)

فارسی و اُردو کی چند کم یاب کتابیں

کتاب خانہ دانش گاہ دہلی میں

از

(جناب نثار احمد صاحب فاروقی)

(۱)

چند مہینے پہلے، اورنگ آباد دکن کے مختلف مطبعوں سے چھپی ہوئی اُردو کتابوں پر ایک سیر حاصل تبصرہ لکھتے ہوئے جناب مبارز الدین رفعت نے یہ احساس دلایا تھا کہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح ہمارے ہاں اُردو میں نہ کتابوں کی توضیحی فہرست چھپتی ہے، نہ اُن کا کوئی کٹیلاگ مل سکتا ہے، نہ قدیم مطبوعہ کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اُردو والوں نے سائنٹفک طریقے سے کوئی علمی کام نہ کرنے کی قسم کھالی ہے۔ تامل زبان میں انسائیکلوپیڈیا موجود ہے، مگر اُردو میں نظامی بدایونی کی قاموس المشاہیر کے سوا کوئی کتاب "قاموس" کے انداز پر نہیں مل سکتی۔ نظامی مرحوم نے بھی بیلی کی کتاب کا ترجمہ ہی کر ڈالا تھا۔ اسی طرح کوئی مستند لغت کی کتاب بازار میں نہیں ملتی۔ قدیم مطبوعات کا کٹیلاگ مرتب ہونا تو دور کی بات ہے، مطبوعاتِ حاضرہ کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا کوئی وسیلہ ہمارے پاس نہیں۔ غرض یہ کہ:

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک ہست

اسی ضرورت کا احساس کر کے میں نے اُن قدیم قلمی اور مطبوعہ کتابوں کے تعارف کا بیڑا اٹھایا ہے جو اب کمیاب ہیں اور جن میں کچھ ایسا مواد بکھرا ہوا ہے جو تحقیقی کام کرنے والوں کو مدد دے سکتا ہے۔ امید ہے کہ دوسرے چھوٹے بڑے کتب خانوں سے قریب رہنے والے حضرات بھی اس ضرورت کا احساس کریں گے تاکہ اگر اُردو میں کبھی

"کتابیات" مرتب کرنے کی نوبت آئے تو آج کی یہ محنت ٹھکانے لگ سکے۔ وماتوفیقی الّا باللہ العلی العظیم۔ نثار احمد فاروقی

(۱) آئینۂ حیرت | محمد جان خاں حیرت الہ آباد کے محلہ منڈوی رانی کے رہنے والے تھے جو دائرہ حضرت شاہ غلام علی کے قریب ہے۔ قوم کے پٹھان تھے اُن کے والد کا نام بایزید خاں عرف باز خاں تھا اور دادا جہانگیر خاں تھے۔ حیرت میر اعظم علی اعظم کے شاگرد ہیں اور اعظم خواجہ حیدر علی آتش سے اصلاح لیتے تھے۔

"آئینۂ حیرت" اُن کا دیوان ہے جس کے سرورق کی عبارت یہ ہے

"وَمَنْ یتوکل علی اللہ فہو حسبہ' اس دیوان کے کل حقوق مطابق قانون بستم ۱۸۶۷ء کے نسبت مصنف کے محفوظ رکھے گئے ہیں کوئی اہل مطبعہ بلا اجازت ورثائے مصنف اس کو نہ چھاپیں۔ یہ دیوان مطبع حسینی دھرم پرکاش میں اور ٹیٹل مطبع نیر ہند الہ آباد محلہ شاہ گنج میں چھپا۔ ۱۲۹۸ھ"

اسی عبارت کے درمیان بیضوی شکل میں عنوانِ کتاب درج ہے:

"الحمد للہ والمنت کہ دیوان کامل مع غزل ہائے تازہ از نتائج طبع عالی فکر اہل کمال سرآمد شعرائے ماضی وحال جناب محمد جان خاں صاحب متخلص بہ حیرت"

پھر صفحہ ۱ تا ۲ خواجہ غلام غوث بےخبر کی نوشتہ تقریظ ہے وہو ہذا:

یاں شاہدِ معنی کے جلوے کی یہ صورت ہے دیوان کا ہر صفحہ آئینۂ حیرت ہے

میں اس دیوان کو آئینۂ حیرت اس نظر سے نہیں کہتا کہ خان فصاحت مرتبت محمد جان خاں حیرت کی تصنیف ہے بلکہ اس وجہ سے کہتا ہوں کہ ایسے وقت میں کہ شاعری محض ایک لغو حرکت اور بالکل تضیع اوقات سمجھی جاتی ہے اور فی نفس الامر بھی یہی بات۔ جب کوئی سننے اور سمجھنے والا نہ ہو تو کلامِ موزوں ناموزوں ہے اور سخنِ خوب نامرغوب۔ عرضِ جوہر سے جوہر شناس خوش ہوتے ہیں۔ نظر نہ ہو تو لعل اور پتھر برابر ہے۔ آئینہ کی قدر یوسف طلعتوں کو ہوتی ہے صورت بری ہو تو آئینہ توے سے بدتر ہے۔ ہمارے عہد میں حکّام وقت کو اپنی حکیمانہ روش کی وجہ سے مطلق اس کا ذوق نہیں کہ کوئی صلے کی امید میں جان کھپائے ہم جنسوں کو افسردگی خاطر سے ذرا بھی شوق نہیں، کہ کوئی جان کاہی کی داد پائے۔ زمانہ کا وہ ڈھنگ کہ عاشق اپنے دل اور معشوق اپنی زلف سے زیادہ پریشان ہیں۔ لیل ونہار کا یہ رنگ کہ امیر اپنے جنجال اور غریب

اپنے حال میں مبتلا اور حیران ہیں - کہاں کا شعر اور کیسی شاعری - اس پر طرّہ یہ کہ ہم صفیر سب آشیانے خالی کر گئے - ہم نواؤں نے گلشنِ عدم کی راہ لی - جو کچھ کہنے سننے والے باقی رہ گئے ہیں، اُن پر ایسی اُداسی چھاگئی ہے، کہ زبان اور کان بند کئے کُنجِ عزلت میں خاموش ہیں - زمانہ اُن کے لئے وہ زمانہ کے لئے حرف از خاطر فراموش ہیں - بزمِ جہاں ایسی سنسان ہے جیسے بارات رخصت ہونے کے بعد شادی کا گھر - یہ محفل ایسی خاموش اور اہلِ محفل ایسے بے ہوش ہیں جس طرح رات کی مجلسِ شراب بوقتِ سحر - مصنّف کا اس کس مپرسی و کس مشنوفی کی طرف متوجہ رہنا اور اپنے کلام کی تدوین میں ہمّت صرف کرنی، محلِ حیرت ہے - اور پھر اس خوبی کے ساتھ کہ درحقیقت پریزادانِ معنی کے لئے آئینہ خانہ ہے، جدھر نگاہ کیجئے دل فریب جلوے پیشِ نظر ہوتے ہیں - فی الواقع مستانِ بادۂ سخن کے واسطے اس مے کدے میں حرف کی کشش اور دائرے سے وہ شیشہ اور پیمانہ ہے، کہ باخبر اس کی سیر سے میری طرح 'بے خبر' ہوتے ہیں - زیادہ کیا لکھوں حسنِ کلام اپنی خوبی کا آپ شاہد ہے کسی کی تعریف کی ضرورت نہیں - محبوب خوبرد کا جمالِ سادہ ہی دل رُبا ہے مشّاطہ کے سنوارنے کی حاجت نہیں - الٰہی یہ آئینہ ہمیشہ منظورِ نظرِ صاحب نظراں رہے جو اسے دیکھے صفائے سخن کا شیفتہ ہو کر آئینے کی طرح حیراں رہے

چشمِ بدِ حاسد سے یارب تو بچا اِس کو | تو سب کا نگہباں ہے سب کچھ تجھے قدرت ہے

خواجہ غلام غوث بے خبر کی اس تقریظ کے بعد ص۳ سے دیوان غزلیات کا آغاز ہوتا ہے - مطلع سرِ دیوان ہے :

کر سجدہ قلم، دیکھ یہ موقع ہے کہاں کا | لکھنی ہے صفت اس کی جو خالق ہے جہاں کا

ایک شعر میں اپنے استاد کی طرف اشارہ کیا ہے ص۱۵۷

غزل گوئی نہیں جادو خیالی ہے یہاں حیرت | مقرر اسمِ اعظم یاد ہو مردِ غزل خواں کو

یہ دیوان ۶ × ۹½ سائز کے ۲۸۴ صفحات کو محیط ہے - ص۳ سے ص۲۳۱ تک غزلیات - ص۲۳۱ سے ص۲۳۴ ترجیع بند" در شان حضرت امیر المومنین ... علی بن ابی طالب بامید خاتمہ بخیر دیوان ہذا خود"

مشہورِ خلق آپ کی مشکل کشائی ہے | موقوف آپ پر مری حاجت روائی ہے

ص۲۳۵ قطعہ تاریخ طبع دیوان نوشتہ مصنف

"زہے ترانۂ حیرت" خیال میں آیا
۱۲۹۶ھ

"قطعہ تاریخ عن مرزا حاتم علی صاحب منصف سابق متخلص بہ مہر، شاعر نامی و رئیس اعظم اکبر آباد"

صاف دیوانِ محمد جان خاں ہے جو بحرِ نظم کا صورت نما

مصرعِ تاریخ مہران کا کہو گردشِ آئینۂ حیرت فزا

اسی میں حاتم علی مہر کے برادر زادہ مرزا عنایت علی ماہ، اور محمد زکریا خاں زکی خلف سید محمود خاں شاگرد مرزا اسد اللہ خاں غالب "برادر زادۂ نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں صاحب مغفور رئیس اعظم دہلی" کے تین قطعات تاریخ، نیز قطعہ تاریخ از مولوی امیر محمد صاحب ساکن رامپور اور "قطعہ تاریخ نواب عبدالعزیز خاں صاحب متخلص بہ عزیز رئیس اعظم ضلع بانس بریلی شاعر نامی، بقیۂ خاندان نواب حافظ رحمت خاں صاحب مغفور اور سید شاہ محمد علیم خلف مولوی سید شاہ محمد عباس صاحب ناظم سابق ریاست بھوپال و شاگرد میر اعظم علی اعظم تلمیذ خواجہ حیدر علی آتش ساکن الہ آباد محلہ یحیٰی پور دائرہ حضرت شاہ رفیع الزماں صاحب مغفور" کے تصنیف کردہ قطعاتِ تاریخ بھی شامل ہیں۔ پھر ص۲۳۸ سے منشی محمد علی الفت الہ آبادی کا نوشتہ ۱۲ اشعار کا قطعہ تاریخ اور تقریظ شروع ہوتی ہے۔

میر مرتضیٰ رشید، خواجہ عزیز الدین، الطاف حسین حذر ساکن شہر فتح پور ہسوہ شاگرد میر حسین لاغر لکھنوی تلمیذ منشی مظفر علی اسیر کے قطعات تاریخ اور پھر ص۲۴۴ سے خود مصنف کے لکھے ہوئے قطعات ہیں۔ پہلا قطعہ (ص۲۴۴) "تاریخ تولد فرزند ارجمند کنور پربھو نرائن سنگھ بہادر ولد مہاراجہ ایسری نرائن سنگھ بہادر بنارس دام اقبالہما" ہے اور دوسرا (ص۲۴۵) بھی اسی مضمون کا ہے۔

اس دیوان کے مطالعے سے دو باتیں بہت اہم معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی آتش کے شاگرد اور خود محمد جان حیرت کے استاد میر اعظم علی اعظم کا سالِ وفات۔ اعظم، آتش کے شاگرد رشید تھے اور ان کی اہمیت یہ ہے کہ اکبر الہ آبادی کے دادا استاد تھے۔ اکبر نے وحید الہ آبادی سے اصلاح لی تھی اور وحید، انھیں اعظم کے

ل "وحید الہ آبادی" پر ملاحظہ ہو میرا مضمون مطبوعۂ آج کل دہلی مارچ ۱۹۵۷ء

شاگرد تھے۔ محمد جان حیرت نے اعظم کا سال وفات اس قطعہ میں نظم کیا ہے:

کس طرح سے جائے دل سے یہ غم ہر دم | استاد ی شفیق، مکرّم ہے ہے
رحلت کے سبب سے آپ کے اب | ذی الحج بھی ہوا محرّم ہے ہے
اس قطعہ کے ہر بیت میں ہر بیتِ عزا | ہر مصرع ہے شکلِ نخلِ ماتم ہے ہے
تاریخِ وفات کی ضرورت سُن کر | ہیں فکر میں شاعرانِ عالم ہے ہے
ہاطف (کذا) نے جو پوچھا سالِ رحلت اُن کا | حیرت نے کہا کہ "میرِ اعظم ہے ہے" (ص ۲۴۵-۲۴۶)

"میرِ اعظم ہے ہے" سے ۱۲۹۱ھ مستفاد ہوتے ہیں، اس سے علم ہوا کہ اعظم کی وفات ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ میں ہوئی تھی۔

دوسرا قطعہ تاریخ مولوی غلام امام شہید کی وفات پر نظم ہوا ہے۔[1] شہید کا وطن اصلی امیٹھی ضلع لکھنؤ تھا گویا مظفر علی اسیر کے ہم وطن تھے۔ فنِ شعر میں مصحفی امروہوی سے اصلاح لی تھی، قتیل سے بھی چندے مشورہ رہا۔ قاضی محمد صادق اختر، آغا سید محمد اصفہانی اور میرزا ناطق مکرانی وغیرہ ان کے ہم طرح اور ہم عصر تھے۔ ان کا انتقال شوال ۱۲۹۶ھ (اکتوبر ۱۸۷۹ء) میں ۸۰ سال کی عمر میں ہوا۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے بے حد عشق تھا۔ میلاد شریف خوب پڑھتے تھے۔ اُن کے لکھے ہوئے میلاد آج بھی ہندوستان میں گھر گھر پڑھے جاتے ہیں۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں خوب کہتے تھے۔ اندازِ کلام ملاحظہ ہو۔

قدِ رعنا کی ادا؛ جامۂ زیبا کی پھبن | سرگیں آنکھ غضب، ناز بھری وہ چتون
وہ عمامے کی سجاوٹ، وہ جبینِ روشن | اور وہ مکھڑے کی تجلّی وہ بیاضِ گردن
وہ عبائے عربی اور وہ نیچا دامن | دلربایانہ وہ رفتار وہ بے ساختہ پن

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: خمخانۂ جاوید ج ۵/ ۱۱۲۔ نگارستانِ سخن/ ۲۴۴۔ تذکرہ محبوب الزمن/ جلد اول صفحہ ۵۷۰۔ تذکرہ روزِ روشن۔ علمائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں از انتظام اللہ شہابی/ ۲۸ داستانِ تاریخِ اردو از حامد حسن قادری۔ ایک نادر روزنامچہ (مولوی مظہر علی سندیلوی کی ڈائری مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی۔ وغیرہ وغیرہ۔

مردہ بھی دیکھے تو کر چاک گریبانِ کفن　　اٹھ چلے قبر سے بے تاب زباں پر یہ سخن

مرحبا سیّدِ مکّی مدنی العربی

دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

مفتی انتظام اللہ شہابی نے شہید کا سال وفات ۱۲۹۳ھ لکھا ہے لیکن محمد جان خاں حیرت کے قطعۂ تاریخ سے ۱۲۹۶ھ کی تصدیق ہوتی ہے وھو ہذا۔

"تاریخ وفات حضرت مولوی غلام امام شہید شاعر نامی الٰہ آباد"

حضرتِ مولوی غلام امام　　کہ جو دنیا کو جانتے تھے فضول
پنجشنبہ کے روز دنیا سے　　کر گئے کوچ بندۂ مقبول
اُن کے لوحِ مزار کو ہر ایک　　ڈھونڈھتا تھا کہ ہم چڑھائیں پھول
کالے ڈانڈے کی کھُل گئی تقدیر　　واں ہوا آفتابِ دیں کا نزول
فکر تاریخ سال میں اس کی　　دلِ حیرت جو ہو رہا تھا ملول

کہا ہاتف نے از سرِ امداد
دفن ہے یاں شہیدِ عشقِ رسول

۱+۱۲۹۵=۱۲۹۶ھ

اس سے ہماری معلومات میں اتنا اضافہ ہوا کہ شہید کا انتقال پنجشنبہ کے روز ہوا تھا اور ان کا مزار الٰہ آباد میں "کالے ڈانڈے" میں ہے۔

محمد جان خاں حیرت کا کلام معمولی درجے کا ہے اس لئے انتخاب یہاں نقل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

ادبیات

غزل

از

(جناب آثم مظفر نگری)

قصرِ ظلم و جور کی بنیاد مستحکم سہی
یوں نہ ہو کچھ بھی مگر اک نالۂ برہم سہی

کھینچ کے ساقی دل سے جو آتی ہے وہ کچھ اور ہے
تیرے شیشے میں جوابِ کوثر و زمزم سہی

رکھتی ہیں دل کو جوان ناکامیوں کی لذتیں
زندگی میں نامکمل میرا ذوقِ غم سہی

شامِ غم کی الجھنوں میں اس سے کیا بہلے گا دل
یہ گھٹا کالی کسی کا گیسوئے پُرخم سہی

فیضِ ساقی سے نہیں محرومِ بادہ کش کوئی
مے کدے میں مل ہی جاتی ہے اگرچہ کم سہی

مستیوں سے میرے غم خانے کی کیا نسبت اسے
مرکزِ بادہ پرستی بزم گاہِ جم سہی

امتحاں گاہِ وفا میں ہے یہ کیسی خامشی
اب حریفِ غم نہیں ہوتا کوئی تو ہم سہی

روحِ گلشن کو تو اس سے تازگی ملتی نہیں
زینتِ صحنِ گلستاں جلوۂ شبنم سہی

شغل کوئی چاہیئے اے پختہ کارانِ جنوں
نغمۂ عشرت نہیں تو نالہ و ماتم سہی

بے ادب سرکش پر اس کا ہو اثر ممکن نہیں
عبرت آموزِ بشر افسانۂ آدم سہی

آنسوؤں میں آئیں پیہم لختِ دل لختِ جگر
اور بھی اتنا کرم اے دیدۂ پُرنم سہی

تا سحر حاصل تو ہیں اس کو چمن کی راحتیں
بے حقیقت برگِ گل پر قطرۂ شبنم سہی

چادرِ خوں ہی کفن ہے کشتۂ غم کے لئے
ہم نے مانا پاک و طاہر چادرِ مریم سہی

میرے جامِ دل میں بھی اک آتشِ سیال ہے
اے آثم صہبائے کیف آور بہ جامِ جم سہی

تبصرے

"اعیان الحجاج"

تاریخ اسلام کے بلند پایہ حجاج | تالیف شیخ الحدیث مولانا الحاج حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، صفحات ۲۳۲، تقطیع ۲۰×۲۶

قیمت غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے، قیمت مجلد چار روپے آٹھ آنے، کتابت، طباعت نفیس پتہ:- مکتبۂ اعظمی مئوناتھ بھنجن (یوپی)۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ہمارے دور کے بلند پایہ عالم، جلیل القدر محدث اور عربی ادب کے باکمال استاذ سمجھے جاتے ہیں، اس لئے زیر نظر کتاب کے اعتبار و استناد کے لئے مولانا کا نام ہی کافی ضمانت ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، موصوف نے اس کتاب میں مشاہیر اسلام کے حالات حج و زیارت کو دل پذیر اسلوب میں یکجا کیا ہے، اسی کے ساتھ ان اکابر کے مختصر سوانح حیات اور سبق آموز واقعات بھی لکھے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ مسائل اور فضائل حج پر تو بے شمار کتابیں لکھی گئیں مگر اس موضوع پر کوئی مرتب و مستند کتاب ابھی تک وجود میں نہیں آئی تھی، مولانا نے اس کی ضرورت محسوس فرمائی اور تاریخ اسلام کے اکابر اور سلف صالح کے ایمان افروز حالات حج کو ہلکے، پھلکے پیرایہ میں جمع کر دیا، ان واقعات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ان بزرگوں نے اسلام کے اس پر عظمت رکن کا حق کس ولولہ و شوق سے ادا کیا اور اس سے کیسی روحانی برکتیں حاصل کیں،

سوانح اور واقعات حج کے علاوہ بہت سی تاریخی اور علمی معلومات کے اضافے سے کتاب کی افادیت اور قدر و قیمت بڑھ گئی ہے، اور اس سے نہ صرف زیارت حرمین سے مشرف ہونے والے ہی نفع اٹھائیں گے بلکہ اصحاب علم و نظر کے لئے بھی اس میں بہت کچھ ملے گا۔

بعض خاص اکابر کے حالات میں ضرورت سے زیادہ اختصار سے کام لیا گیا ہے مثلاً

امام احمد بن حنبل اور مشہور امام حدیث علی بن المدینی کہ ان دونوں حضرات کا تذکرہ صرف نصف صفحے میں ہے، مگر اس کی وجہ غالباً وہی ہے جس کا ذکر فاضل مؤلف نے مقدمے میں کیا ہے کہ "کہیں تو خود مواد کی کمی ہے اور کہیں نشاط کی" امید ہے دوسرے ایڈیشن میں یہ کمی باقی نہیں رہے گی، شروع میں چار صفحوں کی فہرست کے علاوہ جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خلیفہ ہارون رشید اور ان کی بیوی، زبیدہ خاتون اور نہر زبیدہ تک کے عنوان ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مختصر تعارف اور مؤلفِ گرامی کا مقدمہ بھی ہے جس سے مشتملاتِ کتاب پر خاص روشنی پڑتی ہے۔

ایک ایسے زمانے میں جبکہ دوسری عبادتوں کی طرح حج جیسی اہم عبادت بھی بڑی حد تک رسمی سی ہو کر رہ گئی ہے اس کتاب کا مطالعہ خاص طور پر عبرت آموز ثابت ہوگا اور اس کو پڑھ کر ہم عبادتِ حج کی نوک پلک درست کر سکیں گے، اس موقع پر حج کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ ارشاد رہ رہ کر یاد آرہا ہے

"آخری زمانے میں حاجیوں کی بڑی کثرت ہو جائے گی، سفر کی سہولتیں بڑھ جائیں گی، دولت کی فراوانی ہوگی، لیکن حالت یہ ہوگی کہ یہ حجاج اس طرح واپس ہونگے جیسے ایک محروم واپس ہوتا ہے، ایک شخص کی سواری اس کو ریگستانوں اور چٹیل میدانوں میں لے جائے گی حالاں کہ اُس کے گھر کا پڑوسی اُس کے پہلو میں مُقیّد ہوگا مگر وہ اُس کی غم خواری تک نہیں کرے گا" (ع س)

علیؓ اور اُن کی خلافت تقطیع خورد۔ ضخامت ۔۔ ۱۹ صفحات، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد صہ/ روپے۔ پتہ :۔ ملک دین محمد اینڈ سنز اشاعت منزل لاہور۔

اسلامی تاریخ میں مشاجراتِ صحابہ کا دورِ تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے بڑا صبر آزما ثابت ہوتا ہے۔ اور حضرت علیؓ بن ابی طالب کے عہدِ خلافت کی تاریخ خاص طور پر پیچیدگیوں سے پُر ہے۔ جناب پیام شاہجہاں پوری نے اس موضوع پر قلم اُٹھاتے ہوئے زمین کی سنگلاخی کا اندازہ کر لیا ہے اور امکانی طور پر روایات کی چھان بین میں احتیاط سے

کام لیا ہے۔ اور اس عہد کی تاریخ خالص تاریخی نقطۂ نظر سے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم کہیں کہیں عقیدت مندی تاریخ نویسی کے فرائض پر غالب آگئی ہے۔ یقیناً حضرت علیؓ جیسے بلند پایہ صحابی و خلیفۂ راشد کی ذات سے عقیدت مندی نہایت خوش آیند ہے لیکن حضرت معاویہؓ کی روش پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے انھوں نے تاریخ نویسی کے مقررہ اصول سے ہٹنا کیوں کر گوارا کر لیا؟ اس پر تعجب ہے۔ غالباً اس یک طرفہ عقیدت مندی کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ:۔ "اگر کسی شخصیت کے متعلق کوئی عقیدتمندانہ جملہ قلم برداشتہ لکھ دیا تو اس کی وجہ بھی یہ ہوگی کہ تاریخی واقعات نے اس شخصیت کے متعلق میرے دل میں عقیدت کا جذبہ پیدا کر دیا ہوگا۔ گویا پھر بھی بنیاد عقیدت نہ ہوئی بلکہ تاریخ ہوئی۔ (ص۱) کیا اچھا ہوتا کہ مؤلف اپنے عقیدت کے جذبہ پر قابو پا لیتے اور قلم برداشتہ جملوں پر صحیح تاریخ نویسی کی خاطر خط نسخ پھیر دیتے۔ پھر ان کا یہ دعویٰ بڑی حد تک صحیح ہوتا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے خالص تاریخی نقطۂ نظر سے لکھا ہے۔

کتاب میں بعض فروگذاشتیں بھی نظر آتی ہیں۔ حضرت علیؓ صلحنامہ حدیبیہ کے کاتب تھے، سریۃ الفلس کے امیر بھی آپ ہی تھے۔ قریش کے نام حاطب بن بلتعہ کا خط ایک عورت لے جارہی تھی اس کے تعاقب کرنے والوں میں بھی آپ کا نام آتا ہے۔ ان باتوں کا ذکر مؤلف نے نہیں کیا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود کتاب نہایت محنت سے لکھی گئی ہے اور اس قابل ہے کہ تاریخ کا مطالعہ

مآل بصیرت تقطیع خرد۔ ضخامت ۱۶۷ صفحات، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ملنے کا پتہ:۔ سنگم کتاب گھر اردو بازار دہلی۔

یہ مجموعہ ہے چند مضامین کا جن میں سے اکثر قرآن پاک کی کسی آیت یا کسی خاص لفظ کی تفسیر و تاویل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مضامین کے لکھنے والے جناب عطاء اللہ پالوی اس خاص طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، انکار حدیث و سنہ جس کا شیوہ بن چکا ہے بہرحال۔ فدیہ، حکمت، امی، آدم اور اسی طرز کے عنوانات پر کل دس مضامین ہیں

جن کی خصوصیت بقول مؤلف یہ ہے کہ "اس کے مطالعہ کے وقت غالباً ہر بات آپ کے سامنے نئی شکل میں آئے گی اور آپ دیکھیں گے کہ وہ اس سے قطعاً مختلف ہے اور ہوگی جو ہم اور آپ اُس کے بارہ میں اب تک سنتے اور ہر کتاب میں پڑھتے آئے ہیں"۔ مجموعہ میں جابجا مفسرین، محدثین اور صوفیہ کا تمسخر اڑایا گیا ہے جس کی توقع سنجیدہ اہلِ قلم سے نہیں کی جا سکتی۔ (معصومی)

"ہمدرد مطب" | افادات جناب حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۲۰۸ قیمت ایک روپیہ شایع کردہ ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

ملک کی تقسیم کے نتیجے میں جہاں دوسرے عجائبات کا ظہور ہوا اُن میں ایک عجوبہ "ہمدرد دواخانہ" کے کاروبار کی وُسعت و افادیت بھی ہے، یوں تو یہ دواخانہ کم وبیش پچاس سال سے قائم ہے لیکن تقسیم کے بعد سے ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ اس نامی، گرامی دواخانے کی خدمات کی وسعتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، ہندوستان میں جناب حکیم عبدالحمید صاحب اور پاکستان میں ان کے چھوٹے بھائی حکیم محمد سعید صاحب دواخانے کو جس قابلیت، محنت، سلیقے اور حُسنِ تدبر سے چلا رہے اور ترقی دے رہے ہیں اُس کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے ملک کے ان دونوں لائق فرزندوں نے اپنے ایثار اور صلاحیتِ کار سے طبِ یونانی کا نہ صرف نام روشن کیا ہے بلکہ اس کی جڑوں کو بھی جو گردشِ لیل ونہار سے اکھڑی سی جا رہی تھیں مضبوط کر دیا ہے۔ دواخانے کا پورا کاروبار وقف ہے اور اس کی آمدنی سے طب سے متعلق مختلف شعبوں کو ترقی دی جا رہی ہے اور جامعہ طبیہ جیسے ادارے بھی چلائے جا رہے ہیں۔

دواخانے کی وسعتوں اور ترقی پذیریوں کی طرح اب "ہمدرد مطب" کی وسعت و شہرت بھی غیر معمولی ہوگئی ہے، اس میں روزانہ سیکڑوں مریض آتے ہیں جن کا معائنہ ہمدردی اور احتیاط کے ساتھ کیا جاتا ہے، زیرِ تبصرہ رسالہ اسی مطب کا دستورِ علاج ہے جس کو محنت اور سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے اور تمام اہم امراض اور کثرت سے واقع ہونے والی بیماریوں کے معمولاتِ مطب

مع غذا و پرہیز اور ہدایات درج کئے گئے ہیں، "ہمدرد مطب" کی ترتیب نہایت دل پذیر ہے، اس میں امراض کے نام عربی یا فارسی، سنسکرت اور انگریزی تینوں چاروں زبانوں میں صحیح تلفظ کے ساتھ دیئے گئے ہیں پھر مرض کی تشریح و تفصیل اور اسباب مرض کی تشخیص کے بعد مختلف دوائیں تجویز کی گئی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ غذا اور پرہیز سے متعلق بصیرت افروز ہدایات بھی، "ہمدرد مطب"، عام مریضوں کے علاوہ نجی طور پر مطب کرنے والے طبیبوں کے لئے بھی ایک اچھے رہنما کا کام دے سکتا ہے اور اس طرح اس کی افادیت سے بے شمار مریض مستفید ہو سکیں گے۔

(ع ر)

ابوالکلام آزاد از جگن ناتھ آزاد ناشر ادارہ فروغ اردو لکھنؤ قیمت پچیس ۲۵ نئے پیسے

جگن ناتھ آزاد ہمارے دور کے نہایت ممتاز اور پختہ کلام شاعر ہیں، انھوں نے علامہ اقبال جیسے یگانہ روزگار سے نہ صرف فیض صحبت اٹھایا ہے بلکہ ان کی خصوصیات بھی اپنے اندر سمولی ہیں، بقول ڈاکٹر تاثیر مرحوم "جگن ناتھ کی وہی ادبی روایات ہیں جو غالب، اقبال، حسرت موہانی، جوش اور چکبست میں وجہ مشترک ہیں" تازگی اور سوز و گداز کے ساتھ ان کے کلام میں ایک عجیب طرح کا ادبی توازن پایا جاتا ہے جس سے ان کے شاعرانہ کمالات کا اندازہ ہوتا ہے میں ان کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتا ہوں،

عشق کے حضور میں سرخ رو تو ہو گئے — دامنِ حیات اگر تار تار ہے تو کیا

"ابوالکلام آزاد" ان کی تازہ ترین نظم ہے جو مولانا آزاد مرحوم کی وفات پر لکھی گئی ہے، نظم کا ایک ایک بند، اثر انگیزی اور جوشِ عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے، دو بند ملاحظہ ہوں۔

(۱) گرچہ اے دہلی! ترے دل میں دفینے ہیں بہت — تیرے ہر گوشے میں پوشیدہ خزینے ہیں بہت
تیری مٹی میں نہاں بے تاب سینے ہیں بہت — تو وہ دریا ہے کہ گم جس میں سفینے ہیں بہت
آج لیکن تجھ میں اک فخرِ زمن خوابیدہ ہے — پیکرِ صدق و صفا دعلم وفن خوابیدہ ہے

(۲) جس کی ساری داستاں تھی داستانِ علم و فن — جس کی موجِ نطق سے آباد تھا اپنا چمن
جس کو کہئے آبروئے شیخ و فخر برہمن — آج سوتا ہے تری مٹی میں وہ نازِ وطن
نور سے معمور اک ہیرا ترے دامن میں ہے — جس نے ظلمت کا جگر چیرا ترے دامن میں ہے

(باقی)

بُرہان

جلد ۴۱ شمارہ ۳

ستمبر ۱۹۵۸ء مطابق صفر المظفر ۱۳۷۸ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اس مرتبہ یوم آزادی کے موقع پر صدر جمہوریۂ ہند نے جہاں سنسکرت کے چار بڑے فاضلوں کو ایک خاص اعزازی سند سے نوازا ہے ان کے ساتھ ہی ہمارے مخدوم ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کو بھی عربی کے ایک نامور فاضل و محقق کی حیثیت سے یہ اعزاز عطا فرمایا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی ٹھوس استعداد اور بلند پایہ علمی تحقیقات و وسعت نظر کی بنا پر نہ صرف ہند و پاک میں بلکہ باہر کے علمی حلقوں میں بھی مشہور ہیں، موصوف نے فن حدیث پر جو مستقل تحقیقی کام کیا ہے اس کے کچھ حصے اردو اور عربی میں شائع ہو چکے ہیں۔ آج کل وہ ان سارے کاموں کو ایک ضخیم کتاب کی شکل میں انگریزی زبان میں مرتب کر رہے ہیں، ان کی کتاب "عربی و فارسی میں طبی ذخیرۂ ادبیات کا مطالعہ" جو اُن کی سالہائے دراز کی تحقیق و مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ چند روز میں پریس میں جانے والی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا جتنا وقار پبلک میں ہے گورنمنٹ میں بھی ہے اسی وجہ سے ۱۹۵۱ء میں جو انٹرنیشنل اورنٹیل کانفرنس استنبول میں منعقد ہوئی تھی ڈاکٹر صاحب نے اس میں حکومت ہند کی نمائندگی کی تھی۔ یہ اعزاز اب ہر سال ہی کسی نہ کسی کو ملتا رہے گا لیکن ڈاکٹر صاحب آزاد ہندوستان میں سب سے پہلے شخص ہیں جن کو صدر جمہوریہ نے عربی میں علمی فضیلت کی بنا پر اردو میں ایک سند خاص عطا فرمائی ہے اور ساتھ ہی ۱۵۰۰ روپے سالانہ کا وظیفہ اور ایک خلعت بھی عطا فرمایا ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

حافظ علی بہادر خاں اردو زبان کے پرانے صحافی اور دیرینہ قومی کارکن ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے ساتھ بھی آپ کو خاص قرب رہا ہے۔ موصوف نے ماہنامہ "آج کل" بابت اگست ۱۹۵۸ء کی اشاعت "ابو الکلام نمبر" میں ایک مضمون لکھا ہے جس میں صفحہ ۸۶ پر وہ کہتے ہیں کہ

"ایک جگہ میں نے اسلامی کلچر" کا جملہ استعمال کیا۔ بین السطور میں مولانا ابو الکلام نے اپنے قلم سے لکھ دیا۔ بشرطیکہ اسلام جیسے عالمگیر مذہب کا کوئی کلچر ہو" اس پر میں نے جب مولانا سے گفتگو کی تو یہ پایا کہ ان کی رائے میں اسلام کا کوئی مخصوص کلچر نہیں ہے مختلف ممالک کے لوگوں کے مختلف کلچر ہوتے ہیں اور مختلف زمانوں میں کلچر بدلتے

رہتے ہیں مگر ان مختلف ممالک کے لوگوں اور مختلف زمانوں کے لئے اسلام ایک ہی رہتا ہے۔ لہٰذا اسلام کا کوئی مخصوص کلچر نہیں ہو سکتا وہ (ابو الکلام) یہ بھی فرماتے تھے کہ کلچر ایسا نعرہ ہے جس کی کوئی تعریف نہیں کی جاسکتی اور مختلف ملکوں میں مختلف مفکرین نے اس کا استعمال مختلف معنی میں کیا ہے"

اس عبارت میں حافظ صاحب نے مولانا آزاد کی نسبت اسلامی کلچر کے متعلق ان کی جو رائے ظاہر کی ہے وہ سخت مغالطہ انگیز اور خاص طور پر مسلمانان ہند کے لیے جو دن رات اسلامی کلچر اور اسلامی ثقافت کے تحفظ و بقا کے لئے کوشاں ہیں شدید الجھن کا باعث ہو سکتی ہے، یہ کہنا کہ سرے سے اسلام کا کوئی کلچر ہی نہیں ہے مذہب اور تاریخ کے ان تمام مسلمات سے اغماض کر لینا ہے جن پر ارباب فکر و نظر کا اب تک اتفاق رہا ہے اور جس کو خود قرآن نے بار بار بڑی تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے اس بنا پر ہم کو یقین ہے کہ حافظ صاحب نے مولانا کی رائے ادھوری نقل کی ہے۔ گفتگو میں یقیناً مولانا نے اصل معاملہ کے سب پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہوگی اور اس سے حقیقت واضح ہوگئی ہوگی ہم جناب حافظ صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ان کی مولانا سے جو مفصل گفتگو ہوئی تھی اس کو ایک مضمون کی شکل میں مرتب کر کے شائع فرمادیں برہان کے صفحات اس خدمت کے لئے حاضر ہیں۔

جب سے وزیر اعظم جواہر لال نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں اردو زبان کے متعلق ایک پرجوش تقریر کی اور ساتھ ہی کانگریس ورکنگ کمیٹی میں اردو سے متعلق ایک نہایت اہم اور تاریخی ریزولیوشن منظور کیا ہے اردو کے متعلق ملک کی عام فضا بہت کچھ امید افزا نظر آتی ہے۔ اگرچہ اسی صوبہ میں اردو کو علاقائی زبان ہونے کا شرف تو اب تک عطا نہیں ہوا اور ۲۲ بائیس لاکھ کے دستخطوں سے جو میمورنڈم صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اب تک اس کا بھی کوئی جواب نہیں ملا ہے تاہم ۱۴ر جولائی ۱۹۵۸ء کو مرکزی وزارت داخلہ کی طرف سے جو پریس نوٹ شائع ہوا ہے اس نے اردو کی آئینی اور قانونی حیثیت واضح اور مضبوط کر دی ہے اس نوٹ کا پہلا اثر تو اتر پردیش کی حکومت پر یہ ہوا ہے کہ اس نے یوپی کے سات مغربی اضلاع کی زبان اردو کو تسلیم کر لیا ہے حالاں کہ پہلے یہ گورنمنٹ سرے سے اردو کے وجود کی قائل ہی نہیں تھی اس کے علاوہ اتر پردیش گورنمنٹ نے اپنے مختلف ماتحت محکموں کو بھی ہدایات جاری کی ہیں کہ وزارت داخلہ کے پریس نوٹ کا لحاظ کیا جائے اور صرف یہی نہیں بلکہ پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر تعلیم ڈاکٹر شری مالی نے صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کے نام جو خطوط بھیجے ہیں انہیں بھی اس پریس نوٹ کے مطابق عمل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پریس نوٹ کی اصل اسپرٹ کے مطابق اس کی ہدایات پر سچائی اور ایمانداری

سے عمل ہو تو اردو والوں کے مطالبہ کا منشا ایک حد تک پورا ہو جائے گا۔

تقسیم ہند کے مصائب میں سے ایک مصیبت یہ رونما ہوئی ہے کہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی اور ان کے املاک پر غارت گری کرنے والوں کی بن آئی ہے اور زندگی کا کوئی گوشہ اس سے محفوظ نہیں۔ ناشرینِ کتب کی جماعت جو اشاعتِ علم جیسی مقدس ذمہ داری کی حامل ہوتی ہے افسوس ہے کہ وہ بھی اس وبائے عام کا شکار ہو چکی ہے۔ چناں چہ ہندو پاکستان میں، ایک ملک میں دوسرے ملک کے مصنفین کی کتابیں بغیر ان کی اجازت کے دھڑلے کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں۔ اخلاقی نقطہ نظر سے تو یہ حرکت افسوس ناک ہے ہی علمی اعتبار سے بھی اس کا الم انگیز نتیجہ یہ ہے کہ علمی ترقی کی رفتار رکتی نظر آ رہی ہے اور اس سلسلہ میں جدید کوشش و کاوش کا دروازہ بند ہوتا معلوم ہو رہا ہے۔

یہ افسوس ناک صورت حالات کئی سال سے جاری ہے۔ ہندوستان کے بعض زخم خوردہ مصنفین نے اس سلسلہ میں پاکستان کے اربابِ حکومت کو توجہ دلائی تو ان کا جواب یہ تھا کہ دفعات کے تحت قانونی چارہ جوئی کی جائے۔ اس جواب سے اتنی بات تو صاف ہو گئی کہ ایک ہندوستانی مصنف یا ادارہ کسی پاکستانی پبلشر کی غارت گری کے خلاف ذاتی طور پر قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے مگر ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں اپنے ملک کی حدود کو پار کر کے دوسرے ملک میں قانون و انصاف کے دروازہ کو کھٹکھٹانا کس قدر مشکل ہے۔

اخبار اسٹیٹس مین کی ایک اطلاع سے یہ معلوم ہو کر مسرت ہوئی کہ حکومت ہند کی سائنٹفک ریسرچ اور کلچر کی وزارت نے اس علمی و اخلاقی انارکی کو ختم کرنے کے سلسلہ میں پہل کی ہے اور حکومت پاکستان کو کچھ تجاویز ارسال کی ہیں ان تجاویز کا خلاصہ یہ ہے

(۱) دونوں ملکوں کے مابین ایک ایسا معاہدہ عمل میں آئے جس سے ایک ملک میں دوسرے ملک کے مصنفوں شاعروں اور ادیبوں کے کاپی رائٹ کا تحفظ کیا جا سکے۔ (۲) اس معاہدے کی رو سے دونوں ملکوں کی حکومتیں ایسے لوگوں پر مقدمہ چلانے اور ان کو سزا دلوانے کی ذمہ دار ہوں جو کاپی رائٹ کے قانون کی خلاف ورزی کریں۔ (۳) جرم ثابت ہو جانے پر مجرموں پر جرمانہ بھی کیا جائے اور یہ رقم ان مصنفوں کو ادا کی جائے جن کی حق تلفی کی گئی ہو حکومت ہند نے یہ تجاویز پیش کر کے اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے اب حکومت پاکستان کا فرض ہے کہ وہ کشادہ دلی کے ساتھ ان تجاویز کو منظور کر کے اپنا دینی و اخلاقی فرض ادا کرے۔

معاصر "مدینہ" کی اس رائے سے ہمیں اتفاق ہے کہ "ہندوستان اور پاکستان کے اخبارات و رسائل کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے قلم کی پوری طاقت کے ساتھ میدان میں آئیں اور: (۱) مجرم پبلشروں کے اس ظلم کے خلاف پر زور احتجاج کریں۔ (۲) اپنے مقالات کے ذریعے ایسے پبلشروں سے عوام کو متنفر کریں (۳) اپنے اخبارات

اسلام کا نظامِ امن و امان

از
(مولانا محمد ظفیرالدین صاحب دارالافتاء دارالعلوم دیوبند)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ فرمائیے برہان بابتہ ماہ جولائی ۵۸ء)

اسلام میں سزائیں | اسلام میں دو طرح کی سزائیں ہیں، ایک کی تعبیر "حدود" کے نام سے کی جاتی ہے، اور دوسرے کی "تعزیر" سے، حدود ان سزاؤں کے نام ہیں جن کی سزائیں قرآن واحادیث میں صراحت کے ساتھ متعین ہیں، اور تعزیر امام وامیر کی رائے پر محول ہوا کرتی ہے، تعیین صراحت کے ساتھ وارد نہیں ہوتی۔

قصاص حدود میں سے ہے، یعنی یہ سزا رب العزت کی متعین کردہ ہے، کہ قاتل کو جرم کے ثبوت یا اقرار کے بعد قتل کردیا جائے، اس سزا میں کسی انسان کے لئے جائز نہیں ہے کہ اپنی طرف سے ردّ و بدل کردے، خواہ امیر المؤمنین ہو یا اس کا نائب، بلکہ وہ اسی سزا کے اجرار پر مجبور ہے، اگر وہ قانونی دائرہ میں رہ کر ایسا نہیں کرتا، تو عنداللہ خود مجرم ہے۔

اس وضاحت کے بعد یہ بات بڑی آسانی سے ذہن نشین ہو سکتی ہے، کہ یہ سزا اپنی جگہ بالکل درست اور جرم کے عین مطابق ہے، کیوں کہ یہ مسلّم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و دانائی اور اس کے علم سے بڑھ کر کسی اور کا علم و فہم کب ہو سکتا ہے، آگے یہ بات بھی ثابت کی جائے گی کہ یہ سزا عقل و خرد کے بھی بالکل مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا احسان | یہاں پہلی بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ سزا کی تعیین رب العزت کا بڑا احسان ہے، کہ اس نے ہمیں اس بار سے سبکدوش رکھا، اور ہماری عقل کو امتحان میں نہیں ڈالا، ورنہ ممکن تھا اس سلسلہ میں ہم سے لغزش ہو جاتی اور یہ مسئلہ فیما بین الناس

باعثِ نزاع بن جاتا، جیساکہ اس دور میں دیکھا جا رہا ہے۔

اس کا بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ قاتل اور اس کے حامیوں کے دلوں میں حاکموں کی طرف سے نفرت و انتقام کا جو جذبہ پرورش پا سکتا تھا، وہ سرے سے ختم ہو گیا، اور اپنی جگہ وہ اس سلسلہ میں ساری تگ و دو سے بچ گیا۔

اس طرح کی سزاؤں کے اجراء کے سلسلہ میں جو اسلامی قوانین ہیں، وہ سراپا رحمت ہیں، جس کی تفصیل اپنے اپنے موقع پر آئے گی۔

سزائیں اور جرائم | اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ دنیاوی سزائیں جرم کے سلسلہ میں اس قدر ٹھوس اور محکم بنیاد پر قائم ہیں کہ کہیں سے ان میں خامی اور کمزوری کا نام و نشان تک نہیں ہے، اور ان کے اجراء کے بعد غیر ممکن ہے کہ جرم کی رفتار باقی رہے، اس لئے کہ رب العالمین نے ہر ایک جرم کی سزا اس طرح متعین کی ہے، کہ وہ اپنی جگہ بالکل فٹ اور مناسب ہے، اور ساتھ ہی انسانی نفسیات کے مطابق، اسی طرف حافظ ابن القیمؒ نے اشارہ کیا ہے

ورتب علی کل جنایۃ ما یناسبھا	ہر جرم کی سزا بالکل اس کے مناسب تجویز کی
من العقوبۃ ویلیق بھا من	گئی ہے جو اس کے لئے بالکل درست ہے،
النکال (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۸۲)	

قتل کی شناعت جرائم میں | جرائم کی فہرست سامنے رکھی جائے، اور سوچا جائے، کہ کسی کو ناحق قتل کرنا، کتنا بڑا جرم ہے، اگر یہ جرم تمام جرائم میں عقل کے نزدیک عظیم تر معلوم ہو، کہ قاتل نے واقعی اپنے اس ناجائز فعل سے ملک کے امن و امان کی دیوار میں شگاف ڈالا ہے، ملک میں خوف و ہراس پھیلانے کا ذریعہ بنا ہے، ساتھ ہی اس کے اس برے فعل نے مقتول کے وارثوں کو نقصان پہنچایا ہے، اس کے احباب کی بزم سونی ہوئی ہے، اس کے گھر میں ویرانی آئی ہے، اور ان سب سے بڑھ کر ملک کی ایک قیمتی جان مفت ضائع گئی ہے،

جس سے ممکن تھا قوم وملک کو مستقبل میں بے حد فائدہ پہنچتا، —— تو پھر دیکھنا چاہیئے کہ کیا اس کی سزا جو اسلام نے مقرر کی ہے، اس میں کوئی افراط وتفریط ہے؟

یقین کے ساتھ یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس سلسلہ میں اسلام نے جو سزا متعین کی وہ ہر پہلو سے درست ہے، اور ذرہ برابر اس میں کوئی افراتفری نہیں ہے، اگر اس جرم عظیم کی یہ سزا نہ ہوتی تو البتہ حیرت ہوتی۔

اجرار قصاص کے شرائط | اسلام کا قانون یہ ہے کہ قصاص کا اجرار ہر ایک کے لئے جائز نہیں ہے بلکہ یہ معاملہ اسلامی حکومت کے ہاتھ میں ہے اور حکومت بھی اس وقت اس کا اجرار کرے گی، جب معاملہ کی وہ پوری تحقیق کرے اور ثبوت یا اقرار سے قاتل کا جرم اس طرح ثابت ہو جائے، کہ اس میں کوئی اشتباہ باقی رہنے نہ پائے، ساتھ ہی اس کے نافذ کرنے میں کوئی امر شرعی مانع نہ ہو۔

مختصر یہ کہ کتاب وسنت کی روشنی میں جب قاتل کا قتل کرنا ثابت ہو جائے، اور عدالت اس سلسلہ میں دوٹوک فیصلہ سنا دے، تو اس وقت پھر کوئی طاقت قاتل کو قصاص سے نہیں بچا سکتی ہے۔

ولی مقتول کے اختیارات | قاتل کے قتل کا جب فیصلہ سنا دیا جائے گا، تو اس وقت مقتول کے ولی کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ خود تلوار ہاتھ میں لے اور قاتل کو اپنے ہاتھ سے قتل کر کے تسکین خاطر حاصل کرے، یا پھر اگر وہ کسی وجہ سے خود قتل کی جرأت نہیں کر سکتا ہے تو کسی اور کے اس معاملہ کو سپرد کر دے، کہ وہ اس کی طرف سے قاتل کے قتل کا فریضہ ادا کرے۔

ولہ ان یقتل بنفسہ وبنائبہ بان یامر غیرہ بالقتل لان کل احد لا یقدر علی الاستیفاء بنفسہ اما

اس (ولی مقتول) کو حق ہے کہ خود قتل کرے یا اپنے نائب کے ذریعہ سے اس طرح کہ وہ اپنے سوا کسی اور کو اپنی طرف سے قتل کرنے کا حکم دے

لضعف بدنه او لضعف قلبه اولقلة هدايته اليه فيحتاج الى الانابة الا انه لابد من حضوره عند الاستيفاء (بدائع الصنائع ج۷، ص۲۴۶)

کیوں کہ ہر شخص بذاتِ خود اس طرح قتل پر قدرت نہیں رکھتا ہے، اس کی کئی وجہیں ہوتی ہیں، کبھی بدن یا قلب کے ضعف کا نتیجہ ہوتا ہے اور کبھی اس سلسلہ کی معلومات حاصل نہ ہونا، ایسی حالت میں نائب بنانا ناگزیر ہوگا، لیکن اتنا پھر بھی ضروری ہے کہ وہ قتل کرنے کے وقت خود موجود رہے۔

شبہات اور اس کے جوابات | قصاص کے سلسلہ میں جن لوگوں نے یہ اشکال پیش کیا ہے، کہ خوں ریزی قتل کے ذریعہ کیوں کر بند ہوسکتی ہے، اس کے جواب میں حافظ ابن القیمؒ نے بڑی عمدہ بات لکھی ہے، کہ عقل کے پتلوں نے اس مسئلہ کے تمام پہلو پر غور نہیں کیا ہے، اس لئے ان کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا، اور وہ شبہات و شکوک کے دلدل میں پھنس گئے۔

اس سلسلہ میں پہلا سوال یہ ہے کہ قتل و خوں ریزی کے مجرمین کو ان کی سزا دینا، عقل اور شہری حقوق کا تقاضا ہے یا نہیں، اور اس طرح امن و امان کی بحالی حکومت کا فریضہ ہے یا نہیں؟ اگر جواب میں یہ کہا جائے کہ سزا دینا اور امن و امان کا قایم رکھنا ضروری نہیں ہے، تو دنیا کا کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی اس جواب کو ایک لمحہ کے لئے تسلیم نہیں کرسکتا ہے، کیوں کہ جرائم ہوں اور ان کی سزائیں نہ دی جائیں، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ملک کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے، اور پبلک کے لئے سکون و آرام حرام قرار دے دیا جائے، کسی کی جان اور عزت محفوظ نہ رہ سکے، اور زندگی وبال بن جائے۔ —

—— اور اگر یہ کہا جائے کہ جرائم کی سزا ضروری ہے، اور اس کے بغیر چارۂ کار نہیں، تو اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ جرم کی سزا کس نوعیت کی ہو، یا صرف خانہ پوری کے لئے ہو، یا جرائم کے بند کرنے کے لئے ہر صحیح العقل کا جواب یہ ہوگا، کہ سزا ایسی ضرور ہونی چاہئے، جو باعثِ عبرت ہو، اگر ایک طرف خود مجرم کو جرم کے ارتکاب سے روک سکے

تو دوسری طرف دوسرے اسے دیکھ کر اس طرح کے جرائم کے ارتکاب کی جرأت نہ کرسکیں، تاکہ امن وامان بحال رہ سکے، اور پبلک اطمینان کی زندگی گذار سکے۔

ملکی مفاد کی حیثیت | اتنی بات جب واضح ہو چکی کہ جرم کی سزا ضروری ہے اور سزا بھی ایسی کہ وہ باعث عبرت ہو، اور جرم کو روکنے والی، تو اب یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے، کہ قوم و ملک کے امن وامان کی خاطر مجرم کا شخصی نقصان برداشت کرنا ضروری ہے خواہ یہ نقصان جانی ہو، یا مالی، پھر وہ کسی خاص عضو کا ہو، یا پورے جسم کا۔

اس بات پر دنیا کے سارے عقلاء متفق ہیں کہ ملکی مفاد کے لئے شخصی نقصان ناگزیر طور پر برداشت کیا جائے گا، کسی سرپھرے کو ملک میں اودھم مچانے اور بغاوت کی اجازت نہیں دی جائے گی، اگر کوئی احمق اس کے خلاف کہتا ہے تو اسے خود اپنی حماقت پر ماتم کرنا چاہیئے۔

سزا کی نوعیت | اب ایک چیز اور قابلِ غور رہ گئی، وہ یہ کہ کیا یہ درست ہوگا کہ جرائم متفاوت ہوں، اور سزائیں سب کی ایک، یا جرائم ایک سے ہوں اور اس کی سزائیں متفاوت، یا پھر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ سزا جرم کے مطابق ہو، اگر کوئی یہ کہے کہ متفاوت جرائم کی سزائیں ایک سی ہوں، تو ایک احمق بھی یہ سن کر چیخ اٹھے گا، کہ یہ حکمت و انصاف کے بالکل منافی ہے، اسی طرح جرائم سب کے ایک ہوں اور ان کی سزائیں باہم متفاوت جیسا کہ انگریزوں کے دورِ حکومت میں تھا کہ ایک ہی جرم، اگر کوئی ہندوستانی کرے تو قابل گردن زدنی اور انگریز کرے تو قابل عفو و درگذر، تو کون سلیم الطبع کہہ سکتا ہے کہ یہ عدل و مساوات کے خلاف نہیں ہے۔

لے دے کر ماننا پڑے گا کہ تقاضائے انصاف یہی ہے کہ جیسا جرم ہو، اسی کے مطابق اس کی جچی تلی سزا بھی دی جائے، جس میں کسی کے ساتھ کوئی رو رعایت کا معاملہ نہ کیا جائے، چنانچہ شریعت کا یہی فیصلہ ہے کہ سزا جرم کے مطابق ہو، اور قانون میں

امیر و غریب، شاہ و گدا، شریف و کمینہ، اور اونچ نیچ کی کوئی تمیز نہ ہو، بلکہ جو بھی جرم کا ارتکاب کرے اسے قرار واقعی سزا دی جائے۔

قصاص عقل کی روشنی میں | جان بوجھ کر جو شخص کسی کو قتل کر ڈالے اس کی سزا اسلام نے قصاص تجویز کی ہے، جس کی تفصیل گذر چکی، یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ قتلِ عمد کی سزا جو قصاص تجویز کی گئی ہے، وہ کس حد تک مناسب ہے، اس سلسلہ میں حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں

اسلام نے سزائیں جرم کے اندازہ سے مقرر کی ہیں، جس میں دُرّے سے لے کر قتلِ نفس تک کی سزائیں ہیں، چنانچہ جب جرم اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور اس جرم کی قباحت حد سے بڑھ جاتی ہے، تو ایسے موقع سے اسلام اتلافِ جان کی سزا تجویز کرتا ہے جیسے کوئی کسی کو ناحق قتل کر ڈالے، یا کوئی مسلمان دینِ حق سے پھر جائے، یا ایسے جرم کا ارتکاب کرے، جس کا ضرر غیر محدود ہو تو ان صورتوں میں مجرم کی سزا یہی اتلافِ جان ہوتی ہے۔

جن ظاہر بیں نگاہوں میں یہ سزا باعثِ مفسدہ ہے، ان کو غور کرنا چاہیئے کہ یہ مفسدہ بہر حال محدود ہے لیکن اس سے متعلق جو مصلحتیں اور فوائد ہیں، وہ اس مفسدہ سے گوناگوں بڑھے ہوئے ہیں، جس کی طرف قرآن نے اپنے معجزانہ انداز میں اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ — اور تمھارے لئے قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقلمند تاکہ تم بچتے رہو۔

قصاص طہارت ہے | یعنی اگر قصاص کا خدائی قانون نہ ہوتا، تو پورا عالم تہس نہس ہو جاتا، اور انسان بعض بعض کو موت کے گھاٹ اُتارنے میں ذرہ برابر دریغ نہ کرتا، کوئی اقدامی حملہ کرتا اور کوئی ردِّ عمل کے نام پر، قصاص کا قانون دراصل انھی اقدامی اور ردِّ عمل کی خوں ریزی سے پیدا ہونے والے مفاسد کا سدِّ باب ہے[1]، لہٰذا جن لوگوں نے اپنی کوتاہ نظری اور غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ قصاص کی مثال "ازالۃ النجاسۃ بالنجاسۃ" کی ہے، ان کی عقل پر

[1] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۸۵

پردہ پڑا ہوا ہے ورنہ وہ ایسی بات ہرگز نہ کہتے، کیوں کہ قصاص دراصل اس نجاست کی پاکیزگی ہے، جو جرم کے ارتکاب سے پیدا ہوتی ہے۔

انسان کے مفاد کے لئے جانوروں کا ذبیحہ

اتلافِ جان کی یہی ایک صورت نہیں ہے کہ احمقوں کی جماعت اسے دیکھ کر چیخنے لگتی ہے، آخر کیا حیوانات کے اندر جان نہیں ہے، ہے اور یقیناً ہے، جس سے دنیا کا کوئی صحیح العقل انکار نہیں کر سکتا ہے، مگر با ایں کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بہت سے جاندار انسان کی راحت اور اس کی مصلحت کی خاطر بے دردی سے ذبح کر دئے جاتے ہیں اور نہ کوئی بھی اسے برا نہیں سمجھتا بلکہ وہ اپنا انسانی حق سمجھتا ہے، حالاں کہ اس صورت میں بھی جاندار کی جانوں کا اتلاف ہی ہے۔

بات وہی ہے کہ چوں کہ جانوروں کے ذبح سے جو فوائد متعلق ہیں، وہ کئی گنا اتلافِ جان سے بڑھے ہوئے ہیں، پھر یہ کیا ظلم ہے کہ اسلام جب کہتا ہے کہ صالح افراد اور ملکی امن وامان کی بقا کی خاطر مجرم کو قتل کر دیا جائے تو کچھ لوگوں کو یہ مسئلہ قابلِ اعتراض نظر آنے لگتا ہے، اور وہ مجرمین کو بے گناہ صالح افراد کے برابر منوانے کے لئے حماقت سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، حالانکہ سب یہ جانتے ہیں کہ قوم و ملک کی خوش گوار زندگی کا دارومدار ملکی امن وامان پر ہی ہے، اگر ایسا نہ کیا جائے تو زمین باوجود وسعت کے اہل زمین پر تنگ ہو جائے۔

کیا کسی کو اس کی اجازت دینا مناسب ہوگا کہ ملک میں قتل وخون کر کے خوف وہراس پھیلائے، اور اس کو قرار واقعی سزا نہ ملے، یہ بھی کوئی عقلمندی ہے کہ شخصی مفاد کی وجہ سے جماعت کے مفاد کو نظرانداز کر دیا جائے۔

قاتل کی زیادتی

پھر قاتل نے جس جان کو موت کے گھاٹ اتارا ہے، اس کے متعلق کبھی آپ نے غور کیا کہ اس کی قدر وقیمت اللہ تعالیٰ کی نظر میں کیا ہے اور قاتل کس قدر معتوب، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الآدمی بنیان الرب ملعون	انسان اللہ تعالیٰ کی ایک مضبوط دیوار ہے،
من ھدمہ	ملعون ہے وہ جو اسے ڈھائے۔

خود مجرم کو بھی اپنی جگہ سوچنا چاہیئے کہ جب اس کے جرم کی وجہ سے قوم و ملک کا اطمینان و سکون پامال ہو رہا ہے، امن و امان کی مٹی پلید ہو رہی ہے، اور ملک کا حسین چہرہ داغدار ہو رہا ہے، تو وہ پہلے بذاتِ خود اس سے کنارہ کش ہونے کی سعی بلیغ کرے، لیکن اگر وہ کامیاب نہ ہو، اور حاکم کے پاس اس کا جرم ثابت ہو جائے تو اس سلسلہ میں سرِ تسلیم خم کر دینے میں کوئی ایسی بات نہ کرے، جس سے ملک کے وقار کو نقصان پہنچ سکے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جن ملکوں میں قصاص کا قانون باقی نہیں رکھا گیا، یا اس میں نرمی اور پہلوتہی سے کام لیا گیا، اس ملک کا سکون و اطمینان غارت ہو کر رہ گیا، اور امن و امان کا آفتاب گہن میں آگیا۔

اجرائے قصاص میں کوتاہی اور سفارش

یہی وجہ ہے کہ اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ اجماعِ امت ہے کہ جرم کے ثابت ہو جانے کے بعد سزا کے اجراء میں ذرا بھی کوتاہی نہ کی جائے، ورنہ کوتاہی کرنے والے بھی مجرم کے خانے میں آجائیں گے،

ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص کی اہمیت جتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا

من قتل عمداً فھو قود ومن حال	جو شخص عمداً قتل کرے اس میں قصاص ہے اور جو
دونہ فعلیہ لعنۃ اللہ وغضبہ	اس باب میں حائل ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت
لا یقبل منہ صرف ولا عدل	اور اس کا غضب ضروری ہے، نہ اس سے
ابو داؤد والنسائی	اس باب میں فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ کوئی
(جمع الفوائد ج ۱ ص ۲۷۶)	سفارش۔

قصاص کے اجراء میں جو مانع بنے وہ اسلام کی نظر میں سخت مجرم اور قابلِ ملامت

ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!

من حالت شفاعتہٗ دون حدٍ من	جس کی سفارش اللہ کے حدود میں سے کسی حد میں
حدود اللہ فقد ضاد اللہ فی	مانع بنے (تو وہ ایسا ہے) کہ اس نے اللہ تعالیٰ
حکمہٖ رواہ ابوداؤد (مشکوٰۃ)	کے فیصلہ میں اس کی مخالفت کی۔

قصاص صحابۂ کرام کی نظر میں یہ اور اس طرح کی دوسری حدیثیں بکثرت ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب معاملہ ثابت ہو جائے تو پھر اس سلسلہ میں سفارش یا کسی اور ذریعہ سے اجرار قصاص کو ہرگز روکنے کی سعی نہ کرنی چاہیئے۔ عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ میں اس باب میں کسی طرح کی رو رعایت جائز نہیں تھی، حضرت سعید بن المسیبؓ کا بیان ہے کہ صنعاء میں ایک شخص کو کئی آدمیوں نے مل کر قتل کر ڈالا، تفتیش سے سات آدمی شریک ثابت ہوئے، تو حضرت فاروق اعظمؓ نے ان ساتوں کو قتل کر ڈالا۔ اور فرمایا کہ اگر تمام اہلِ صنعاء اس خون میں شریک ہوتے، تو بلا شبہ ان تمام کو اس ایک کے بدلے میں قتل کر ڈالتا[1]

بخاری کے الفاظ یہ ہیں

لو اشترک فیہ اھل صنعاء لقتلتھم	اگر اس میں تمام اہل صنعاء شریک ہوتے تو بلا
(بخاری ج ۲ ص ۱۰۱۰)	شبہ میں ان تمام کو قتل کر ڈالتا

انسانی جان کی حفاظت حکومت کے ذمہ کس قدر ضروری ہے صرف اسی ایک واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اور اسی سے قصاص کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتنی اہم اور بنیادی چیز ہے، کہ ایک جان کے لئے فاروق اعظمؓ جیسے مدبّر اور دور اندیش فرمانروا اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر اس ایک جان کی قصاص میں صنعاء کی پوری آبادی شریک ہوتی، تو وہ سب کی سب قتل کر دی جاتی۔

---

[1] موطا امام مالک

عدمِ قصاص کا انجام ہمارے اس دور میں لاکھوں بے قصور جانیں تہ تیغ ہوتی رہتی ہیں مگر کوئی قاتل سے نہیں پوچھتا کہ تو نے یہ جرأتِ بے جا کیوں کی، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ قتل وخوں ریزی کی وارداتیں دن بدن بڑھتی ہی جارہی ہیں۔

کون نہیں جانتا ہے کہ انسانی طبائع کچھ اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ وہ موقع پاکر ظلم وزیادتی سے نہیں چوکتے، اور اسی طرح اپنے غصہ کی تیزی اسے برداشت نہیں ہوتی، وہ پاگل بن جاتا ہے، اور بسا اوقات معصوم جان کے قتل سے اپنے ہاتھوں کو رنگین کرلیتا ہے تو کیا ایسے موقع پر عقل کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ظالم کو ظلم کا بدلہ اور اس کی سزا ملے۔ اگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر قصاص ودیت کے مسئلہ میں کسی کو تردد کیوں ہوتا ہے۔

قاتل کے لئے رحم وکرم کی گنجائش اسلام کے قانونِ قصاص میں رحم وکرم کی گنجائش ہے، مگر یہ مقتول کے ولی کی صوابدید پر موقوف ہے، اگر وہ راضی ہوجائے، اور قاتل کے قصاص سے درگذر کرے اور دیت قبول کرلے، تو اس صورت میں حکومت قاتل کی جان بخشی کرسکتی ہے یا سرے سے ولیِ مقتول معاف کردے، نہ قصاص لے اور نہ دیت، تو اس صورت میں بھی جان بخشی کی گنجائش ہے، قرآن پاک میں جہاں قصاص کا تذکرہ ہے، وہیں یہ بھی ذکر ہے۔

فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ	پھر جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ تو
بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۤءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ	تابعداری کرنی چاہئے دستور کے موافق اور ادا کرنا چاہئے
ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ	اس کو خوبی کے ساتھ یہ آسانی ہوگی تمہارے رب کی طرف
فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ	سے اور مہربانی پھر جو زیادتی کرے اس فیصلہ کے بعد تو اس
عَذَابٌ اَلِیْمٌ (بقرہ۔)	کیلئے دردناک عذاب ہے۔

شاہانہ ترحم حضرت تھانویؒ اپنے تفسیری ترجمہ میں تحریر فرماتے ہیں

"ہاں جس قاتل کو اس کے فریق کی طرف سے کچھ معافی ہو جائے، مگر پوری معافی نہ ہو، تو وہ سزائے قتل سے تو بری ہوگیا، لیکن دیت یعنی خونبہا کے طور پر ایک معین مقدار مال کی بذمہ قاتل واجب ہوگی، اس وقت فریقین کے ذمہ دو امر کی رعایت ضروری ہے، مدعی یعنی وارثِ مقتول کے ذمہ معقول طور پر اس مال کا مطالبہ کرنا، کہ اس کو زیادہ تنگ نہ کرے، اور مدعا علیہ یعنی قاتل کے ذمہ خوبی کے ساتھ اس مال کا مدعی کے پاس پہنچا دینا، کہ مقدار میں کمی نہ کرے اور خواہ مخواہ ٹال مٹول نہ کرے، یہ قانونِ دیت اور عفو تمھارے پروردگار کی طرف سے سزا میں تخفیف ہے اور شاہانہ ترحم ہے، ورنہ بجز سزائے قتل کے کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی پھر جو شخص اس قانون کے مقرر ہونے کے بعد تعدی کا مرتکب ہو، مثلاً کسی پر جھوٹا یا اشتباہ میں دعوائے قتل کا کر دے، یا معاف کر کے پھر قتل کی پیروی کرے، تو اس شخص کو آخرت میں بڑا دردناک عذاب ہوگا"[1]

اسلامی قانون میں رعایت | حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل میں صرف قصاص تھا، دیت نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اس امت پر رحم فرما کر قصاص کے ساتھ دیت کو بھی رکھا، کہ مقتول کے وارث قتل عمد میں اگر قصاص کے بدلہ دیت قبول کر لیں، تو قصاص سے قاتل بچ سکتا ہے[2]

بلکہ شریعتِ مطہرہ میں اس کی بھی گنجایش رکھی گئی ہے کہ ولی مقتول سرے سے معاف کر دے، اور اس طرح قاتل اپنے جرم کی سزا سے محفوظ ہو جائے، سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

من اصیب بقتل او خبل فانہ	جس کو قتل یا زخم کی مصیبت پہنچائی جائے،
یختار احدی ثلث اما ان یقتص	اسے تین چیزوں میں سے ایک کا اختیار ہے
واما ان یعفو واما ان یاخذ	یا وہ قصاص لے، یا معاف کر دے اور یا

[1] بیان القرآن ج ۱ ص ۱۰۰ [2] جمع الفوائد ج ۱ ص ۲۸۶ عن البخاری

الدیۃ - لابی داؤد　　　　وہ دیت قبول کرے۔

(جمع الفوائد ج ا ص۲۷۶)

وارثِ مقتول کی زیادتی کی روک تھام | ان تین شکلوں کے سوا کوئی چوتھی شکل نہیں ہے، سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے

من اصیب بدم او خبل والخبل الجرح فھو بالخیار بین احدی ثلاث فان اراد الرابعۃ فخذوا علی یدیہ بین ان یقتص او یعفو او یاخذ العقل فان اخذ من ذالک شیئا ثم عدا بعد ذالک فلہ النار خالدا فیھا مخلدا ابدا	جسے خون یا زخم کی تکلیف پہنچائی جائے، اسے تین میں سے ایک کا اختیار ہے لیکن اگر وہ ان کے سوا کسی چوتھی چیز کا ارادہ کرے، تو اس کے ہاتھوں کو پکڑلو، وہ تین یہ ہیں کہ قصاص لے، یا معاف کردے اور یا دیت وصول کرے، ان میں سے کچھ قبول کرنے کے بعد زیادتی کرے گا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

رواہ الدارمی (مشکوٰۃ کتاب القصاص)

اس حدیث میں صراحت ہے کہ کوئی کسی کو قتل کردے تو ولیِ مقتول ان تین صورتوں میں کسی صورت پر عمل پیرا ہو کر اپنا حق حاصل کرے، اور امن و امان کے سلسلہ میں جو ناگواری اور برہمی پیدا ہو گئی ہے، اسے سرے سے ختم کردے، تاکہ پبلک میں اس ہونے والے ناخوشگوار واقعہ سے کوئی غلط رجحان پرورش نہ پانے پائے، لیکن اگر کوئی ولیِ مقتول باایں ہمہ اختیار کوئی صورت تجویز کر کے اس پر عمل پیرا نہ ہو، اور اس کو بہانہ بنا کر فضا کو مکدر کرنے کی سعی کرے اور فتنہ کو ہوا دینے کی تدبیر کرے تو وہ اسلام کی نظر میں سخت مجرم ہے، اور اس کے لئے جہنم کی وعید شدید ہے۔

دیت کا حق | مگر یہ واضح رہے کہ قصاص کی جگہ دیت لینے کا حق ولیِ مقتول کو قاتل کی رضا سے حاصل ہوگا، یعنی قاتل اس پر مجبور نہیں ہے کہ ولی مقتول دیت کا مطالبہ کرے تو

خواہ مخواہ ادا ہی کر دے، بلکہ وہ اس کا اختیار رکھتا ہے کہ اپنے کو قصاص کے لئے پیش کرے اور دیت سے انکار کر دے، اسی طرح قاتل کی گلو خلاصی کہ وہ دیت دے کر قصاص سے اپنے آپ کو بچالے، یہ ولی مقتول کی رضا پر موقوف ہے، کوئی ولیِ مقتول کو دیت قبول کرنے اور قصاص سے درگذر کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا ہے۔

قتلِ عمد اور اسلامی قانون | قصاص اور قتلِ عمد کے سلسلہ میں اختصار کے ساتھ جو کچھ لکھا گیا، اس سے یہ بات خوب اچھی واضح ہو کر سامنے آگئی ہو گی، کہ اسلام کا یہ قانون ہر پہلو سے جامع، مانع اور مکمل ہے، امن و امان کا پاس مقتول کے وارثین اور حامیوں کے جذبات کا لحاظ، اور خود قاتل کے ساتھ ترحم شاہانہ، کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو تشنہ رہ گیا ہو، اور جس پر اسلام نے پوری باریک بینی سے نگاہ نہ رکھی ہو۔

اس سلسلہ میں اسلام نے پہلے موانع کی آہنی دیوار کھڑی کی ہے کہ کسی کو قتل پر اقدام کی جرأت نہ ہو، بلکہ تہدید و وعید ہی اس کے ہاتھوں کو شل کر دیں، پاؤں میں بیڑی ڈال دیں اور دل و دماغ پر کنٹرول حاصل کر لیں، اور اس طرح امن و امان کی فضا میں برہمی کی سرے سے نوبت ہی نہ آنے پائے، لیکن انسان فطرتاً چوں کہ عجلت پسند اور ظلوم و جہول واقع ہوا ہے، اس لئے با ایں ہمہ وہ گزر نے پر قادر ہے

اس لئے جرم کے ثبوت کے بعد معقول سزا تجویز کی گئی، تاکہ یہ آئندہ کے لئے روک بن سکے، اور مجرمین کے حوصلہ کو پست کر دے اور پھر کوئی دوبارہ ایسے جرم کے ارتکاب کی جرأت نہ کرے، اس طرف اشارہ کرتے ہوئے ملا علی قاریؒ نے تحریر فرمایا

والتحقیق ما قال بعض المشائخ	تحقیقی بات وہی ہے جو بعض مشائخ نے کہی ہے
انها موانع قبل الفعل وزواجر	کہ حدود، فعل سے پہلے موانع کا درجہ رکھتے ہیں
بعدہ، ای العلم بشرعیتها یمنع	اور کر گذرنے کے بعد زجر و توبیخ کا، یعنی اس قانون

الاقدام علی الفعل وایقاعها بعدہ یمنع من العود الیہ (مرقاۃ ج ۴ ص۵۵) — کا علم جرم کے اقدام سے روکتا ہے اور سزا کا وقوع دوبارہ جرأت کا دروازہ بند کرتا ہے۔

قصاص کا قانونِ اسلام فقہا کی نظر میں

ابن الہمام نے حدود کی انھی حکمتوں کی طرف اشارہ فرمایا

محاسن الحدود اظہر من ان یذکرہ البیان او یکتبہ البنان لان الفقیہ وغیرہ یستوی فی معرفۃ انہا لامتناع عن الافعال الموجبۃ للفساد . . . . والمقصود من شرعیۃ الحدود الانزجار عما یتضرر بہ العباد (مرقاۃ ج ۴ ص۵۵)

حدود کے محاسن اس حد سے باہر ہیں کہ زبان اسے ذکر کر سکے اور قلم لکھ سکے، اس لئے کہ فقیہ و غیر فقیہ اس بات کے جاننے میں برابر ہیں کہ یہ ان افعال کے روکنے کے لئے ہے جو موجبِ فساد ہیں اور حدود کے قانون کا مقصد اس چیز کا روکنا ہے جس سے بندوں کو نقصان پہنچے۔

نیز علامہ سرخسیؒ نے قانونِ قصاص کی حکمت اور اس کے اسباب کو سامنے رکھتے ہوئے، قانونِ قصاص کی ضرورت پر روشنی ڈالی اور اس سلسلہ میں بجا طور پر لکھا

الا انہ لو وقع الاقتصار علی الزجر بالوعید فی الاخرۃ ما انزجر الا اقل القلیل فان اکثر الناس انما ینزجرون مخافۃ العاجلۃ بالعقوبۃ وذالک بما یکون متلفا او مجحفا بہ فشرع اللہ القصاص والدیۃ لتحقق معنی الزجر (مبسوط ج ۲۶ ص۵۹)

لیکن اگر آخرت کی وعید ہی پر اکتفا کیا جاتا تو اقل قلیل کے سوا کوئی باز نہ آتا، اس لئے کہ زیادہ تر لوگ فوری سزا سے ڈر کر باز آتے ہیں، اور وہ اس وجہ سے کہ یہ سزا مہلک اور تلف کن ہے چنانچہ اللہ نے قصاص و دیت کا قانون زجر و توبیخ کے لئے نافذ کیا۔

قصاص کا قانون قصاص کی انھی حکمتوں کا نتیجہ ہے کہ اسلام نے یہ معاملہ حاکم کے ہاتھ میں

نہیں دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو قصاص جاری کرے ورنہ نہیں، بلکہ حاکم قانون کا پابند ہے، جب جرم ثابت ہو جائے گا اس کو جاری کرنا ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ ولیِ مقتول معاف کردے، اور اس طرح وہ بچ جائے۔

حکومت کے اختیارات | اب سوال یہ ہے کہ ولیِ مقتول نے معاف کر دیا، لیکن حکومت اسے قصاص میں با ایں ہمہ قتل کرنا چاہتی ہے تو کیا حکومت کو یہ حق ہے، یا نہیں، جواب یہ ہے کہ حکومتِ وقت کا فریضہ یہ ہے کہ جب ولی مقتول نے معاف کر دیا ہے تو یہ بھی درگزر کرے، لیکن اگر وہ قتل اس طرح کی زیادتی کے ساتھ متعلق ہے، جس کا اثر دور رس ہے اور عوام کو اس سے نقصان اور ان میں بغاوت کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں ولیِ مقتول کے عفو و کرم کے باوجود حکومت اگر ضروری سمجھے گی تو قاتل کو قتل کر سکتی ہے، مثلاً کسی نے کسی شخص کو مال و دولت کے لالچ میں قتل کر ڈالا ہے، تو علماء کا اتفاق ہے کہ اس صورت میں قاتل قتل کیا جائے گا، ورثۂ مقتول کو معاف کرنے کا حق نہیں ہے، ہاں البتہ اگر اس قاتل نے قتل عداوتِ ذاتی کی بنیاد پر کیا، یا ایسے ہی کسی وجہ سے، تو فیصلہ اجراء قصاص میں اولیاء مقتول کے معاف کرنے نہ کرنے کی بنیاد پر ہوگا۔

قصاص میں ہتھیار | اجراء قصاص میں کون سا ہتھیار استعمال کیا جائے گا، اس باب میں ائمہ کا اختلاف ہے، بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ مقتول کو جس طرح کے ہتھیار سے قتل کیا گیا ہے قصاص میں اسی طرح کا ہتھیار استعمال کیا جائے گا، اور وہ اپنی دلیل میں یہ پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

فان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ — اور اگر بدلہ لو تو بدلہ لو اوسی قدر جس قدر کہ تم کو تکلیف پہنچائی جائے۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من حرق حرقناہ ومن غرق غرقناہ — جس نے کسی کو جلایا اُس کو ہم جلائیں گے اور جس نے کسی کو غرق کیا ہم اسکو غرق کریں گے

اور بعض ائمہ کہتے ہیں کہ قصاص کے اجراء میں تلوار استعمال کی جائے، اس لئے کہ

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت کے ساتھ فرمایا ہے

لا قود الا بالسیف

اور کوئی شبہ نہیں کہ راجح یہی مسلک ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام نے ہر چیز میں یُسر کو پسند کیا ہے، خواہ مخواہ کی سختی کی اس میں گنجائش نہیں ہے، اور یہ مُسلّم ہے کہ قصاص کا منشاً قاتل کو قتل کرنا ہے، نہ کہ اسے ستانا، پھر کون نہیں جانتا کہ تلوار سے یہ کام نسبتاً جلد انجام پائے گا، اور مقصد بھی حاصل ہو جائے گا، اس لئے اسی کے استعمال کا عقل فیصلہ کرتی ہے، حدیث سے بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ان اللہ کتب الاحسان علی کل	اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں خوبی کے ساتھ انجام دینے کو
شیئ فاذا قتلتم فاحسنوا القتلۃ	ضروری قرار دیا ہے لہذا جب تم قتل کرو، تو اچھی
واذا ذبحتم فاحسنوا الذبیحۃ	طرح قتل کرو، اور جب ذبح کرنے چلو، تو خوب
ولیحد احدکم شفرتہ ولیرح	اچھی طرح ذبح کرو اور چاہیئے تم میں سے ہر ایک
ذبیحتہ	چھری کو تیز کرے اور جانور کو آرام پہنچائے۔

یہ اور اس طرح کی دوسری حدیثوں کے پیشِ نظر فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ دوسرا مسلک ہی راجح ہے، کہ قاتل کو تھوڑی سی سہولت رہے گی، چنانچہ حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں

واذا لم یکن بد من موت القاتل	جب قاتل یا مستحق قتل کو موت کے سوا کوئی چارۂ
ومن استحق القتل فموتہ بالسیف	کار نہ ہو تو اس کی موت تلوار سے اس کے لئے
انفع لہ … والموت بہ اسرع	زیادہ نفع بخش ہے، اور اس سے جلد موت
الموتات واقلھا الماً (اعلام الموقعین ج۱ ص۱۸۵)	واقع ہوتی اور تکلیف بھی کم ہوتی ہے

اس اصول کے تحت اگر کوئی ایسا دھار دار آلہ ایجاد ہو جائے، جو تلوار سے بھی زیادہ تیزی سے آدمی کو قتل کر سکے، تو قصاص میں اس کا استعمال درست ہونا چاہیئے لیکن اگر یہ آلہ دھار دار نہیں ہے اور جان لینے میں بجلی کی سی تیزی رکھتا ہے جیسے مروجہ

(نوٹ: بجلی کی کرسی وغیرہ کا استعمال قصاص کے سلسلہ میں درست ہوگا، یا نہیں، قابل غور ہے، (ناظرین مع دلائل اپنی رائے لکھیں))

عربی کی ایک قلمی کتاب سے

تاریخ ہند پر نئی روشنی

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق استاذ ادبیات عربی دہلی یونی ورسٹی)

(۳)

سفر اور حضر دونوں میں سلطان محمد بن تغلق کے لئے اتنے نقارے اور ڈھول بجائے جاتے ہیں جتنے اسکندر کے لئے بجائے جاتے تھے، یعنی دو۲ سو نقارے، چالیس۴۰ بڑے ڈھول، بیس۲۰ بگل اور دس۱۰ جھانجھ (صنج) اس کے لئے پانچوں وقت بھی نقارہ بجایا جاتا ہے۔ سفر میں اس کے ساتھ ان گنت روپیہ ہوتا ہے اور بے شمار عجیب و غریب سامان۔ شکار میں اس کے ہم رکاب تھوڑی فوج ہوتی ہے، یعنی ایک لاکھ گھوڑے اور دو۲ سو ہاتھی، ان کے علاوہ لکڑی کے چار محل آٹھ سو اونٹوں پر، دو سو اونٹ فی محل کے حساب سے۔ ہر محل پر کالے ریشم کے پردے جن پر سونے کا کام ہوتا ہے لگے ہوتے ہیں، ہر محل دو۲ منزلہ ہوتا ہے، اور اس کے ساتھ متعدد خیمے اور ڈیرے ہوتے ہیں۔ جب سلطان تفریح یا اس سے ملتے جلتے کسی کام کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے تو اس کے ہمراہ تقریباً تیس۳۰ ہزار سوار ہوتے ہیں، اتنے ہی ہاتھی، اور ہزار کوتل گھوڑے، زین و لگام، اور زیور و طوق سے مزین، بعض کی پوشش پر جواہرات اور یاقوت ٹکے ہوتے ہیں۔ ایک محل سے دوسرے محل میں شاہی سواری

کا ذکر کرتے ہوئے شیخ محمد خُجَندی[۱] نے جو دہلی آکر شاہی لشکر میں ملازم ہوئے، مجھے بتایا کہ جب سلطان کی سواری ایک محل سے دوسرے محل کو گئی تو وہ سوار تھا اور اس کے سر پر چیتر لگا تھا اور سِلاحدار اس کے پیچھے ہاتھوں میں ہتھیار لئے ہوئے تھے۔ بادشاہ کے آس پاس تقریباً بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) غلام تھے، سب کے سب پیدل، بس چیتر بردار، سِلاحدار اور جمدار (پارچہ بردار) سوار تھے۔ شیخ مبارک نے مجھ سے کہا: تغلق شاہ کے سر پر سات چیتر ہوتے ہیں جن میں دو پر انمول موتی ٹکے ہوتے ہیں۔ اور اس کی نشست گاہ سے شان و شوکت، سج دھج اور سلیقہ میں سوائے سکندر اور ملک شاہ بن الپ اَرسلان کے اور کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔

خان، ملوک اور امیر سفر ہو یا حَضَر جب سلطان کے ہم رکاب ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ جھنڈوں کا ہونا ضروری ہے ایک خان زیادہ سے زیادہ نو جھنڈے اور ایک امیر کم سے کم تین جھنڈے ساتھ رکھ سکتا ہے، حَضَر میں خان زیادہ سے زیادہ دس کوتل گھوڑے ساتھ رکھتا ہے اور امیر دو، لیکن سفر میں اپنی مقدرت اور وسعت قلب (؟) کے مطابق جتنے چاہے رکھ سکتا ہے۔ جب یہ فوجی افسر بابِ شاہی پر آتے ہیں تو اس کے سورج کے سامنے اُن کے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں اور اس کا سمندر ان کے بادلوں کو نگل جاتا ہے۔ محمد بن تغلق اتنی شان و شوکت کے باوجود بڑا مُخَیِّر اور متواضع آدمی ہے۔ اَبُوصفار عمر بن اسحاق، شبلی نے بیان کیا: میں نے دیکھا کہ سلطان اپنی سواری سے اُترا اور ایک فقیر صالح، کے جنازہ کے پاس گیا اور اس کو کندھا دیا۔ بادشاہ میں بہت سی

---

[۱] خُجَندہ ایک مشہور شہر جو ماوراء النہر میں دریائے سیحوں پر واقع تھا۔

خوبیاں ہیں :- قرآن اور ھدایہ جو حنفی فقہ میں ہے، اس کو ازبر یاد ہیں، معقولات میں بھی اس کی بنیادیں گہری ہیں، خط نہایت پاکیزہ ہے، اس نے جسمانی، روحانی اور ادبی ریاضت بھی خوب کی ہے، شعر کہتا ہے اور شعر سنانے کی فرمائش بھی کرتا ہے، اشعار کے معانی سمجھتا ہے، علمار فضلاً سے بحث و مناظرہ کرتا ہے، شعرار اور بالخصوص فارسی شعرار کی غلطیاں پکڑتا ہے، جس کی وجہ اُس کی فارسی مہارت اور زبان دانی ہے۔ میں نے اس مسئلہ پر کہ 'کل' کو 'آج' پر کس حیثیت سے 'تَقَدُّم' حاصل ہے اس کو بحث کرتے سنا، منطقی کہتے ہیں کہ 'تقدم' یا تو باعتبار زمان ہوگا، یا باعتبار رتبہ یا باعتبار ذات، اس لئے یہ جائز نہیں کہ تقدم کسی ایک حیثیت سے بھی ہو، تغلق شاہ کی رائے تھی کہ اسی دلیل سے اہلِ منطق کا مذکورہ بالا موقف ٹوٹتا ہے، کیوں کہ 'کل' کا تقدم 'آج' پر مذکورہ بالا کسی اعتبار سے نہیں ہے۔ (۹) ابوصفار شبلی نے کہا: میں نے سلطان کو سب عالموں سے گو کہ ان کی تعداد بہت تھی، فرداً فرداً باتیں کرتے دیکھا، علمار اُس کے دربار سے منسلک ہیں، ماہِ رمضان میں ان میں سے ایک ہر روز صدرِ جہاں کے حکم سے بادشاہ کے ساتھ افطار کرتا ہے بشرطیکہ کوئی نکتہ بیان کرے، سب عالم اس نکتہ پر بادشاہ کے حضور بحث و مباحثہ کرتے ہیں، اور وہ خود ان کے ساتھ باتیں اور بحث کرتا ہے اور ارکانِ مجلس اس پر اعتراض بھی کرتے ہیں۔ ناجائز کاموں کی وہ بالکل رخصت نہیں دیتا، اور غیر شرعی حرکتوں پر کسی کو آزاد نہیں چھوڑتا، کسی کی مجال نہیں کہ اس کی عمل داری میں مجرم کی پشت پناہی کرے، اور شراب سے تو اس کو سخت چڑھ ہے، شراب نوشی کی شرعی سزا (اسّی کوڑے) دیتا ہے۔ سید شریف تاج الدین

بن أبي مُجاہد حَسَنؔ سمرقندی نے مجھ سے کہا: دہلی کے ایک بڑے خان کو شراب کی لت تھی، اور وہ اس کا بڑا عادی ہو گیا تھا، سلطان اس کو منع کرتا لیکن وہ باز نہ آتا، ایک دن بادشاہ کو اتنا سخت غصہ آیا کہ اس نے خان کو گرفتار کر لیا اور اس کی ساری دولت جو تینتالیس کروڑ ستر لاکھ[1] مثقال[2] سونے کے مساوی تھی، ضبط کر لی۔ بادشاہ کی شراب سے نفرت اور ہندوستان کی کثرتِ دولت کے ثبوت کے لئے یہ قصّہ کافی ہے، مذکورہ رقم کا اگر مصری قِنطار میں حساب لگایا جائے تو میزان تینتالیس ہزار سات سو قِنطار ہوگی اور یہ میزان اتنی بڑی ہے کہ اس کا شمار مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ شریف حسن سمرقندی نے جو دنیا کے سیاح ہیں اور مختلف ملکوں کا گشت لگا چکے ہیں، ہندوستان کی دولت کے بارے میں ایسے قصے بیان کئے ہیں جن کو سن کر عقل حیران ہوتی ہے جیسا کہ ابھی نقل کردہ یا اُس جیسے دوسرے قصّے حیرت ناک ہیں۔ محمد بن تغلق کے انعامات اور داد و دہش کے کارنامے ایسے ہیں جن کو دنیا اپنے محاسن کے صفحات میں جگہ دے گی اور زمانہ اپنے ماتھے کے روشن گوشوں پر ثبت کرے گا، ان میں سے چند یہاں بیان کرتا ہوں۔ شیخ مبارک نے مجھے بتایا کہ یہ سلطان ہر دن پورے دو[2] لاکھ (تنکے) خیرات کرتا ہے، جو شام و مصر کے سکوں میں سولہ لاکھ درہم کے مساوی ہیں، کبھی کبھی اس کی خیرات پچاس لاکھ یومیہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کا دستور ہے کہ جب نیا چاند نکلتا ہے تو دو[2] لاکھ (تنکے) خیرات کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سلطان کی طرف

---

[1] فوٹو نسخہ: چالیس کرور تیس ہزار مثقال [2] مثقال کا وزن ۱½ یا ۱⅓ درہم بتایا گیا ہے اور درہم ۳½ ماشہ کے بقدر ہوتا ہے، اس حساب سے مثقال پونے چار اور پانچ ماشہ کے لگ بھگ ہوا۔

سے بیس ہزار فقیروں کے روزینے مقرر ہیں، ہر فقیر ایک درہم (تقریباً نو آنے) اور پانچ رطل (تقریباً ڈھائی سیر) گیہوں کی روٹی یا چاول پاتا ہے۔ اس نے مدرسوں میں تنخواہ دار ہزار فقیہ مقرر کئے ہیں جو یتیموں اور بچوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ اُس کی طرف سے اجازت نہیں کہ دہلی میں کوئی پبلک سے بھیک مانگے، اگر کوئی محتاج سوال کرتا ہے تو اس کو روکا جاتا ہے اس کے واسطے سرکار کی طرف سے روزینہ مقرر کر دیا جاتا ہے۔

فاضل نظامُ الدّین ابوالفضائل یحییٰ بن حکیم طیاری (؟) نے مجھ سے بیان کیا: "ابوسعید (ایلخانی تاجدار ایران) کے لشکر (اُردو) میں ایک شخص عضدؔ بن قاضی تھا جو وزیر بننا چاہتا تھا لیکن اس کا اہل نہ تھا، اپنے مقصد کے حصول کے لئے وہ وزیروں میں دشمنی اور لشکر کے لوگوں میں پیہم بغاوت پھیلاتا تھا۔ اربابِ حلّ و عَقد نے طے کیا کہ اس کو مرکز سے کہیں دور بھیج دیا جائے، چنانچہ اس کو سفیر بنا کر دہلی بھیجا، اس کے ساتھ ایک شاہی خط تھا جس میں سلام و صداقت کے اظہار کے بعد تغلق شاہ کی خیر و عافیت دریافت کی گئی تھی، دراصل یہ جھم بہانہ تھی عضد بن قاضی کو ملک باہر کرنے کا، اربابِ حکومت چاہتے تھے کہ وہ پھر نہ لوٹے۔ عضد بن قاضی جب دہلی آیا اور سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور خط پیش کیا تو سلطان تپاک سے ملا، انعام و خلعت سے اس کو نوازا، اس کی قدر و منزلت کی اور نقد عطیہ دیا۔ پھر وہ جب شاہ ایران (ابو سعید) کے پاس واپس جانے لگا تو سلطان نے اس سے کہا کہ خزانہ میں جاؤ اور جو تمھارا جی چاہے لے لو۔ عضد بن قاضی، شاطر آدمی تھا، خزانہ میں جا کر ایک قرآن کے علاوہ اس

کچھ نہ لیا، بادشاہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس کو تعجب ہوا اور اس نے سید عضد سے پوچھا: تم نے بس قرآن لینے پر کیوں اکتفا، کیا؟

سید عضد: سلطان کے کرم نے مال و دولت سے مجھے اتنا بے نیاز کر دیا ہے کہ خزانہ میں کتاب اللہ سے بہتر مجھے کوئی چیز نہیں ملی۔

بادشاہ اس کے قول و فعل سے بہت محظوظ و متاثر ہوا، اور اس کو بہت سا مال و متاع عنایت کیا، اور ایک دوسرا عطیہ بطور تحفہ ابوسعید (شاہ ایران) کے لئے اس کے ساتھ کر دیا، دونوں کے عطیات کا مجموعہ آٹھ سو تومان تھا، تومان دس ہزار دینار کے برابر ہے اور دینار چھ درہم کا ہوتا ہے، آٹھ سو تومان کے معنی ہوئے اسی لاکھ دینار یا چار کروڑ اسی لاکھ درہم! سید عضد یہ دولت لے کر لوٹا تو اس کو اندیشہ ہوا کہیں اردو (۱۶/۵) میں اُس سے چھین نہ لی جائے اس لئے اس نے اس کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے اس طرح پیک کیا کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ امیر احمد بن خواجا رشید وزیر مملکت کا بھائی بعض بد عنوانیوں کی پاداش میں اُردو سے نکالا گیا لیکن اس کے بھائی غیاث الدین محمد وزیر (ابوسعید) کی پاس خاطر کے لئے اس کو امیر ایلکاہ بنا دیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سلطنت کے جس حصہ میں چاہے وہاں کے گورنروں کی عدم موجودگی میں حاکم رہ سکتا ہے، اتفاق کی بات کہ احمد بن خواجا کی سر راہے سید عضد سے مڈبھیڑ ہو گئی، اول الذکر نے بہت سا روپیہ سید عضد سے چھین لیا اور اس سے ابوسعید اور خانوں کو تحفہ تحائف دینے کے لئے سونے چاندی کے کئی اونٹ بھر برتن بنوائے، وأحسبہ سلہ لہ الی العود الی الاُردو (؟) لیکن موت نے اس کو آ پکڑا، اس کے بعد

ابو سعید اور سید عضد بھی چل بسے، حکومت کی بساط اُلٹ گئی اور سونا ضائع ہو گیا اور اس کے کمانے والوں کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔

ابن حکیم نے کہا: دہلی کا یہ سلطان غیر معمولی فیاض ہے اور پردیسیوں کے ساتھ بڑے لطف و کرم سے پیش آتا ہے۔ ایک فاضل فارس سے اس کے پاس آیا اور اس کی خدمت میں فلسفہ کی کتابیں پیش کیں جن میں ابن سینا کی شفا، بھی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب وہ حاضر ہوا اور کتابیں پیش کیں اس وقت قیمتی جواہرات کا ایک بڑا بنڈل سلطان کی خدمت میں لایا گیا، اُس نے مٹھی بھر موتی اُس بنڈل میں سے لئے اور نووارد کو دئے، ان کی قیمت بیس ہزار مثقال سونا اُٹھی، ھذا غیر بقیہ ما وصلہ بہ (؟)۔

سید شریف سمرقندی نے مجھ سے بیان کیا:۔ اہلِ بخارا خربوزے لے کر جو جاڑوں تک ان کے ہاں چلتے ہیں بادشاہ کے پاس آتے ہیں اور وہ ان کو بڑے بڑے عطیے دیتا ہے، میں ایک شخص سے واقف ہوں جو سلطان کے لئے دو۲ اونٹ بھر خربوزے لے کر چلا لیکن ان کا بیشتر حصہ راستہ میں خراب ہو گیا اور صرف بائیس خربوزے صحیح و سالم پہنچے، سلطان نے اس شخص کو تین ہزار مثقال سونا دیا۔ شیخ ابو بکر بن ابی الحسن ملتانی نے جو حافظ ابن تاج مشہور ہیں اور جن سے میری ملتان میں ملاقات و گفتگو ہوئی (؟) کہا: پھر میں دہلی گیا تو میں نے وہاں بھی یہ بات مشہور پائی کہ سلطان محمد بن تغلق نے یہ عہد کیا ہے کہ کسی کو تین ہزار مثقال سے کم انعام نہیں دیں گے"

خجندی نے مجھ سے کہا:۔ میں سلطان محمد بن تغلق کے پاس آیا

اور اُن سے ملاقات کی تو انھوں نے مجھے ہزار مثقال سونا عنایت کیا، اس کے بعد مجھ سے پوچھا: کیا تم ہندوستان میں رہنا پسند کروگے یا وطن لوٹنا چاہتے ہو؟" میں نے کہا: میں یہیں رہنا چاہتا ہوں۔" سلطان نے مجھے فوج میں بھرتی کر لیا۔

شیخ أبوبکر بن خلّال بزی صوفی نے مجھ سے بیان کیا: سلطان نے ایک جماعت کے ساتھ جس میں میں بھی تھا، تین لاکھ مثقال سونا ماوراء النہر بھیجا، ایک لاکھ وہاں کے علماء اور ایک لاکھ فقراء میں بانٹنے کے لئے اور ایک لاکھ سے سلطان کا سامان خریدنے کے لئے۔ سلطان نے ہم سے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ شیخ بُرہان الدین ساغرجی شیخ سمرقند، جو علم و زہد میں یکتائے وقت ہیں، کبھی روپیہ پس انداز نہیں کرتے، تم ان کو چالیس ہزار تنکے دینا تاکہ وہ ان کی مدد سے ملتان آ جائیں، جب وہ ہماری عملداری میں آجائیں گے تو ہم دل کھول کر ان کو دیں گے۔ اگر تم ان کو گھر پر نہ پاؤ تو یہ رقم ان کے متعلقین کو دے دینا تاکہ واپسی پر ان کو دے دیں اور کہہ دیں کہ ہماری خواہش ہے کہ اس روپئے سے ملتان آ جائیں۔ بزّی کہتے ہیں کہ جب ہم سمرقند پہنچے تو ہمیں معلوم ہوا کہ شیخ بُرہان چین جا چکے ہیں۔ ہم نے روپیہ ان کی کنیز کو دیا اور کہا کہ سلطان نے ان کو ملتان آنے کی تاکید کر دی ہے۔"

فقیہ ابو الصّفار عمر بن اسحاق شبلی نے مجھ سے بیان کیا: سلطان محمد بن تغلق سفر میں ہوں یا حضر میں، علماء ان کے ساتھ ضرور ہوتے ہیں۔ ایک جنگی مہم پر ہم اُن کے ساتھ جا رہے تھے (۱۹/۵) کہ فوج کے ہراول دستوں کی طرف سے فتح کی خوش خبری کے خط موصول ہوئے، بادشاہ

فتح کی خبر سے مسرور ہوا اور کہا کہ یہ فتح علمار کی برکت سے حاصل ہوئی ہے۔ اس نے حکم دیا کہ علمار خزانہ میں جائیں اور ہر فرد جتنا روپیہ لے سکے لے لے اور اگر کوئی کم زوری کی وجہ سے روپیے کی بوریاں نہ اُٹھا سکتا ہو تو وہ اپنا نمائندہ بھیج دے۔ علمار خزانہ میں گئے لیکن میں اور مجھ جیسے دوسرے بہت سے عالم جن کا تعلق صفِ اول سے نہ تھا، رُکے رہے۔ ہر شخص نے دو۲ تھیلیاں اُٹھا لیں، ہر تھیلی میں دس ہزار درہم تھے۔ لیکن ایک عالم صاحب ایسے تھے جنہوں نے تین تھیلیاں لیں، دو۲ بغلوں میں دبا لیں اور ایک سر پہ رکھی۔ سلطان اس حریص عالم کو دیکھ کر ہنس پڑا، اس نے پوچھا کہ باقی عالم خزانہ میں کیوں نہیں گئے تو اس کو بتایا گیا کہ ان کا مرتبہ نیچا ہے، جانے والے پروفیسر ہیں اور یہ لیکچرر (معید) سلطان نے حکم دیا کہ ہم سب کو ہزار ہزار درہم دئے جائیں چنانچہ یہ رقم ہمارے درمیان تقسیم کر دی گئی۔

ابو صفار شبلی نے کہا: اس سلطان کی حکومت میں منار شریعت قایم اور اہلِ علم کا بازار گرم ہے، علمار کو توقیر و احترام کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے، اور وہ بڑے جوش سے ان اصولوں کو سینے سے لگائے ہیں جن کا ان کی اصلاح ظاہر و باطن سے تعلق ہے، وہ ہمیشہ پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں اور اپنے تمام معاملات میں اعتدال سے کام لیتے ہیں اور خوب سوچ سمجھ کر قدم بڑھاتے ہیں۔ یہ سلطان اجتہاد فی الجہاد میں ذرا کوتاہی نہیں کرتا، نہ خشکی کی طرف سے اپنی عنان و سنان (نیزہ) موڑتا ہے نہ سمندر کی طرف سے، یہ برابر اس کا معمول ہے۔ اس نے ہند کے طول و عرض میں اعلاءِ کلمۃ الحق اور نشر اسلام

کے بڑے بڑے کارنامے انجام دئے ہیں جن کے اثر سے وہاں کے اندھیرے
میں اُجالا پھیلا، اور ہدایت و رشد کی بجلیاں چمکیں، اُس نے آتش خانے
ڈھائے، بُت توڑے اور ہند کو غنڈوں سے پاک کیا، اس سے اس
کی ذمی رعایا مستثنیٰ ہے، اس کی کوشش سے شرق اقصیٰ اور مطلع شمس
تک اسلام پھیل گیا (لآلاء الصباح المشرق (؟) اس نے اُمّت محمّدیہ
کا جھنڈا وہاں پہنچا دیا جہاں جیسا کہ ابو نصر عُتبی (مورخ) کہتا ہے، کبھی کوئی
جھنڈا نہ گیا تھا، نہ جہاں کبھی قرآنی آیت یا سورت پڑھی گئی تھی، اس نے
مسجدیں آباد کیں، ترنم کے ساتھ اذان دینا اور زمزمہ کے ساتھ قرآن پڑھنا
بند کرا دیا، اِس ملّت کے پیروؤں کو کفّار کے سر پر لا بٹھایا اور خدا کی
مدد سے ان کی دولت اور وطن کا ان کو وارث بنا دیا۔ وأرضا لم یطوها
وھو مع ھذا یمد لہ فافقہ مع کل خافقۃ (؟) خشکی میں اُس کے
جھنڈوں کے عُقاب ہیں اور سمندر میں کشتیوں کے غُراب (کوّے) اور
غلاموں کی اتنی کثرت ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب ہزاروں کوڑیوں
کے مول نہ بیچے جاتے ہوں۔ میرے سب راویوں نے بتایا کہ خدمت
گار کنیز کی قیمت دہلی میں آٹھ تنکے (تین روپئے[1]) سے زیادہ نہیں ہوتی،
اور جو کنیزیں خدمت اور ہم بستری دونوں کے لئے موزوں ہوتی ہیں
ان کی قیمت پندرہ تنکے (پونے چھ روپئے) ہوتی ہے، دوسرے شہروں
میں ان کی قیمت اور بھی کم ہے۔

(باقی)

---

[1] اگر تانبے کا تنکہ مانیں اور تیس روپے اگر چاندی کا قرار دیں۔

جدید عراقی شاعری کے رہنما

زہاوی اور رُصافی

از

(جناب مولوی رشید احمد صاحب ارشد ایم اے استاذ ادبیات عربی کراچی یونی ورسٹی)

عراق عرب میں ترکی دورِ حکومت میں کئی علمی خاندان تھے جنھوں نے عربی علم و ادب کی کافی خدمت کی تھی جن میں الوسی خاندان سب سے زیادہ مشہور ہے مگر جس شخص نے سب سے پہلے عربی شاعری میں حالاتِ زمانہ سے متاثر ہو کر انقلابی خیالات پیش کئے وہ جمیل صدقی الزہاوی تھا وہ ۱۸۶۳ء میں بغداد میں پیدا ہوا اسی لحاظ سے اس کا زمانہ وہی ہے جو ولی الدین یکن اور حافظ و شوقی کا زمانہ ہے اسی کے والد علامہ محمد فیضی الزہاوی بغداد کے مفتی تھے مگر شاعر موصوف مذہبی خیالات میں بہت آزاد تھا اور اس نے مذہبی علوم کے بجائے فلسفہ اور شعر و شاعری سے کافی دلچسپی قایم رکھی زہاوی ابتدائی زمانے سے ہی ایک آزاد خیال فلسفی شاعر تھا۔ ترکی دورِ حکومت میں وہ محکمۂ تعلیم کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا، وہ ترکی پارلیمنٹ کا ممبر بھی تھا مگر اپنی آزاد خیالی اور حق گوئی کی بدولت سخت قید و بند کے مصائب برداشت کرتا رہا اس نے حقوق نسواں کی حمایت میں اخبار المؤید مصر میں ایک مضمون شائع کرا کر عربی ممالک میں ہلچل برپا کردی تھی اسی مضمون نے بغداد کے عوام کو اس قدر مشتعل کردیا تھا کہ وہ اسے اسلامی شریعت کے خلاف سمجھ کر اس کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف اس کی ملازمت جاتی رہی تھی بلکہ گھر سے نکلنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ بہر حال کچھ عرصہ کے بعد یہ شورش رفع ہو گئی تھی۔

زہاوی کا ابتدائی کلام قابلِ ذکر نہیں ہے اس کی شاعری میں بھی اس وقت جوش و

خروش پیدا ہوا جب وہ عثمانی حکومت کی قید و بند کے مصائب برداشت کر چکا تھا اور بغداد جلا وطن ہو کر واپس آیا اسی وقت اس نے عربی ممالک کے مشہور رسائل میں حافظ ابراہیم کی طرح قومی نظمیں شائع کرانی شروع کیں جن میں قوم کو تعلیمی اور سماجی ترقی کی طرف آمادہ کیا گیا تھا۔

زہاوی اپنے ہم عصر مصری شعراء سے زیادہ آزاد خیال ہے اس کا انداز فکر ولی الدین یکن سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے اسی طرح اس کے کلام میں عہد قدیم کے خلاف بغاوت کے وہی جذبات اور وہی تلخی اور تیزی پائی جاتی ہے، دونوں عثمانی حکومت اور سلطان عبد الحمید خاں کے ظلم و استبداد کے شکار ہوئے اور اسی کے خلاف لکھتے رہے، ولی الدین یکن نے اپنے اشعار اور قلم کے ذریعے زہاوی کی اس وقت حمایت کی جب کہ عوام میں اس کی مخالفت بہت بڑھی ہوئی تھی۔

زہاوی نے علم و تعلیم، حقوق نسواں، حریت و آزاد خیالی کی حمایت میں بہت زیادہ زورِ قلم صرف کیا ہے نظم کے علاوہ نثر کے ذریعہ بھی اس نے مشرقی ممالک کے جمود و تقلید کی زنجیریں توڑنے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اس نے اپنے جوانی کے زمانے میں بھی جب کہ وہ طالب علم تھا نیوٹن کے نظریہ "کشش ثقل" کی مخالفت کر کے سائنس کی دنیا میں ہلچل مچا دی تھی اس پر عربی جرائد و رسائل میں بہت عرصہ تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا گو اس کے یہ خیالات مقبول نہ ہو سکے تاہم اس سے اس کی اجتہادی فکر و نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاعر موصوف کے نظم کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں جس میں ایک مجموعہ رباعیات کا بھی ہے اس میں شاعر نے رُباعی کی طرز میں عمر خیام اور قدیم فلسفی شاعر ابو العلاء المعری کے جواب میں مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے جن میں چھوٹی بحریں اور بعض خاص قسم کی بحریں استعمال کی گئی ہیں ان میں اخلاق، سیاست، فلسفہ، معاشرت،

سائنس، وصف نگاری، عشق ومحبت، مصیبت وبدبختی، یقین وشک، ہزلیات
سب پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد اتحادیوں نے عربوں پر جو مظالم
کئے تھے، ان پر بھی بڑی دردناک نظمیں تحریر کی ہیں اس کی نظموں میں رنج وغم کے جذبات
کافی ہیں مگر ان نظموں میں جن میں نوجوانوں کو ترقی کے لئے آمادہ کیا گیا ہے۔ محبت وعمل
اور جوش وخروش کا پیغام دیا گیا ہے اکثر اشعار میں اس نے حکّام کے ظلم واستبداد
اور علماء کے جمود کی مخالفت کی ہے، اصلاح وتجدد اس کی شاعری کا سب سے بڑا
مقصد معلوم ہوتا ہے۔

عراق کے مشہور ادیب انور شاؤل نے عراق کے اہلِ قلم کے ایک جلسہ
میں جو زہاوی کی یاد میں منعقد کیا گیا تھا۔ شاعرِ موصوف کے شاعرانہ کمالات کا ذکر
کرتے ہوئے اسے فرانس کے مشہور شاعر وکٹر ہیوگو سے مشابہ قرار دیا تھا انھوں نے
دونوں شاعروں کے تاریخی پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے یہ بیان کیا تھا کہ دونوں شاعر
اپنے ملک کے انقلابی دور میں نمودار ہوئے اور دونوں نے ظلم واستبداد کے خلاف
حریت اور صداقت کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی، اسی طرح اپنی حق گوئی کی بدولت
دونوں نہ صرف مذہبی رہنماؤں کے حملوں کا شکار ہوئے بلکہ اپنے ہم عصر ادیبوں کے
حسد اور دشمنی کا نشانہ بھی بنے۔ یہاں تک کہ ذاتی عادات واطوار میں وہ ایک دوسرے
کے مشابہ تھے دونوں میں ایک قسم کی خود پسندی کی عادت بھی تھی۔

زہاوی کی گوناگوں شاعری کا احاطہ کرنے کے لئے اس کا مکمل نمونہ کلام پیش کرنا
بہت مشکل ہے تاہم چند اشعار کا آزاد ترجمہ ہدیۂ قارئین ہے۔ جوانوں کو ہمت
اور حق پسندی کا پیغام دیتے ہوئے شاعرِ موصوف یوں رقم طراز ہے " اپنی شعلہ
بیانی سے اپنے دل ودماغ کے افکار کو جرأت کے ساتھ پیش کرو " سیلِ تندرو،

آندھی اور بگولوں کی طرح اپنی منزلِ مقصود کی طرف ہمت اور جرأت کے ساتھ گامزن ہو جاؤ۔ تم سب کے سب اپنے نفس کے حاکم بن جاؤ کیوں کہ یہ دور تمام ادوار کا سردار ہے، حق و صداقت کو کھلم کھلا ظاہر کرو اور لوگوں کے سامنے تمام اسرار کو آشکار کردو۔ زندگی کیا ہے؟ ایک دائمی کشمکش یا کمزور کی قوی سے نبرد آزمائی ہے، اولوالعزم انسان کے لیئے فلاح و کامرانی ہے اور کمزور کے لئے تباہی و بربادی ہے۔ اے بوڑھے انسانو! تم مردِ میدان نہیں ہو اس لئے پیچھے ہٹ جاؤ۔ اے نوجوانو! تم آگے بڑھو۔ آگے بڑھو۔"

شاعر موصوف سرزمینِ عراق اور خطۂ بغداد کے دل فریب مناظر سے اپنی والہانہ شیفتگی کا ثبوت اس طریقہ سے پیش کرتا ہے

"اے عراق کے آسمان! تم کس قدر صاف اور پاکیزہ نظر آتے ہو اور اسی وجہ سے بہترین آسمان ہو۔ میری طرف دیکھو کیوں کہ میرے دل و جان تم سے انتہائی محبت کرتے ہیں، مجھے اس وقت دیکھو جب صبح کے وقت خاموشی سے شجر پر عنادِل نغمہ زن ہوں، مجھے رات کے وقت دیکھو جب ستاروں کی نگاہوں سے رات کی تاریکی میں آفتاب غائب ہو جائے، مجھے اس وقت دیکھو جب رات کے سناٹے میں مخلوقِ خدا خاموش ہو اور روئے زمین پر کوئی شور و غل نہ ہو۔ میرے دیکھنے کا وہ وقت بھی کیا خوب ہے جب فطرت رات کی تاریکی میں چشموں کے نغمے سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو۔

اس وقت بھی مجھے دیکھو جب موسمِ خزاں میں درختوں سے پتے جھڑ جائیں اور جب باغ پھولوں سے اور اس کے پھول تر و تازگی سے خالی ہو جائیں۔ مجھے اپنی چشمِ نیلگوں سے چپکے چپکے بادلوں کے جھروکوں سے بھی دیکھو۔ اے آسمان! اگر تم مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تو میری آنکھیں روتے وقت بھی تمھاری شکر گزار نظر آئیں گی۔"

حق گوئی کی حمایت میں شاعر موصوف اس طرح نغمہ سنج ہے

"حق کی حمایت سے تمہیں جاہلوں کا شور و غوغا نہ باز رکھے کیوں کہ جو سچائی کا دل دادہ ہے وہ لوگوں کے سب و شتم کی پرواہ نہیں کرتا۔ سچائی حقیقت بن کر ہمیشہ باقی رہتی ہے خواہ مغرور انسان اس سے چشم پوشی کرے"

حریت و آزادی کے بارے میں شاعر اس طرح نغمہ سرا ہے

"میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ حریت پسند شاعر کا کیا فرض ہے؟ جب وہ اپنے شعروں میں حقیقت نگاری کرنا چاہے

(۲) لوگ چاہتے ہیں کہ ایسا شاعر خاموش رہے یہاں تک کہ وہ قبر میں غائب ہو جائے مگر آزاد شاعر کے دل میں ایسے جذبات بھرے ہوئے ہیں جو اسے کھلم کھلا اظہارِ خیال پر آمادہ کرتے رہتے ہیں"

ایک دوسری نظم میں حریت و آزادی کی نعمت کا گیت اس طرح الاپتا ہے۔

"زندگی میں اگر آزادی مل جائے تو وہ ایک لازوال نعمت ہے۔ اسی لئے ہماری محبوب آزادی کا گیت گاؤ جو ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہے، ہاں وہ ضرور لوٹ کر آئے گی جس طرح آفتاب غروب ہونے کے بعد طلوع ہوتا ہے اسی طرح حریت و آزادی کی بدولت ایک طویل عرصہ تک ہمارا شمار فاتح قوموں میں تھا۔ مگر غدار زمانہ نے ہماری امیدوں کا خاتمہ کر دیا جس کا ہمیں وہم و گمان بھی نہ تھا تاہم ایک دور ایسا بھی آئے گا جب زمانہ ہمیں اس کی خوش خبری سنائے گا"

حقوقِ نسواں کی حمایت میں شاعر موصوف نے بہت عمدہ نظمیں لکھی ہیں اور اسی حمایت کے سلسلہ میں بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں طوالت کے خوف سے ان نظموں کا ترجمہ نہیں پیش کیا جا سکتا تاہم اسی سلسلے میں دو شعروں کا ترجمہ پیش کیا جائے گا شاعر کہتا ہے

یرفع الشعب فرقان اناث و ذکور

وهل الطائر الا بجناحیه یطیر

"قوم کو مرد و عورت دونوں جماعتیں مل کر سربلند کرتی ہیں جس طرح ایک پرندہ اپنے دونوں بازوؤں کی بدولت پرواز کرتا ہے"

شاعر موصوف آخر زمانہ میں ...... معذور و لاچار ہو گئے تھے اور قوم کی ناقدردانی سے متاثر تھے اسی سلسلے میں انھوں نے یہ دو شعر کہے ہیں

انا لا یسأل عنی احد حین اغیب

انا کالرحمۃ مفقود و کالحق غریب

"میرے بارے میں کوئی نہیں سوال کرے گا جب میں دنیا سے غائب ہو جاؤں گا۔ اس وقت میری مثال ایسی ہو گی جیسے کہ خدا کی رحمت جو مفقود ہے یا جیسے حق و صداقت (اس ملک میں) اجنبی ہے"

زہاوی کی شاعری کا ایک علمی اور تعلیمی پہلو بھی ہے چوں کہ اس کو فلسفہ اور خاص کر فلکیات اور طبیعیات سے گہری دل چسپی تھی اس لئے اس نے اپنی نظموں میں اجرام فلکی اور طبیعیات کے قوانین کو عمدہ پیرائے میں نظم کیا ہے اس نے سائنس اور اس کی معلومات پر اس قدر نظمیں تحریر کی ہیں کہ موجودہ نقاد اُن سے اُکتا کر اس کا شمار ان قدیم شعراء میں کرتے ہیں جنھوں نے طلباء کی سہولت کی خاطر علوم و فنون کی کتابوں کو منظوم شکل میں تحریر کیا تھا چنانچہ حال میں ایک مصری نقاد ڈاکٹر شوقی ضیف نے "العلم فی شعر الزہاوی" کے نام سے ایک مقالہ تحریر کیا ہے جس میں اس کی نظموں کا نمونہ پیش کیا گیا ہے جن میں فلکیات اور طبیعیات کے مسائل بیان کئے گئے ہیں اور ان نظموں کا نمونہ بھی درج کیا گیا ہے جن میں ڈارون کے نظریہ نشو و ارتقاء پر بحث کی گئی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ زہاوی بالکل مادہ پرست نہیں تھا بلکہ وہ اصلاح پسند اور مذہب کا قائل تھا اسی طرح وہ مادیت اور روحانیت کی کشمکش میں مبتلا رہا۔

زہاوی کی ان تمام علمی و تعلیمی نظموں کا تذکرہ کرنے کے بعد نقاد موصوف یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اس کی ان تعلیمی نظموں میں شعریت نہیں ہے وہ رقمطراز ہے۔

"اس نے ان نظموں میں اپنے احساسات اور جذبات کو بہت کم شامل کیا ہے اس کے ان اشعار کو پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایسے وحشت ناک صحرا میں آئے ہیں جس میں کوئی زندگی نہیں ہے اور نہ دلچسپی کا کوئی سامان ہے، اس میں دلچسپی کیسے پیدا ہو سکتی ہے جب کہ وہ یہ معلومات پیش کرتے وقت نہ رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور نہ خوش ہوتا ہے، اس وقت وہ بڑا عالم ہوتا ہے اور اپنے علم میں جذبات کو شامل نہیں کرتا۔ اسی طرح اس نے شعر و شاعری پر ایسا بھاری بوجھ ڈال دیا ہے جس کو برداشت کرنے کی اس میں طاقت نہیں ہے، اسی طرح ان نظموں میں نہ صرف شعریت مفقود ہے بلکہ شعری زبان اور موسیقی پر بھی برا اثر پڑا ہے کیوں کہ جب وہ علم کی گھاٹیوں اور اس کے پیچ در پیچ جنگلوں میں گھستا ہے تو زبان و موسیقی دونوں چیزوں کا پتہ نہیں چلتا"[۱]

ڈاکٹر شوقی ضیف کی رائے ان مخصوص نظموں کے بارے میں ایک حد تک صحیح ہے مگر زہاوی کی عظمت اور شہرت ان نظموں کی وجہ سے نہیں ہے اس کی عظمت ان لافانی نظموں کی بنیاد پر قائم ہے جن میں اس نے حریت و آزادی اور حب الوطنی کے گیت گائے ہیں اور جن کا بہت تھوڑا نمونہ ہم ابھی پیش کر چکے ہیں، ان نظموں میں سچے جذبات و احساسات کی فراوانی ہے اس قسم کی نظمیں جدید عربی شاعری میں ایک بیش بہا اضافہ ہے، اس کی ان مخصوص تعلیمی نظموں میں اگرچہ بہت زیادہ شعریت نہیں ہے بلکہ علم و حکمت کا عنصر غالب ہے تاہم یہ نظمیں بھی اس کی ادبی اور فنی صلاحیت اور قادر الکلامی کا زبردست ثبوت ہیں کیوں کہ ان نظموں میں شاعر موصوف نے عربی نظم میں پہلی دفعہ جدید سائنس کے دقیق مسائل اور نظریوں کو آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس طرح ملک کے نوجوانوں کو فلکیات اور طبعیات کے مسائل میں دلچسپی لینے پر آمادہ کیا ہے۔

---

[۱] دراسات فی الشعر العربی المعاصر مطبوعہ مصر صفحات ۱۱۸ - ۱۱۹

اگر اس چیز کی افادی حیثیت بھی تسلیم نہ کی جائے تب بھی زہاوی کی نظموں کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جو اسے زندۂ جاوید بنانے اور لافانی شہرت دینے کے لیے کافی ہے

معروف رصافی | عراق کی جدید شاعری کا دوسرا علم بردار شاعر معروف الرصافی تھا۔ زہاوی کی طرح وہ بھی ابھی تک تمام عربی دنیا کا ہر دل عزیز شاعر ہے۔ آج کل کے عراقی نوجوان شعراء کی طرح ان دونوں شاعروں نے عروض و قوافی میں تجربے نہیں کیے بلکہ انھوں نے عربی شاعری کی کلاسیکل شکل کو برقرار رکھا مگر معانی و خیالات کے لحاظ سے بہت تبدیلیاں پیدا کیں۔ قدیم شعراء صرف اپنے ذاتی جذبات و خیالات کی ترجمانی کرتے تھے یا حکام و امراء کی قصیدہ خوانی ان کا مطمح نظر تھا عوام اور قوم کے دکھ درد، ان کے رنج و غم یا شادی و مسرت کے اظہار سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ معدودے چند شعراء کو چھوڑ کر جن میں ابوالعلاء المعری کی شخصیت زیادہ نمایاں ہے، اور کوئی عوام کا ترجمان نہیں بن سکا۔ عراق کی جدید شاعری میں عوام کے دکھ درد کا اظہار سب سے پہلے معروف الرصافی نے کیا۔ اس کی شاعری میں عوام کے رستے ہوئے ناسوروں کو واشگاف کیا گیا ہے اور شاعر موصوف نے بلا تفریق مذہب و ملت، ہر مصیبت زدہ سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا ہے اس کی شاعری آفاقی ہے اور رنگ و نسل، مذہب و ملت کی حدود سے آزاد ہے۔[1]

رصافی کی شاعری میں رنج و غم کے جذبات زیادہ نمایاں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے زمانے میں عراق کی سیاسی معاشی اور معاشرتی حالت نہایت ابتر تھی وہ عثمانی دورِ خلافت کا انتہائی پس ماندہ صوبہ بن کر رہ گیا تھا ترکی حکام لوگوں پر ظلم و ستم کرتے تھے اور خاص کر سلطان عبدالحمید خاں کا "دورِ استبداد" اپنی رعایا کے لئے بہت تباہ کن رہا۔ مصر ایک حد تک ترکوں کے پنجے سے آزاد تھا اسی لیئے وہ اس زمانے میں

[1] دراسات فی الشعر العربی المعاصر از ڈاکٹر شوقی ضیف صفحات ۳۵ تا ۳۶ مطبوعہ مصر

عربی ممالک کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک تھا۔ شام و لبنان میں بھی امریکن اور مغربی ممالک کے مشنری پادریوں اور علماء کی بدولت علم و ادب کی روشنی پھیلنی شروع ہو گئی تھی مگر عراق میں جہالت و استبداد کا دور دورہ تھا وہاں صحیح معنوں میں کوئی تعلیمی ادارہ حکومت کی طرف سے قائم نہیں تھا صرف فوج اور ان کے بچوں کے لئے چند معمولی ادارے قائم تھے اور رصافی کو بھی مجبور ہو کر ان میں سے ایک میں داخل ہونا پڑا اگر وہ اپنے تعلیمی مراحل کو کامیابی کے ساتھ طے نہ کر سکا۔ اسی لئے وہ بغداد کے مشہور عالم علامہ محمود لشکری الالوسی کی خدمت میں حاضر ہوا اور بارہ سال تک اُن سے فیض یاب ہوتا رہا آلوسی خاندانِ عراق کا مشہور علمی اور مذہبی خاندان تھا چنانچہ علامہ موصوف کے فیضِ صحبت نے رصافی کے دل میں انسانی ہمدردی اور شفقت کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیئے۔

اس عرصہ میں رصافی معلم کی حیثیت سے مختلف تعلیمی مدارس میں کام کرتا رہا ان تعلیمی مشاغل کے ساتھ اس کی شاعری بھی جاری رہی۔ چوں کہ عراق اخبار و رسائل سے خالی تھا اسی لئے اس کی نظمیں مصر کے مجلہ المقتبس اور مشہور اخبار المؤید میں چھپتی رہیں جن میں ملک کی سیاسی اور سماجی حالات پر کڑی تنقید ہوتی تھی۔

ترکی مملکت میں دستوری اصلاحات نافذ ہونے کے بعد شاعر موصوف نے استنبول کا سفر کیا وہاں وہ ایک سرکاری تعلیمی ادارہ کے معلم اور مشہور قومی جریدہ سبیل الرشاد کے مدیر مقرر ہوئے وہ ترکی کے مشہور مدرسۃ الواعظین میں عربی زبان و ادب کی تاریخ پر لیکچر بھی دیتے رہے نیز پہلی جنگ عظیم تک وہ ترکی پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے اسی عرصہ میں انھوں نے ترکی زبان میں کافی مہارت حاصل کر لی تھی جنگ عظیم کے خاتمہ پر وہ شام آ گئے وہاں سے وہ بیت المقدس کے دار المعلمین کے پروفیسر مقرر ہو کر گئے اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں جب عراق کے حالات بہتر ہوئے تو وہ بغداد آ گئے اور

وزارتِ تعلیم کے ماتحت ترجمہ و تالیف کی کمیٹی کے نائب صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

عراقی قوم نے ابتدا میں ان کی قدر نہیں کی اور وہ بہت تکلیف اُٹھاتے رہے مگر جب ملک آزاد ہوا اور لوگوں میں علمی شعور پیدا ہوا تو ان کی بہت عزت اور احترام ہوا اور اب ان کے مرنے کے بعد انھیں قومی شاعر تسلیم کرتے ہوئے ان کے شاعرانہ کمالات پر کتابیں اور مقالات تحریر کئے جا رہے ہیں، ان کے اشعار کے وہ مجموعے جو وہ اپنی زندگی میں شائع نہیں کر سکے تھے، شائع کئے جا رہے ہیں۔

رصافی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے قصہ کے انداز کو عربی شاعری میں مقبول بنایا جس کی قدیم شاعری میں بہت بڑی کمی تھی ان منظوم قصوں میں زیادہ تر بیکس بیوہ عورتوں اور یتیموں کے دکھ درد کا نقشہ اس انداز میں کھینچا کرتے تھے کہ شعریت کی اصل روح برقرار رہتی تھی، انھوں نے اپنے اشعار میں حریت پسندی۔ بیکس طبقۂ نسواں کی حمایت، غریبوں اور یتیموں کی مفلسی اور بیماری کا ذکر کر کے ملک میں انقلاب برپا کر دیا اور عوام کی ہمدردیاں مظلوم طبقہ کی طرف مبذول ہو گئیں، اس سے پہلے عراق کے اعلیٰ حکام اور سرمایہ دار غریب طبقہ کا کچھ خیال نہیں کرتے تھے مگر انھوں نے اپنے کلام میں بار بار ان کی حمایت کر کے عراقی شاعری کا رخ ہی پلٹ دیا، ان کی ان نظموں کی مقبولیت کو دیکھ کر آنے والے شعرا بھی یتیموں، بیواؤں اور مظلوم طبقۂ نسواں کی حمایت میں کثرت سے نظمیں لکھنے لگے یہاں تک کہ کوئی مشہور عراقی شاعر ایسا نہ تھا جس نے ان موضوعات پر نظمیں نہ لکھی ہوں خواہ وہ قدیم طرز پر شعر لکھتا ہو یا آزاد شاعر ہو۔ بہر حال رصافی کی شاعری کے بھی چار اہم عناصر ہیں

(۱) عمدہ قسم کی وصف نگاری اور لطیف انداز بیان۔

(۲) سماجی اصلاح

(۳) حزن و ملال

(۴) قصہ کے پیرائے میں نظمیں[1]۔

رصافی کی نظمیں بحر طویل میں ہیں اور انداز بیان رزمیہ اور بیانیہ ہے وہ غالباً دنیائے عرب کا سب سے زیادہ نڈر اور بے باک شاعر تھا جس نے سیاسی اور معاشرتی برائیوں کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کی ہے اور اس کے اظہارِ خیال میں اشاروں سے کام نہیں لیا ہے مصری قومی شاعر حافظ ابراہیم بارہا سیاسی وبا میں آکر سیاسی معاملوں میں اشاروں اور کنایوں سے کام لیتا تھا مگر رصافی انجام کی پرواہ کئے بغیر کلمۂ حق کہنے میں بالکل پس و پیش نہیں کرتا تھا۔

پہلی جنگِ عظیم میں جب شریف مکہ نے ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تو اس موقع پر عرب قوم پرستوں نے اسی بنا پر اس کا ساتھ دیا تھا کہ وہ ترکوں کے پنجے سے آزاد ہوں گے عرب اس وقت قوم پرستی کے جذبے میں سرشار تھے کہ کہیں سے یہ آواز بلند نہیں ہوئی کہ دو مسلمان قوموں کی باہمی خانہ جنگی کس قدر شرمناک واقعہ ہے ہمارے ملک کے قومی شاعر علامہ اقبال نے وطنیت اور قومیت کے اس خطرناک رجحان کو محسوس کیا تھا اور اسی موقع پر اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی مگر عرب دنیا میں بہت کم ادیبوں نے اسے محسوس کیا تھا مگر رصافی نے نہایت بلند آواز میں عربوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

ماذا تقول اذا اتیت محمدًا ويداك تقطران من دم الاسلام

(تم کیا جواب دوگے جب روزِ محشر میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایسی حالت میں آؤگے کہ تمہارے ہاتھوں سے اسلام کا خون بہہ رہا ہوگا۔)

رصافی نے "مطلقہ عورت" اور "یتیم" بہت مشہور نظمیں لکھی ہیں خواتین کی حمایت میں اپنے ملکی معاصر زہاوی کی طرح اس کا قلم بہت رواں تھا ایک نظم میں اس نے پہلی جنگ عظیم کے ہیرو

---

[1] الادب العصری فی العراق لرفائیل بطی مطبوعہ المطبعۃ السلفیہ مصر صفحات ۲۶ و ۲۷ و ۴۱

اسمٰعیل خاں ابجدی اور اس کی تصانیف

از

(جناب سید نصیر الدین صاحب ہاشمی)

ارکاٹ (مدراس) کے مشہور شاعر اسمٰعیل خاں ابجدی کا تذکرہ "مدراس میں اردو" میں کیا گیا ہے۔ یہاں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس کا تعارف کرایا جاتا ہے، ابجدی، انور الدین خاں (گوپاوی) رئیس ارکاٹ اور ان کے فرزند محمد علی خاں والاجاہ کے دربار کا شاعر تھا، نہ صرف شاعر بلکہ اس کو "ملک الشعرا" سے بھی ملقب کیا گیا تھا۔

ابجدی نے اپنے جو حالات لکھے ہیں، اس میں وہ بیان کرتا ہے کہ وہ نواب حسین دوست خاں عرف چندا صاحب کے قتل کے بعد جب نواب محمد علی خاں والاجاہ ترچناپلی سے مدراس روانہ ہوئے تو اس زمانہ میں وہ ایک غیر معروف چھوٹے مقام پر رہتا تھا اور بڑی تکلیف میں بسر ہوتی تھی، رفتہ رفتہ اس کے اشعار کی شہرت ہوئی اور نواب والاجاہ تک اس کی قابلیت کا شہرہ پہنچا، موصوف نے طلب کر کے اپنی ملازمت میں شامل کر لیا[1]۔

بقول بعض ابجدی کا نام سید شاہ میر تھا، مگر یہ غلط ہے کیوں کہ سید شاہ میر اس کے باپ کا نام ہے، مصنف توزک والاجاہی نے جو خود بھی بڑا صاحب علم تھا۔ ابجدی کی قابلیت کی تعریف کی ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے

"در علم فارسی کما حقہ و در عربی فی الجملہ صاحب مراد بہ فن شعر و انشا سراپا استعداد"[2]

ابجدی کے حالات غلام محمد غوث خاں والاجاہ نے (جو محمد علی والاجاہ کی اولاد میں

---

[1] سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد کے فارسی مخطوطات کی فہرست مرتبہ ڈاکٹر محمد غوث مخطوطہ[2] توزک والا جاہی قلمی کتب خانہ منزل ریکارڈ آفس حیدرآباد

شامل ہیں، ارکاٹ کے آخری رئیس تھے) اپنے دونوں تذکروں "صبح وطن" اور "گلزار اعظم" میں درج کئے ہیں، "صبح وطن" میں صرف اسی قدر صراحت ہے

"ابجدی تخلص، میر اسماعیل خاں نام نواب عمدۃ الامراء کا استاد تھا، بہت سارے اشخاص اس کی قابلیت سے فیض یاب ہوئے، نواب والا جاہ نے انور نامہ کی تکمیل پر اس کو اس کے وزن کے مطابق چھ ہزار سات سو روپیہ مرحمت فرمائے تھے اور ماہ ربیع الاول ۱۲۰۸ھ میں ملک الشعرا کے خطاب سے ممتاز فرمایا۔ اس کا کلام سادہ متقدمین کے طرز پر ہے"[1]

دوسرے تذکرہ گلزار اعظم میں زیادہ حالات درج کئے ہیں چنانچہ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

ابجدی تخلص مولوی میر اسمٰعیل خاں، سید شاہ میر بیجاپوری کا فرزند، محمد قاسم المتخلص بہ فرشتہ کی (جس نے تاریخ نورس نامہ یعنی تاریخ فرشتہ لکھی ہے) اولاد میں تھا، چنگل پٹ میں جو مدراس سے چھتیس میل کے فاصلہ پر ہے تولد ہوا، عربی فارسی کی اعلیٰ تعلیم اپنے وقت کے ممتاز اور بلند پایہ علماء سے حاصل کی، نواب والاجاہ نے اس کو اپنی ملازمت کے دائرہ میں منسلک کر کے اپنے فرزند نواب عمدۃ الامراء کی تعلیم کے لئے مقرر فرمایا تھا، نواب امیر الامراء بھی اس کی تعلیم سے مستفید ہوئے ابجدی فارسی شاعری میں بلند مرتبہ رکھتا ہے دیوان فارسی اور اردو میں مرتب کئے تھے بیسیوں قصیدے لکھے ہیں ایک قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

ہر عقدۂ مشکل کہ بیک مرتبہ وا شد ۔۔۔ از ناخن تدبیر امیر الامرا شد

ابجدی کی تصانیف میں کئی مثنویاں شامل ہیں یعنی ہفت جوہر اس میں بہرام گور کا قصہ نظم کیا گیا ہے مخزن اسرار نظامی کے جواب میں مثنوی زبدۃ الافکار مرتب کی، اس کے علاوہ انور نامہ، مودت نامہ، قصہ راغب و مرغوب بھی اس کی تصانیف

---

[1] صبح وطن مطبوعہ ۱۲۵۸ھ صفحہ (۲۷) یہ تذکرہ فارسی میں ہے۔

ہیں۔ اس کے علاوہ تحفۃ العراقین کی شرح بھی لکھی ہے جس وقت ابجدی نے انورنامہ لکھ لیا تو والاجاہ نے اس کو چاندی میں تول کر اس کے وزن کے مطابق چھ ہزار سات سو روپیہ مرحمت فرمائے، ۱۱۹۱ھ میں ابجدی کو ملک الشعرا کا خطاب دیا گیا اور ۱۱۹۳ھ میں اس کا انتقال ہوا۔"

توزک والاجاہی میں ایک دلچسپ قصہ ابجدی کے متعلق درج ہے [1]

ان دونوں تذکروں میں جو اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ تذکرہ "صبح وطن" میں ابجدی

---

[1] یہ داستان دلچسپ اور موجودہ زمانہ میں ایک افسانہ سے کم نہیں ہے، بیان کرتے ہیں کہ ابجدی اپنی شادی کے لئے جنگل بیٹ سے پرگنہ کرکٹ پالہ گیا اور وہاں شادی کی تمام رسوم ادا ہوئیں، دولھن کو لے کر اپنی قیام گاہ کو آیا، رات کو جب حجرۂ عروس میں داخل ہو کر سو گیا تو رات کے وقت دروازہ کی زنجیر کی آواز سن کر ابجدی کی آنکھ کھل گئی۔ مگر کوئی اندر آنے والا نظر نہیں آیا۔ دولہن پلنگ پر بدستور سو رہی تھی ابجدی پلنگ پر بیٹھ گیا اور اب کچھ عرصہ کے بعد پورا دروازہ کھل گیا اور کوئی شخص اندر آتا ہوا نظر نہیں آیا۔ اس کو حیرت ہونے لگی اسی عرصہ میں اس کو کسی نے تھپڑ مارا اور مارے وہ بے ہوش ہو گیا، جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو مکان کے صحن میں پڑا پایا اور مختلف طرز کے لوگ اس کو گھیرے ہوئے نظر آئے۔ اور اب وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوا میں اُڑنے لگا اور اتنی بلندی پر پہنچ گیا آبادی، مکانات حتیٰ کہ پہاڑ بھی نظروں سے غائب ہو گئے، اور اس کے کان میں پرندوں جیسی آواز آنے لگی، اور اس سے سوال کیا جانے لگا کہ اس کو سمندر میں پھینکا جائے یا جنگل بیابان میں، اور اس اثناء میں اس کے سر پر ایک ضرب پڑی اور خون جاری ہو گیا اور اب ابجدی کو علم ہوا کہ اس کو جنات پکڑ لے گئے ہیں اور وہ ان کا اسیر ہے، ابجدی نے خدا کی درگاہ میں رسول اللہ صلعم کے وسیلہ سے دعا کی اور یہ شعر پڑھنے لگا

یا حبیب الالہ خذ بیدی ما لعجزی سواک مستندی

کئی مرتبہ شعر پڑھنے کا یہ اثر ہوا کہ اب اس کو بلندی سے پستی کی طرف لانے لگے اور آخر زمین میں ڈال دیا گیا اتفاق سے قلعہ کرکٹ پالہ کی خندق میں پڑا پایا، ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اب صبح ہو گئی اور اس نے لوگوں کو آواز دی اس کی آواز سن کر اس کا ایک دوست حسن محمد آیا اور اپنے مکان پر لے گیا ایک سال تک اس کا علاج ہوتا رہا مگر اس کے بعد بیٹھتے ہی رعشہ ہوتا۔ زبان پر لکنت تھی جودت الطبع باقی رہی اور وہ ایک آدھ میل سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا۔ اور تمام دن میں دو چار ورق سے زیادہ لکھنے کی طاقت نہیں تھی اس لئے ایک ملازم کو لکھنے کے لئے مامور کیا تھا اور زبانی کہہ کر لکھوایا کرتا۔

(گلزار اعظم مطبوعہ)

کے والد کا نام سید شاہ لکھا گیا ہے، غالباً لفظ "میر" سہو کتابت سے متروک ہو گیا ہے کیوں کہ ابجدی کے والد کا نام سید شاہ ہی ہونے کی تصدیق دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے، دوسرا اختلاف یہ ہے۔ صبح وطن میں ملک الشعرا سے سنہ ۱۱۷۰ھ میں ملقب ہونا لکھا گیا ہے اور گلزار اعظم میں سنہ ۱۱۹۱ھ لکھا ہوا ہے ان دونوں سنین کے قطع نظر ایہتے (مصنف کیلاگ) نے سنہ ۱۱۸۹ھ میں ملک الشعرا کا خطاب ملنے کی صراحت کی ہے،

بہر حال ابجدی کے دربار والاجاہی سے ملک الشعرا کے خطاب سے سربلند ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔

ابجدی کی تصانیف میں سب سے اہم کتاب "انور نامہ" ہے اس کی تصنیف سنہ ۱۱۷۴ھ میں ہوئی ہے انور نامہ ایک فارسی مثنوی ہے، جو اسی عنوان پر منقسم، اور (۸۳۰۰) شعر پر مشتمل ہے یہ مثنوی انور الدین خاں گوپاموی کے فرزند محمد علی خاں والاجاہ رئیس ارکاٹ کے حسب خواہش لکھی گئی ہے، اس میں انور الدین صوبہ دار ارکاٹ کے حالات ابتدا سے ان کے انتقال تک اور پھر والاجاہ کے حالات سنہ ۱۱۷۴ھ (سنہ ۱۷۶۱ء) تک درج ہیں، ایہتے نے یہ صراحت کی ہے کہ انور نامہ میں انور الدین خاں کے حالات درج ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں انور الدین خاں کے انتقال کے بعد محمد علی خاں والاجاہ کے عہد حکومت کے بارہ سال کا حال بھی درج ہے، اور در اصل اسی کو تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

ابجدی نے اکثر واقعات اور حالات اپنے چشم دید نظم کئے ہیں یا پھر سرکاری کاغذات سے اس کا مواد حاصل کیا ہے، اس لئے انور نامہ کی اہمیت تاریخی لحاظ سے بہت زیادہ ہے، اور پھر ادبی لحاظ سے بھی اس کو ایک بلند پایہ مثنوی قرار دینا ضروری ہے، چوں کہ ابجدی فارسی کا قادر الکلام شاعر تسلیم کیا گیا ہے اس لئے یہ مثنوی دو تو لحاظ سے خصوصیت رکھتی ہے

اب تک ارکاٹ کے تاریخی حالات اور انگریزوں اور فرانسیسیوں کی رسہ کشی کی پوری داستان صحیح طور پر مدون نہیں ہوئی ہے اس لحاظ سے مورخین کے لئے یہ کتاب خصوصیت

سے قابلِ ملاحظہ ہے۔

ابجدی کی دوسری تصانیف یعنی قصہ راغب و مرغوب، مودت نامہ ہفت جوہر ہماری نظر سے نہیں گزریں اس لئے ان کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی جا سکتی۔

ابجدی فارسی کے ساتھ اُردو کا ادیب اور شاعر بھی تھا چنانچہ اس کا اردو دیوان مرتب ہوا ہے، مگر افسوس ہے کہ اب تک صرف اس کا ایک ہی نسخہ ہم دست ہو سکا ہے جو انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ دیوان کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

گرم ہے ہنگامہ ہر سو یار کا ہے تماشا جلوۂ دیدار کا
منکرِ رویت نہ ہو اے فلسفی دیدہ ہے یہاں دیدۂ درچار کا
جان دینے پر بھی گر ٹھہرے یہ مول مفت ہے سودا ترے بازار کا

ابجدی کی اردو تصانیف میں اس دیوان کے علاوہ ایک اور کتاب "تحفۃ الصبیان" ہے، یہ کتاب بچوں کی تعلیم کے لئے لکھی گئی ہے اس کے اندر عربی فارسی الفاظ کے معنی اور قواعد وغیرہ کا تذکرہ ہے، یہ رسالہ والا جاہ کے پوتے عبد العلی کے لئے لکھا گیا ہے اس کا ایک مخطوط نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں ہے۔

آغاز

اللہ الہ خدا کا ناؤں سبھی جا گے اس کا ٹھانوں
رسول نبی ہے پیغمبر افضل سب میں ہے بہتر

مصنف نے اس رسالہ کے متعلق جو صراحت کی ہے وہ یہ ہے

مندرج اس میں ہے لغاتِ عرب مندمج اس میں اصطلاحِ عظام
محتوی حاملِ قواعد ہے مشتمل بر فنون شعر و کلام
چند در چند اس میں ہے داخل از رموزِ فوائدِ اسلام

نام اس کا ہے تحفۃ الصبیاں		تا کہ ہو طفل گان کو استغلام

بعد مدت کے بحسبِ آرزو		کل کیا یہ نسخۂ رنگیں بہار
میں لکھا عبد العلی خاں واسطے		وہ ہے صاحب زادۂ والاتبار
لطف اس کا کارفرمائے حباب		ذات اس کی سایۂ پروردگار
نورِ بخشِ دیدۂ روشن دلاں		باغ مقصد کا درختِ باردار

..		..		..		..		..

نامور جد اس کا والا جاہ ہے		ہے پدر اس کا امیرِ نام دار

اختتام

سات سو پر ہے بیت چالیس		قل ما دل ہووے زیبِ کلام
خیر پر یہ رسالۂ رنگیں		ختم ہے والسلام والاکرام

خاتمہ

"تمت الرسالہ تحفۃ الصبیاں بعون الملک المستعان بتاریخ نہم ذیقعدہ سنہ ۱۲۰۲ھ"

ابجدی کی کوئی کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی خصوصاً انور نامہ ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔

دنیائے اسلام

از

(جناب مدیر لائف انٹرنیشنل نیویارک)

مترجم

(جناب پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے)

(۲)

حضرت محمدؐ نے اپنی زندگی میں ذاتی طور پر عورت کی سماجی حیثیت کو بلند کیا تھا۔ لڑکیوں کے قتل عام کی مذمت کرتے ہوئے آپ نے یہ بتایا کہ لڑکے اور لڑکیاں دونوں خدا کی عطا کردہ نعمتیں ہیں۔ اسی طرح بدوؤں کی لاتعداد شادیوں کی مخالفت کرتے ہوئے انھوں نے تلقین کی کہ تمھاری نظر میں جو عورت خوبصورت اور نیک ہو اس سے بیاہ کرو۔ دو، تین یا چار عورتوں سے بیاہ کیا جا سکتا ہے لیکن اگر یہ خدشہ ہو کہ چاروں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ نہیں ہو سکتا تو ایک ہی سے شادی کرنی چاہیئے۔ آج بہت سے مسلمان حضرت محمدؐ کے ان الفاظ کو ایک شادی کے حق میں پیش کرتے ہیں اور اس بنیاد پر اور معاشی وجوہات کی بناء پر مسلمانوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو ایک یا دو بیویاں رکھتے ہیں۔ دوسری قدیم رسومات اسلام سے خارج ہو رہی ہیں یا مٹ رہی ہیں۔ ترکی مکمل طور پر اور مصر، شام، لبنان، ایران، عراق اور فلسطین میں بڑی حد تک پردہ کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ آج بھی عرب کے بعض حصوں شمالی افریقہ اور خصوصاً پاکستان میں جو تمام مسلم اقوام میں عورتوں کے لئے انتہائی قدامت پرست رجحان اور نظریہ رکھتا ہے پردے کا رواج پایا جاتا ہے۔ تاہم پاکستان میں صرف شہری عورتوں کی نصف تعداد جو کل آبادی کا ایک نہایت ہی قلیل حصہ ہے

پردہ کرتی ہے۔ چند مسلم ممالک میں جن میں پاکستان بھی شامل ہے عورتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں اور انھیں حق رائے دہندگی بھی دیا گیا ہے۔ اسلام میں عورتیں ہر جگہ ان سماجی پابندیوں کے خلاف بغاوت کر رہی ہیں، روشن خیال مسلمانوں کے نزدیک اسلامی زندگی میں ٹھہراؤ کی ایک وجہ عورتوں کو مفلوج بنا دینا ہے چند اور اسلامی رواج جو یا تو ماخوذ ہیں یا مذہب کی طرف سے عائد کردہ ہیں بعد کے دو صفحوں پر دیئے جاتے ہیں۔

"ایک مسلمان بچے کی ختنہ کی جاتی ہے"

اسلام میں دوسری رائج رسوم کی طرح رسم ختنہ بھی اُس عہد کے مروجہ مذہبی رسوم سے اپنائی گئی تھی اور اس رسم کو حضرت محمدؐ نے سب سے آخر میں رواج دیا۔ قرآن میں 'ختنہ' سے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ شاید اس لئے کہ غیر ضروری سمجھا گیا۔ زمانۂ قدیم سے یہ رسم مصریوں، ابی سینیا والوں، عربوں اور یہودیوں میں رائج تھی۔ آج ساری دنیا کے مسلمان اس رسم کو ادا کرتے ہیں اور اسے بھی عقائد کی ایک کڑی سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ اس رسم سے متعلق نظریات میں جگہ جگہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ مقامات پر اسے حکم سمجھا جاتا ہے۔ لیکن 'لازمی' نہیں سمجھتے۔ دوسرے مقامات پر اسے ضروری اور لازمی سمجھا جاتا ہے یعنی جو 'ختنہ' نہ کرے وہ صاحب ایمان نہیں۔ بہت سے علاقوں کے لئے یہ رسم جشن کے طور پر منائی جاتی ہے یعنی اس موقع پر دعوتِ طعام اور محفلِ رقص وسرود منعقد کی جاتی ہے۔

"تکفین و تجہیز"

اگر رسوماتِ تکفین و تجہیز کو مفصل طور پر دیکھا جائے تو ہمیں بہت سے اختلافات نظر آئیں گے لیکن عام طور پر مسلمان تجہیز و تکفین کے سلسلے میں ایک ہی مرکزی مذہبی دستور کی پابندی کرتے ہیں۔

جوں ہی ایک شخص کی موت واقع ہوتی ہے اس کے جسم کو دھویا جاتا ہے یعنی غسل دیا جاتا ہے۔ ہاتھوں کو اس طرح رکھا جاتا ہے جیسے کوئی عبادت میں مصروف ہو اور لاش کو کفن میں

رکھا جاتا ہے۔ اس سے قبل کہ میت کا چہرہ ہمیشہ کے لئے چھپا دیا جائے۔ اس کے رشتہ دار اور عزیز اس کا آخری دیدار کرتے ہیں۔ قبرستان میں تلاوتِ کلام الٰہی کی جاتی ہے اور میت کے کانوں میں یہ جملے کہے جاتے ہیں 'تمھارا رب کون ہے؟' 'اللہ' 'تمھارا دین کیا ہے؟' 'اسلام' 'اس کے رسول کون ہیں؟' 'محمدؐ' یہ ان جوابات کی یاد دہانی کے لئے ہے جو قبر میں منکر و نکیر نامی فرشتے اس سے دریافت کریں گے، کیوں کہ اگر ان فرشتوں کے سوالات کے جوابات دینے میں غلطی سرزد ہو جائے تو وہ قیامت تک اُسے اذیت اور تکلیف دیں گے۔ لاش کو قبر میں اس طرح اتارا جاتا ہے کہ اس کا منہ کعبہ کی طرف رہے۔ ایک اصول کے تحت کفن حذف کیا جاتا ہے تاکہ فرشتوں کی آمد پر لاش ٹھیک طرح بیٹھ سکے۔

ماہِ رمضان

'نزولِ قرآن پر اظہارِ تشکر کا مہینہ'

حضرت محمدؐ پر سب سے پہلے وحی 'شبِ قدر' میں نازل ہوئی۔ 'شبِ قدر' روایتاً اسلامی سال کے نویں مہینے رمضان کی ۲۷ رتاریخ کو ہوتی ہے۔ اسی لئے حضرت محمدؐ نے اعلان کیا کہ رمضان کا پورا مہینہ روزے رکھنے کا مہینہ ہے۔ اس ماہ میں قرآن کا نزول ہوا۔ اور اعلان کیا گیا 'ماہِ رمضان کے دوران میں جنت کے دروازے کھلے رہتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند رہتے ہیں اسی طرح شیطان مہینہ بھر گرفتار رہتا ہے۔ روزہ کے تصور سے حضرت محمدؐ عرصے سے متعارف تھے اس سے قبل یہودی اور عیسائی تسخیرِ نفس اور قربِ الٰہی کے لئے روزہ رکھا کرتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں روزہ غروبِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک ہوتا تھا لیکن حضرت محمدؐ نے اس کے برخلاف پورے مہینے کے روزوں کا اعلان کیا اور روزے کے مختلف اوقات مقرر کئے یعنی صرف روزِ روشن ہی میں روزہ رکھا جائے۔ صرف اس وقت تک کھاؤ اور پیو جب تک کہ صبح کاذب کے وقت ایک سفید ڈوری کی ایک

سیاہ ڈوری کے مقابلے میں تمیز نہ کر سکو۔ اس کے بعد غروبِ آفتاب تک مکمل روزہ رکھو۔
اکثر مسلمانوں کے نزدیک تمام مذہبی فرائض میں رمضان کے روزے سب سے اہم ہیں اور وہ انھیں نہایت پابندی سے انجام دیتے ہیں۔ بیمار، ضعیف، نابالغ اشخاص اور حاملہ عورتوں کے علاوہ ہر مسلمان کو ماہِ رمضان کے دوران صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک کھانے، پینے اور مباشرت سے لازمی طور پر اجتناب کرنا چاہیئے۔ ایک دن کا روزہ ذرا سے جھوٹ یا بری نظر کی وجہ سے باطل ہو جاتا ہے۔ روزے کے درمیان ان اوقات کو عبادت اور ریاضت میں گزارنا چاہیئے لیکن کچھ لوگ محض سو کر گذارتے ہیں اسی طرح تجارت اور عوامی مشاغل دن کے وقت سست رفتاری سے انجام پاتے ہیں لیکن جوں ہی مغرب کی اذان ہوتی ہے زندگی میں تازگی آجاتی ہے۔ رمضان کے خاتمے پر کرسمس سے مشابہت رکھتا ہوا ایک جشنِ عید منایا جاتا ہے۔ اس روز نمازِ شکرانہ ' ادا کی جاتی ہے بھائی چارہ کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور تحفے تحائف پیش کیے جاتے ہیں۔

صوفیائے کرام مختلف طریقوں سے قربِ خداوندی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں

دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی ایسے اشخاص گذرے ہیں جو عمیق تر مذہبی تجربات کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تاکہ اس طرح وہ قربِ الٰہی سے مشرف ہوں آٹھویں صدی میں چند مسلم صوفیائے کرام نے رہبانی اشغال اپنائے۔ بارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں برادرانہ فضا میں ایک عظیم درویش برادری کا قیام عمل میں آیا۔ آج درویشوں کے ستر خانوادے ہیں، مغربی ممالک میں سب سے زیادہ مشہور فرقہ 'مولویہ' ہے جو مذہبی دوروں کی وجہ سے 'سیاح درویش' بھی کہلاتے ہیں۔ 'شیعہ' فرقے کے کچھ لوگ مختلف خصوصیات کے حامل ہوتے ہوئے بھی اپنے مذہبی میلانات و رجحانات کے زیرِ اثر ہر سال دس روز تک حضرت محمدؐ کے نواسے حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا

عشرہ مناتے ہیں جس میں شان و شوکت کا اظہار کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے جانشینوں کی حیثیت سے جسمانی تکلیف دہی کے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ جن پر ہندوستان کے علاوہ عراق اور ایران میں پابندی عائد کی گئی ہے۔

"ایک نیا فرقہ جو اسلام میں ایک نئی رسالت تسلیم کرانا چاہتا ہے"

کوئی مذہب اسلام کی سی اس تیز رفتاری سے نہیں پھیلا لیکن تبلیغ کا طریقہ مغربی نظریہ سے ملتا جلتا نہ تھا۔ یعنی اسلام میں ترویج و اشاعت صرف تلوار اور شعلوں کے ذریعہ کی گئی۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام 'جہاد' کی اجازت دیتا ہے۔ اکثر مفتوح لوگوں نے معافی کی خواستگاری پر اسلام کو ترجیح دی اور مسلمان ہو گئے۔ مسلمانوں نے اکثر یہودیوں اور عیسائیوں کو جزیہ اور خراج ادا کرنے میں مذہبی آزادی دی۔ اکثر اشخاص نے اس کی بہترین مذہبی پالیسی کی وجہ سے اسلام اختیار کیا اور ان صدیوں میں جب کہ بوستانِ اسلام میں شگفتگی اور بہار چھائی ہوئی تھی۔ نہایت ہی خاموش اور پُر سکون طریقے پر اس کی اشاعت ہوتی رہی۔ عرب تُجّار نے اسلامی احکام کو ہندوستان، چین اور انڈونیشیا تک پہنچا کر اشاعتِ اسلام کے لئے بہت سی کوششیں کیں۔ موجودہ وقت تک اسلام میں کوئی 'منظم تبلیغی تحریک' نہیں تھی جہاں ایک طرف کثر مسلمانوں نے خدا اور انسان کے درمیان کسی کی سفارش سے انکار کر کے کسی مستقل نظامِ پیشوائی کو فروغ نہ پانے دیا وہاں دوسری طرف اسلامی عقیدے نے ہر مسلمان کو 'مبلغ' قرار دیا۔ اسلام خود اپنے غرور کا بھی شکار ہوا۔ دوسرے مذاہب کے عقائد سے نفرت اور حقارت کی وجہ سے بیرونی نئی اور مفید تجاویز کو اپنانے سے اسلام نے انکار کیا، لیکن آج یہ علامات نظر آرہی ہیں کہ اسلامی تبلیغ نے عیسائی تبلیغ کی اصطلاح میں دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔ قاہرہ کی قدیم یونیورسٹی جامعہ الازہر، جو اسلامی فراست کا ایک مرکز ہے اور جس نے مغربی اثرات کی کافی مخالفت کی تھی۔ اب اس تبلیغ کے میدان میں طلبہ کو تربیت دے رہی ہے اور بہت سے مذہبی ادارے

اور ان کی شاخیں مذہبی زور اور تاثیر کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ ان تمام میں سب سے زیادہ زوردار اور اہم فرقہ 'احمدیہ' ہے جس کے مرکزی مقامات پاکستان میں ہیں۔ اور جس کے مبلغین یورپ، افریقہ، امریکہ اور مشرقِ بعید میں پھیلے ہوئے ہیں۔

'احمدیہ' جماعت کی تحریک گذشتہ نصف صدی میں ہندوستان سے اُٹھی اس کی ابتدا اسلام کی دیگر جماعتوں اور فرقوں کی طرح غیر معمولی تھی۔ ۱۸۹۰ء میں پنجاب کے ایک مقام قادیان سے مرزا غلام احمد نامی ایک مصلح نے یہ اعلان کیا کہ وہ نئی وحی اور عہدِ جدید میں اسلام کی نئی تعبیرات کا پیغامبر ہے۔ اُس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ اُس سے متعلق قرآن اور انجیل دونوں مقدس کتابوں میں پیشین گوئی کی گئی ہے اس نے عیسیٰؑ اور مہدیؑ ہونے کا بھی دعویٰ کیا اور یہ کہا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ سے مشابہت رکھتے ہوئے خصوصیات کا حامل ہے۔ (بعد میں اُس نے خود کو حضرت عیسیٰؑ پر فوقیت دی) چند سالوں کے بعد اُس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ ہندو مت کے 'کرشنا' کا وہ اوتار ہے (لائف انٹرنیشنل ۴ر اپریل) اُسے اپنی پیشینگوئی کی قابلیت پر بھی فخر حاصل تھا۔ اُس نے اپنے مخالفین کی اموات کے بارے میں جو پیشینگوئیاں کی تھیں وہ اس حد تک صحیح ثابت ہوئیں کہ حکومت کرنے اور اُس پر پیغمبرانہ قوت کے استعمال کرنے پر پابندی لگادی۔ اس کی تعلیمات آزاد خیالی پر مبنی تھیں وہ اشاعتِ اسلام شمشیر و جہاد کی بجائے تلقین و ہدایت سے کرنا چاہتا تھا۔

۱۹۰۸ء میں مرزا احمد کی وفات کے بعد اُس کے پیروکار دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک 'قادیانی' گروہ جو مرزا احمد کو پیغمبر کی حیثیت سے تسلیم کرتا تھا اور دوسرا گروہ جو اس نظریہ کی مخالفت کرتا تھا۔ آخر الذکر گروہ نے اشاعتِ اسلام کے لئے لاہور میں ایک 'سوسائٹی' قایم کی۔ آج یہ دونوں گروہ تمام عالم میں تبلیغی کام کر رہے ہیں۔ قادیانیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انھوں نے افریقہ میں جو اس تبلیغ کا خاص نشانہ تھا، ساٹھ ہزار اشخاص کو اس مذہب میں شامل کرایا۔

یہ واضح ہے کہ دنیا میں اسلام جہاں کہیں پھیلا ہے صرف اس وجہ سے کہ 'سفید' نسل کے لوگ تعصب اور جانبداری کی وجہ سے عیسیٰؑ کی ان تعلیمات کو بھول بیٹھے جس میں انھوں نے انسانی برادری اور مساوات پر زور دیا تھا۔

عیسائیت اور یہودیت کی طرح اسلام بھی جنوب مشرق کے بحر روم سے ملحقہ علاقوں کے قبائل سے شروع ہوا۔ یروشلم کی وہ پرانی چٹان جو عیسائیت سے قبل کے عہد میں ایک قربانگاہ کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے لئے ایک مقدس عبادت گاہ بن گئی۔ حالاں کہ اس سے قبل کبھی بھی مسلمانوں نے اسے استعمال نہیں کیا تھا دنیا کی مختلف النوع اسلامی آبادی میں مختلف نسل و قوم کے لوگ ہیں اور اکثریت ان لوگوں کی ہے جو دیگر رنگوں اور نسلوں کے گروہوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔ ان میں سے تین چوتھائی آبادی ایشیا میں بستی ہے اور بقیہ آبادی میں سے اکثر افریقہ میں آباد ہیں، لاکھوں حبشیوں نے جو کل آبادی کا تقریباً پانچواں حصہ ہیں اسلام قبول کیا ہے۔ افریقہ کے چند حصوں میں جہاں عیسائیت اور اسلام تبلیغ میں ایک دوسرے کے مقابل ہیں اگر دس اشخاص اسلام قبول کرتے ہیں تو کسی دوسرے مذہب میں صرف ایک ہی شخص داخل ہوتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مغربی افریقہ میں سفید نسل کے مذہب 'عیسائیت'، کے مقابلے میں سیاہ نسل کا مذہب 'اسلام'، ہے، یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جہاں اسلام کے ماننے والوں کی کثیر تعداد ہے اکثر مسلمان یا تو ہندو مت ترک کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں یا ان کے آباء واجداد نے سماجی اونچ نیچ اور ذات پات سے گھبرا کر ایک ایسے مذہب کے دامن میں پناہ لی جو اپنے ماننے والوں میں مساوات کا علم بردار ہے۔ اسلام جیسے جہاں نواز اور روادار مذہب میں، ہر ایک مسلمان، خواہ وہ سفید نسل سے تعلق رکھتا ہو یا سیاہ نسل سے، خواہ وہ سرخ قوم سے تعلق رکھتا ہو یا زرد سے، امیر ہو یا غریب اپنے آپ کو دنیا کے بسنے والے تمام مسلمانوں

کا بھائی سمجھتا ہے۔ توحید کے برحق اصول کے تحت اسلام حکومتِ الٰہیہ کے زیرِ سایہ انسانی برادری کی تخلیق کرتا ہے اسلام کے دائرے میں آنے والے نومسلموں کا بلا تفریق مذہب و ملت مساویانہ استقبال کیا جاتا ہے۔

اس تبلیغی تحریک کے علاوہ اب یہ آثار نظر آرہے ہیں کہ مسلمانوں کے بلند عزائم اور کوششیں اسلام کو اس جمود اور ٹھہراؤ سے نکالنے میں مصروف ہیں جو مغربی دنیا کی بیداری کی وجہ سے اسلام کی عظیم الشان سلطنت پر اثر انداز تھا۔

دنیا کے تمام حصوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں بستے ہیں، سیاسی، روحانی اور معاشی طریقے پر ترقی اسلام میں کوشاں ہیں۔ ترکی میں جہاں اتاترک کی حکومت کے فرمان کے بموجب اسلام کی کافی مخالفت کی گئی تھی۔ اب گزشتہ پانچ سالوں میں تقریباً سینکڑوں مسجدیں بنوائی گئی ہیں اور قومی ریڈیو اب مختلف مذہبی مسائل پر پروگرام نشر کرتا ہے اسی طرح ترکی زائرینِ کعبہ کی تعداد ہر سال کئی ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ ایران میں علم معرفت حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد ۱۹۵۱ء کے مقابلے میں چالیس فی صدی بڑھ گئی ہے۔ یہی کارروائیاں شمالی افریقہ میں بھی نظر آرہی ہیں۔

اسلام کے بین الاقوامی طاقت کی حیثیت سے دوبارہ نمودار ہونے کی ایک نمایاں وجہ سعودی عرب کے بادشاہ شاہ سعود، پاکستان کے سابق وزیر اعظم محمد علی اور مصر کے وزیر اعظم جمال عبد الناصر کی ملاقات ہے جو جمال عبد الناصر کی حج کے لئے پہلی مرتبہ مکہ آنے پر ہوئی تھی۔ وزیر اعظم مصر نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلم ممالک کے سربرآوردہ لوگوں کی ایک کانفرنس ہر سال حج کے موقع پر منعقد کی جائے۔ شاہ سعود نے اس پر اپنی رضامندی ظاہر کی اور تجاویز کا خاکہ تیار کرنے کے لئے ایک مجلس عاملہ کا تقرر کیا جس کے نتیجے میں اس سال حج کے بعد سعودی عرب کے صدر مقام "ریاض" میں اسلامی دنیا کی اس قسم کی پہلی کانفرنس ہوگی۔ مغربی اثرات کی وجہ سے ہر جگہ اسلام میں کشمکش کا احساس پایا جاتا ہے۔ بے دینی اور قومی خیالات کے دباؤ اور

سعودی عرب جیسے ممالک کی افراطِ زر نے مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے تقاضوں اور اسلامی روایات سے مسلمانوں کی وفاداری کے درمیان جو گہرا اختلاف ہے اس سے خبردار کر دیا ہے۔

عہدِ ماضی میں اسلام نے اپنے اندرونی اختلافات سے چشم پوشی کے باوجود بیرونی اثرات سے بے گانگی اور بے زاری برتی۔ آج بہر حال اسلام جو جدید دنیا کی قوتوں سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ جدید قدامت کی اور مذہبی مصلحین جدت کی مخالفت کر رہے ہیں اور اسلام کو فراموش کردہ تصورات و خیالات کی طرف لے جا رہے ہیں کچھ لوگ ماضی کی روایات کو ترک کر دینے پر مصر ہیں۔ ان دو متضاد نظریات کے درمیان درمیانی راستہ ہے جس کے متعلق مبلغین یہ کہتے ہیں کہ اسلام اندرونی طور پر اصلاح کے بعد مغربی ممالک سے مساویانہ اور آزادانہ تعاون کی بنیادوں پر مل سکتا ہے۔ اسلام کی اس اندرونی کشیدگی کی ایک اہم مثال ہمیں پاکستان میں ملتی ہے جہاں اسلامی عقائد کی وجہ سے ایک ایسے دستور کا نفاذ جو سیاسی ضرورتوں اور قرآنی احکامات پر مبنی ہو۔ ایک مشکل اور اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ دوسرے مقامات پر بھی مسلم زعمار اسلامی قوانین کو بدلتے ہوئے سماجی نظام سے مطابق بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سخت اور کٹر مذہبی عقائد میں تجدید کی ایک اور مثال جامعہ الازہر کا وہ اعلان ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آیندہ تعلیمی سال سے جامعہ کے دروازے خواتین کے لئے کھول دئے جائیں گے۔

مشرق اور مغرب، جمہوریت اور اشتراکیت کے درمیان موجودہ عالم گیر کشمکش میں اسلام کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ کیوں کہ اسلام نہ تو مغرب ہے نہ مشرق۔ بلکہ دونوں کا حصہ دار ہے۔ یہ ایک جانب یورپ اور ایشیاء کے درمیان اور دوسری سمت یورپ اور افریقہ کے درمیان چھایا ہوا ہے حالاں کہ اکثر ممالک میں اشتراکی ہیں۔ لیکن تعداد میں قلیل اور غیر منظم ہیں۔ حکومتِ روس میں تقریباً دو کروڑ مسلمان ہیں۔ اس مسلم آبادی کا پانچواں حصہ وسطی ایشیا میں مقیم ہے اور بقیہ لوگ قزاقستان اور ولگا کے مختلف حصوں میں رہتے ہیں تاہم حکومتِ روس اسلام کو اپنا ہمنوا بنانے کی بجائے انھیں دبانے کی ہر ممکن سعی کرتی ہے جس کی رو سے مسلمانوں کو پسماندہ خیال کیا جاتا ہے۔ رجعت

پرست کہہ کر کھلم کھلا ان کی توہین کی جاتی ہے۔ یہ مغربی دنیا کی ایک غلط فہمی ہوگی اگر وہ اسلام کو اشتراکیت کے لئے بطور خود ایک رکاوٹ سمجھیں گے یہ صحیح ہے کہ مذہب اسلام اور عیسائیت ایک ہی بنیاد سے اُبھرے ہیں۔ ان کے درمیان اب بھی بہت سے سماجی اختلافات موجود ہیں جن کو دور کرنا ہے۔ مسلم جذبہ کی موجودہ زبوں حالی کے وقت اشتراکیت مسلمانوں کے لئے ایک لامذہبی سیاسی عقیدہ پیش کر سکتا ہے جب کہ جمہوریت اس سے عاری ہے اس میں شبہ نہیں کہ اسلام جس جانب جائے گا دنیا کے مستقبل پر گہرا اثر ڈالے گا۔ یا اسلام کے زیادہ باشعور رہنما اس حقیقت کا پورا احساس اور آگاہی رکھتے ہیں لیکن اس نظریہ یا راستے کا تقرر آخری تجزیہ پر بالآخر مبنی ہے، اس امر پر کہ اسلام نے کہاں تک اپنے عقاید کو بدلتے ہوئے حالات اور تاریخ سے موافق رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے مسلمان جانتے ہیں کہ ان کے روحانی اور مذہبی مسائل حقیقت میں نازک ہیں جیسے حضرت محمدؐ نے اندازہ لگا لیا تھا کیوں کہ ایک جنگ سے واپسی پر انھوں نے صحابیوں سے کہا کہ "تم ایک کمتر جدوجہد سے ایک اہم اور بڑی جدوجہد کی طرف آئے ہو"، کسی نے پوچھا "وہ اہم جدوجہد کیا ہے؟" تو حضور نے فرمایا "اندرونی جدوجہد"

"شہر یروشلم" جو اپنی مقدس چٹان کی وجہ سے قابل تعظیم و تکریم ہے۔

مکہ اور مدینہ کے بعد اسلام کے مذہبی مقامات میں شہر یروشلم کا نمبر آتا ہے۔ یروشلم میں عیسائیوں اور یہودیوں کے مذہبی مقامات کے علاوہ "قبۃ الصخرہ" بھی ہے جو آج دنیا میں عرب صناعی اور فن کاری کی ایک نمایاں اور قدیم مثال ہے اس گنبد کی تہہ میں جو تیرہ سو سال پہلے بنایا گیا تھا ایک مقدس چٹان ہے جس کی مسلمان تعظیم کرتے آئے، عیسائیت، یہودیت اور اسلام کی ملی جلی روایات میں یہ چٹان مختلف اور اہم واقعات کی جائے وقوع کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک اس چٹان پر فرشتے تخلیق آدمؑ سے بھی پہلے یہاں آئے تھے اور حضرت نوحؑ کی کشتی اسی چٹان پر ٹھہری

تھی، یہیں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی پیش کی تھی اور حضرت الیاسؑ سے لے کر حضرت محمدؐ تک تمام پیغمبر یہاں عبادت کے لئے آئے تھے اسی چٹان سے حضرت محمدؐ شب معراج کو افلاک پر گئے تھے اور قیامت کے دن اسی چٹان سے اسرافیل اپنا صور پھونکیں گے وہ بڑا گنبد جو اس چٹان کو اپنے حصار میں لئے ہوئے ہے بلکہ ان عبادت گاہوں میں جو عہد قدیم سے اس مقدس سرزمین پر کھڑی ہیں تازہ ترین تھیں۔

حضرت سلیمانؑ نے اپنا شاندار عبادت خانہ ۹۶۶ء ق م میں تعمیر کرایا جسے Nebuchadnezzar نے ۵۸۶ء ق۔ م میں منہدم کرایا۔ بابل کے فرفرج کے بعد ۵۱۵ء ق۔ م میں یہاں ایک نیا مندر بنایا گیا جس کی جگہ ۲۰ قبل مسیح میں ہیروڈ (Herod) کے مندر نے لے لی۔ ۱۳۵ء میں شہنشاہ Hadrian نے اسے مسمار کرا کے اس کی جگہ بت پرستوں کا ایک مندر بنوایا۔ دو سو سال بعد ملکہ ہلینا (Helena) جو روم کے پہلے عیسائی قسطنطین کی والدہ تھیں۔ یروشلم آئیں اور تمام مشرکانہ مشہدوں کو منہدم کرانے کا حکم دیا۔ اس وقت سے ۶۳۶ء تک جب کہ خلیفہ حضرت عمرؓ نے یروشلم فتح کیا۔ یروشلم کا تمام فضلہ اس مقدس مقام پر پھینکا جاتا تھا۔ اس ناپاکی اور گندگی سے حضرت عمرؓ کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ انھوں نے خود اس جگہ کو پاک و صاف کرنے میں مدد دی۔

صدیوں سے مسلمان 'قبۃ الصخرہ' کی تعظیم کرتے ہیں اور تمام خاندانوں کے بادشاہوں نے اس پر خصوصی توجہ دی ہے۔ ۱۰۹۹ء سے ۱۱۸۷ء تک جب کہ اس پر صلیبی مجاہدوں کا قبضہ تھا عمارت پر ایک صلیب نصب کر دیا گیا تھا اور چٹان کو قربان گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کسی زمانے میں پادری اس چٹان کے ٹکڑوں کو ہم وزن سونے کے عوض بیچا کرتے تھے اور زائرین اسے تبرک سمجھ کر یورپ لے جاتے تھے۔ لیکن بعد میں عیسائی بادشاہوں نے اس پر ایک لوہے کا جنگلہ بنا دیا اور اس کاروبار کی ممانعت کرا دی۔ یہ جنگلہ آج بھی چٹان کی حفاظت کرتا ہے۔

جس وقت صلاح الدینؒ نے یروشلم فتح کیا تو انھوں نے اُس جنگلے کے علاوہ تمام عیسائی نشانات ہٹا دیے اور عمارت کے اندرونی حصے کو جڑاؤ کام سے خوبصورت بنایا۔ موجودہ عہد میں تاریخی نشیب و فراز نے کافی نقصان پہنچایا جب برطانیہ کو ایک منشور کے تحت فلسطین ملا تو اس نے فوری تعمیر و مرمت کا کام شروع کیا لیکن دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے اسے روک دینا پڑا۔

(خط کا ترجمہ)

اسلام کی رُوحانیت

مدیر، لائف انٹرنیشنل، نیویارک

جنابِ عالی!

آپ کے "لائف انٹرنیشنل" نے ۸ اگست ۱۹۵۵ء کے شمارے میں اپنے قارئین کے سامنے "دنیائے اسلام" کا ایک روشن خاکہ پیش کیا ہے۔ اس جلیل القدر مذہب کے حقائق کو جمع کر کے پیش کرنا ایک عظیم الشان کوشش ہے۔ لیکن یہ معمہ کہ اسلام اس قدر جلد کس طرح پھیلا کسی سے حل نہ ہو سکا۔ اس کا یہ جواب ہے۔

بلاشک اسلام غیر معمولی اور پورے طور سے اس بات پر زور دے رہا ہے کہ اس زندگی کو صحیح معنوں میں کس طرح گذارنا چاہیے۔ مشکل ہی سے زندگی کا کوئی ایسا مسئلہ ہوگا جس کے لئے اس مذہب نے مثالی عملی حل پیش نہ کیا ہو۔ ان تمام اشکال کے پیش نظر ہمیں اسلام کے دقیق مگر اہم ترین روحانی پہلو کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

اس کی روحانیت اس کی اس تلقین پر منحصر ہے کہ خدا اور اس کے حقائق کو صحیح طریقہ پر کس طرح تسلیم کیا جائے۔ خدا ایک ہے اور ہمیں صرف اسی کی عبادت کرنا چاہیے۔ اور یہ اس کا واحد حق ہے اور ہم کسی اور کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں۔ اور یہی روحانی پیغام ہے جو تمام بنی نوع انسان کے لئے مفید ہے۔ محمدؐ کو متعین کیا گیا تھا کہ وہ اس کو تمام کائنات میں مشتہر کر دیں۔

یہ ایک قدرتی امر ہے کہ جب انسان اس پیغام ربانی سے صحیح طور پر آشنا ہوتا ہے تو خدا کی خوشنودی حاصل کرتا ہے اور خالق کے فطری اور آفاقی قوانین سے موافقت کرتا ہے۔ اور جب وہ دوسروں کو ذہن نشین کرانے کے لئے نکلتا ہے تو اسے بے پناہ قدرتی مدد ملتی ہے۔

یہی وہ متحرک قوت تھی جو محمدؐ اور اُن کے صحابیوں کے عقب میں تھی۔ اسی لئے وہ شکست سے کبھی دوچار نہ ہوئے اور دس گنا نامساعد حالات پر قابو پا لیا۔ گویا روحانیت کی فتح جسم پر ہوئی۔

قدیم مسلمانوں کو ہمیشہ اپنی مدافعت کے لئے جنگ کرنا پڑی۔ انھوں نے دست درازی کی خاطر ہرگز جنگ نہ کی۔ جب کبھی انھیں دوسروں کے خلاف ہتھیار اُٹھانے پڑے تو سب سے پہلے خدائے برتر کی عبادت کے ذریعے دینی بھائی بننے کی دعوت دی۔ اگر یہ قابل قبول نہ ہوا تو اس کا دوسرا بدل پیش کیا کہ وہ جزیہ ادا کر کے صحیح سلامت رہیں۔ لیکن جب یہ انسانی پیش کشیں ٹھکرائی گئیں تو انھوں نے تلوار اُٹھائی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ روحانی پیغام اس ایٹمی زمانہ میں بھی اسی قدر سچا ہے جیسا کہ پہلے تھا اور ایسے ہی ہمیشہ رہے گا۔ اور یہ اس کا مستحق ہے کہ اسے ایمانداری کے ساتھ اپنایا جائے اور تمام دنیا کے اتحاد اور خوشی کے لئے پھیلایا جائے۔

طاقت سے نہیں بلکہ جرأت مندانہ کوشش سے اس کے محاسن کو زندہ مثالوں سے ثابت کرنا آج بھی

اسی قدر ضروری ہے جیسا کہ کبھی ہو سکتا ہے۔ اگر ان محاسن کی صحیح طریقہ پر وضاحت کی گئی اور سمجھایا گیا تو دنیا آج بھی اس ہمہ گیر سچائی کو قبول کرنے کے لئے اسی طرح گرمجوشی نظر آ رہی ہے جیسے پہلے کبھی تھی۔

اس کے بعد عالم آخرت کا روحانی تصور آتا ہے۔ اسلام جانچ کر اس زندگی کو زندگی بعد الموت میں دریا میں محض ایک قطرہ ثابت کرتا ہے۔ زندگی پر تکلف نظر آتی ہے لیکن وہ اس قدر لغو اور فریب دہ ہے کہ ہم بمشکل اسے زندگی کہہ سکتے ہیں۔ حقیقی زندگی صرف عالم آخرت کے مقام پر ہوتی ہے۔

محمدؐ نے زندگی بسر کی اور صرف اس تصور کی خاطر رہنے کی تعلیم دی۔ اس دنیا میں وہ ایک ایسے سوار کے مانند تھے جو تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ریاضت نہیں بلکہ دنیاوی محبت سے نجات ہے۔

امانت اور غربت آزمائش کی علامتیں ہیں۔ تمام دولت خدا کی ہے اور ہمیں اس دولت کو بحیثیت امانت کے اسی کے لئے استعمال کرنا چاہیئے ہمیں نقصان کے لئے رنج ہے اور فائدہ کے لئے خوشی۔ عمرؓ نے تمام سرکاری دولت تقسیم کی اور پیوند لگے ہوئے جامے پہنے اور لوگوں کے ساتھ جز رسی میں شریک ہوئے۔ محمدؐ کہا کرتے تھے کہ یہ غربت نہیں جس سے میں خائف ہوں؟ لیکن یہ اقبال (دولت) تمہارا خیر مقدم کرکے تمہیں تباہ کرے جیسا کہ اس نے دوسروں کو تباہ و برباد کیا ہے۔ دنیاوی ضروریات کے لئے بہت تھوڑا کافی ہے۔ بہت زیادہ غیر ضروری ہوتا ہے دنیا کو حقیر سمجھو اور وہ تمہارا تعاقب کرے گی اور اگر اس کی طلب کرو گے تو وہ تم سے پرہیز کرے گی۔

دولت کی توہین انسان کو بے غرض بناتی ہے وہ جملہ اشیاء کو خدا کی راہ میں نثار کرتا ہے مدینہ کے مسلمانوں نے مکہ کے مہاجرین کے ساتھ اپنا تمام اثاثہ بانٹ لیا تھا۔ حتی کہ اپنی دو بیویوں میں سے ایک کو طلاق دینے پر رضامندی ظاہر کی تاکہ اہل مکہ اس کو اختیار کرے لیکن آخر الذکر نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ یہی وہ افراد تھے جنہوں نے دولت سے احتراز کیا۔ انصاف کے ساتھ حکومت کی۔ موت سے کھیلے۔ شیر کی طرح لڑے اور عالم آخرت کے لئے بے تاب رہے۔ یہی وہ اشخاص تھے جو اپنی بے مثال جرأت اور بے انتہا تیزی سے اسلام کو قائم رکھ سکے۔ تاریخ میں ان کی نظیر کوئی نہیں۔ کیا یہ تعجب خیز نہیں کہ دنیا نے اپنے تمام خزانے ان کے پیروں تلے رکھے تھے؟

خدا اور عالم آخرت سے اس قدر پاکیزہ محبت کے ساتھ ہر طرح کی عبادت ایزدی کے سوا کوئی چیز انہیں عزیز نہ تھی۔ ہر روز کی عبادت روحانی جنت بنتی ہے۔ مگر بغیر اس محبت کے وہ ایک بوجھ اور دھوکا ہے۔ دنیاوی تعلقات کی بنا پر اپنے رب سے ہم آہنگی کرکے وہ شخص اپنے آپ کو پاتا ہے جیسے ہی وہ عبادت میں محو ہوتا ہے۔

اسلام کے اس روحانی پہلو کا اندازہ لگائے بغیر یہ جاننا ناممکن ہے کہ اسلام ہے کیا۔ اور ایسے مواقع پر ہمارا مطالعہ اور تطبیق غیر منطقی ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ اسلام کی زندہ روح ہے۔ یہ اسلام کی تابل دید اشاعت و عروج کی پوشیدہ تاریخی مظہر قدرت کی کلید ہے۔ یہ آج کل کے نازک روحانی مسائل کا جواب ہے

ادبیات

قصیدہ

در منقبت قدوۃ الواصلین زبدۃ المقربین قطب الاقطاب عالمِ ربانی
حضرت مجدّدِ الفِ ثانی مولانا شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ
از سیّدی وجدّی المحترم مولانا حکیم سید احمد علی سیماب ؒ ٹونکی
(بتمثل سعیدی)

بیا بہ منظرِ چشم و دلِ عزیزاں باش
بہ خستگانِ سپہر از کرم بہ درماں باش

چو ظلِّ عاطفتِ حق بہ فرقِ خود خواہی
بہ فرقِ خلق چو مہر از کرم زرافشاں باش

مطاعِ خلق شدن بیش ازیں نمی خواہد
کہ تا ز دست برآید بہ فکرِ احساں باش

بہ کارسازِ جہاں سازِ کارِ خود بگزار
بہ خلق باش ولے کارسازِ ایشاں باش

زمانہ نیست چو گاہے ز نوش و نیش تہی
تو نوش باش سراسر ز نیش پنہاں باش

دریں ہمہ بنوز از پئے حصولِ شرف
بگیر دامنِ پاکان و یارِ ایشاں باش

غلامِ حضرتِ شیخ احمدِ مجدّد شو
بہ روزگار دل آسودہ ہمچو سلطاں باش

چو رستگاریٔ خود روزِ اولیں خواہی
دمے بہ حلقۂ اصحابِ نقش بنداں باش

اسیرِ سلسلہ اش خسروانِ کشور بخش
بہ گوش حلقہ اش آویز و ہم ز ایشاں باش

خجستہ شیخِ مسیحا نفس کہ از نظرش
بہ حصنِ عافیت از شرِ نفس شیطاں باش

دہن بہ خندہ میالا کہ دل بہ میرانَد
خوش است نالہ بہ خشیت مدام گریاں باش

کسے بہ رتبۂ عالی نمی رسد بے جہد
تو جہد ساز و بہ رفعت سپہر و کیواں باش

نخست زاں کہ وجودت سپہرِ خاک کند
تو بر گذاشتنِ خاکدان شتاباں باش

طریقِ بندگی از خواجگانِ دیں آموز
بہ زندِ فقر نشین و ز اہلِ فرماں باش

نیاز پیشِ کسے بر کہ بے نیاز بود
نظامِ کار ز مختارِ کار خواہاں باش

زفیضِ صحبتِ دانندگانِ راہِ سلوک — بیا بہ منزلِ قُرب و قرینِ جاناں باش
تو عشق ورز بہ سلطاں نہ باز روجاہش — کہ از حصولِ رضایش بہ خلق سلطاں باش
ترا دریں تنِ خاکی نہادہ اندازاں — کہ خود بہ حلم و تواضع بخاک یکساں باش

ہزار سال غمت گر بہ جاں کشد سیماب
ہنوز حرص بہ بندش ہزار چنداں باش

غزل

از

(جناب آلم مظفرنگری)

جب دل کے دونوں حرف بہم کردیئے گئے — معنی طرازِ لوح و قلم کردیئے گئے
خود ہو گئے وہ عیشِ دو عالم سے بے نیاز — جو آشنائے لذتِ غم کردیئے گئے
اس کے سوا حقیقتِ عالم ہے اور کیا — ذرے ملا کے چند بہم کردیئے گئے
تقلیدِ رہنما کا نتیجہ تو دیکھئے — منزل سے دور اور بھی ہم کردیئے گئے
بڑھتی ہی جارہی ہے اب افسردگیٔ شوق — ہم کیوں رہینِ لطف و کرم کردیئے گئے
سمجھا نہ جن کو در خورِ میخانہ عشق نے — وہ جام وقفِ محفلِ جم کردیئے گئے
نسبت نہ جن کو تھی کوئی ایمان و کفر سے — وہ کیوں شریکِ دیر و حرم کردیئے گئے
زاغ و زغن کے شور سے کم رتبہ آج کل — نغماتِ طائرانِ حرم کردیئے گئے
پوچھیں گے باغباں سے کہ فصلِ بہار میں — کیوں دور صحنِ باغ سے ہم کردیئے گئے
آج ان کی بزمِ ناز میں اہلِ ہوس کے ساتھ — درجاتِ اہلِ عشق بھی کم کردیئے گئے
یہ سوچتا ہوں دیکھ کے فردِ عمل کو میں — کس کے گناہ اس میں رقم کردیئے گئے

نغمے آلم بہ لحنِ حجازی جو تھے مرے
وہ سب ہی وقفِ سازِ عجم کردیئے گئے

تبصرے

انٹروڈکشن ٹو اسلام از ڈاکٹر محمد حمید اللہ تقطیع کلاں۔ ٹائپ جلی و روشن قیمت ۵ر
ملنے کا پتہ۔ حبیب اینڈ کو، اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن۔ انڈیا

ڈاکٹر حمید اللہ نے جواب فرانس میں مستقلاً مقیم ہو گئے ہیں۔ پیرس میں ایک سوسائٹی قائم کی ہے جس کا مقصد تصنیف و تالیف اور تحریر و انتشار کے ذریعہ اسلامی تاریخ و فلسفہ اور اسلامی دینیات کو یورپ اور امریکہ میں متعارف کرانا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے زیر تبصرہ کتاب شائع ہوئی ہے، اس میں فاضل مؤلف نے صاف مگر دل نشین انگریزی میں پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر سوانح عمری بیان کی ہے اور اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ اسلام کی اصل تعلیمات دوسرے مذاہب کی تعلیم کی طرح محرف نہیں ہیں اس لئے ان پر مکمل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس ابتدائی بحث کے بعد مختلف عنوانات پر مثلاً "زندگی کا اسلامی تصور" "ایمان اور عقیدہ"، "اسلام کے مذہبی اعمال" "روحانی زندگی"، "نظام اخلاق" "اسلام کا سیاسی نظام" "اسلام کا قانون اور اقتصادی نظام"، "مسلمان عورت" "غیر مسلموں کا اسلام میں مرتبہ" "سائنس اور علوم و فنون کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ" "اسلام کی عام تاریخ" "مسلمان کی روزانہ کی زندگی" ان عنوانات پر مختصر مگر بڑی حد تک جامع اور بصیرت افروز کلام کیا ہے۔ اصل کتاب یہاں ختم ہو جاتی ہے مگر اس کے بعد تیس ۳۰ صفحے کے جو ضمیمے ہیں ان میں بھی بڑے کام کی معلومات ہیں جو مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لئے مفید ہیں، ان ضمیموں میں نماز کی ہیئت اور تمام ادعیہ جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں از اول تا آخر ان کو پہلے عربی میں نقل کیا ہے اور پھر انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے بعد ایک نقشہ ہے جس میں موجودہ بیسویں صدی کے ختم تک سال بھر کے تمام اسلامی تیوہار انگریزی تاریخ کے حساب سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد وہ لوگ جو خط استوار سے بہت دور یعنی ۴۵ ڈگری جنوب میں رہتے ہیں ان کے لئے پانچوں وقت کی نمازوں کے اوقات کا پروگرام بنا کر پیش کر دیا ہے۔

آخر میں ایک نقشہ ہے جس سے دنیا کی مختلف سمتوں میں رہنے والے لوگوں کے لئے قبلے کی سمت معلوم کرنے میں بڑی سہولت ہوگی اس طرح یہ کتاب اسلام کی تعلیمات کا ایک مختصر مگر ایسا حسین اور جامع خاکہ پیش کرتی ہے کہ جو شخص بھی اس کو پڑھے گا اس کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ اللہ تعالےٰ لائق مؤلف کو اس کا اجر عطا فرمائے۔

مضامینِ ڈار تقطیع متوسط، کتابت و طباعت بہتر۔ ضخامت ۲۹۴ صفحات قیمت درج نہیں پتہ۔ گرانٹ بک ہاؤس۔ ماروتی لین۔ رگھوناتھ داداجی اسٹریٹ ہاربی روڈ بمبئی نمبر ا

مرحوم پروفیسر محمد ابراہیم ڈار پنجاب کے ان ارباب علم میں سے تھے جن کو حافظ محمود شیرانی اور مولوی محمد شفیع سابق پروفیسر اورینٹل کالج لاہور کی تربیت خاص نے علم و تحقیق کا مرد میدان بنایا۔ مرحوم ڈار عربی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد مختلف جگہوں پر عربی کے پروفیسر رہے اور بمبئی میں انتقال کیا۔ مرحوم نے اپنی زندگی میں جو مضامین لکھے تھے ان میں سے بعض مضامین اس مجموعہ میں یکجا شائع کر دئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ میں نو مضامین ہیں پہلے مضمون میں جہاں آرا بیگم کی ایک غیر مطبوعہ تصنیف جو صاحبیہ کے نام سے مشہور ہے اور جس میں جہاں آرا بیگم نے اپنے مرشد ملا شاہ کے حالات لکھے ہیں اس کا تعارف کرایا ہے دوسرے مضمون میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کی طرف جو فارسی کا دیوان منسوب کیا جاتا ہے اس پر تنقید کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ انتساب صحیح نہیں ہے تیسرے مضمون میں شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و تصانیف کے متعلق ایران کے مشہور محقق عبدالوہاب قزوینی اور سعید نفیسی اور ہندوستان کے مشہور محقق حافظ محمود شیرانی نے جو تحقیقات پیش کی ہیں ان کا خلاصہ لکھا ہے۔ چوتھے مضمون میں شمس العلما عبدالغنی کی کتاب ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب پر سخت نکتہ چینی اور تنقید کی گئی ہے۔ پانچویں مضمون میں ڈاکٹر اقبال کی وطن دوستی کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مضمون یقیناً بہت سے لوگوں کو شاق ہوگا تاہم مصنف نے حوالوں کے ساتھ جو چند واقعات لکھے ہیں ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ چھٹے مضمون میں "حیات شبلی" مصنفہ مولانا سید سلیمان ندوی پر ایک طویل تنقید ہے۔ ساتویں میں اقبال کے کلام میں جن عربی شعراء کا تذکرہ آیا ہے ان سے تعارف کرایا ہے۔ آٹھویں مضمون میں اشبیلیہ کا نامور تاجدار المعتمد علی اللہ، جو خود بھی شاعر تھا اس کا تعارف کرایا ہے

بُرھان

جلد ۴۱ شمارہ ۴

اکتوبر ۱۹۵۸ء مطابق ربیع الاول ۱۳۷۸ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

سیرت کے جلسے بلکہ کانفرنسیں جس کثرت سے اور جس دھوم دھام اور تزک واحتشام سے آج کل ہوتے ہیں۔ پہلے بھی کبھی ہوتے تھے؟ اور جس قدر روپیہ ان پر خرچ ہوتا ہے۔ پہلے بھی مذہبی اجتماعات پر کبھی اتنا خرچ ہوتا تھا؟ لیکن آج مسلمانوں کی مذہبی داری۔ مذہبی زندگی اور انابت الی اللہ کا حال کیا ہے؟ اس حیثیت سے وہ اگلے زمانہ کے مسلمانوں سے بہتر ہیں یا بدتر؟ انھوں نے کچھ ترقی کی ہے یا اور انحطاط و تنزل میں جا پڑے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام جیسی اپنی زندگی بنالینے کا جذبہ ان میں کچھ قوی تر ہوا ہے یا اور مضمحل تر ہوگیا ہے؟ ان سوالات کا جواب ظاہر ہے۔ اس کے متعلق دو رائیں ہرگز نہیں ہوسکتیں: اب سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ سیرت کے جلسوں یا بالفاظ صحیح ترعید میلاد النبی کو اس طرح منانے کے دستور سے پہلے ہوتا یہ تھا کہ جمعہ جمعہ نماز کے بعد عام طور پر وعظ ہوتا تھا۔ یا کانفرنسیں بھی ہوتی تھیں تو مواعظ کی ہوتی تھیں۔ جن میں علمائے کرام جو علم وعمل کے اعتبار سے نمایاں شخصیت کے مالک ہوتے تھے۔ دو دو تین تین گھنٹے وعظ کہتے تھے۔ ان مواعظ میں کیا ہوتا تھا؟ اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت اور اس کی صفات کا بیان۔ یوم آخرت اور اعمال وافعال پر قرآنی وعد و وعید کا تذکرہ۔ انبیائے کرام اور بزرگوں کے قصے اور ان کے واقعات زندگی۔ جنت و دوزخ اور دنیا کی بے ثباتی و بے حقیقی کی تشریح وتوضیح۔ پھر ان مواعظ میں کہیں قرآن مجید کی آیات پڑھی جاتی تھیں اور کہیں احادیث نبویہ کبھی مولانا روم کی مثنوی کے اشعار پڑھے جاتے تھے اور کبھی جامی وسعدی۔ ابوسعید ابوالخیر۔ سنائی اور عرفی وقدسی کے ولولہ انگیز اشعار اور قطعات: ان سب کا مجموعی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ سامعین کے قلوب میں رقت پیدا ہوتی تھی۔ خدا کی عظمت اور یوم آخرت کا ڈر جو مذہب کی اصل بنیاد ہے ان چیزوں کا اعتقاد جازم اور یقین کامل پیدا ہوتا تھا۔ سننے والوں کا تاثر جب شدید ہوتا تھا تو ان میں انابت الی

اور تقرب مع اللہ کا جذبہ و ولولہ جو دین کی اصل غرض و غایت ہے ابھرتا تھا اور وہ ان کے ہر عمل و فعل پر چھا جاتا تھا۔ ایسا ہونا تھا بھی طبعی۔ کیونکہ دین کی طرف دعوت دینے کا یہی وہ طریقہ ہے جو قرآن کے مطابق ہے اور جو انبیائے کرام اور سلف صالحین نے اختیار کیا ہے۔ قرآن کو از اول تا آخر پڑھ جائیے آپ بار بار اور بڑی شد و مد کے ساتھ جس چیز کا تذکرہ پائیں گے وہ خدا کی عظمت و جلالت اور یوم آخرت ہی ہے۔ ان کے علاوہ اور جتنی بھی چیزیں ہیں وہ سب انھیں دو پر مبنی اور قائم ہیں۔ اوامر و نواہی ہیں تو وہ بھی اسی لئے۔ رسولوں کی بعثت کا تذکرہ ہے تو وہ بھی انھیں کی وجہ سے اور پھر قصص و امثال ہیں تو وہ بھی ان دونوں چیزوں کی حقیقت اور اہمیت کو زیادہ سے زیادہ راسخ فی الذہن کردینے کی غرض سے!

لیکن اب آج کل عید میلاد النبی کی تقریب سے جو جلسے ہوتے ہیں ان میں کیا ہوتا ہے؟ شاندار پنڈال بنائے جاتے ہیں۔ ان کو دلہن کی طرح سجایا جاتا ہے۔ قمقموں کی جگمگاہٹ سے پنڈال بقعۂ نور بنتے ہیں تقریر کرنے والوں میں مسلم اور غیر مسلم عالم اور غیر عالم دونوں قسم کے حضرات ہوتے ہیں یہ تقریریں زیادہ سے زیادہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ ہوتی ہیں۔ جو غیر مسلم اور غیر عالم مقرر ہوتے ہیں ان سے تو اور توقع بھی کیا ہوسکتی ہے جو عالم ہوتے ہیں وہ بھی وقت کے فیشن کے مطابق نہ خدا کی ذات و صفات کا ذکر کریں گے اور نہ یوم آخرت اور جنت و دوزخ کا۔ نہ مولانا روم کی مثنوی سنائیں گے اور نہ جامی و سعدی کے اشعار۔ ہاں ان تقریروں میں ذکر ہوگا تو اسلام کی ان تعلیمات اور حضور کے ان اخلاق کا جن سے آج کل ملکی اور غیر ملکی سیاسی حالات پر استدلال کیا جاسکے۔ اسلام کے سیاسی نظام کا تذکرہ ہوگا۔ اُس کی جمہوریت۔ مساوات۔ عدل۔ اسلام میں حقوق بنی نوع انسان پر داد سخن دی جائے گی۔ اسلام اور کمیونزم میں مقابلہ کیا جائے گا۔ یہ سب کچھ ہوگا لیکن اسلام کا جو اصل مقصد ہے یعنی انابت الی اللہ اور تقرب مع اللہ۔ فلاح اُخروی اور نجات عقبیٰ اس کا کوئی ذکر نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ باتیں دقیانوسیت ہیں اور فیشن کے خلاف ہیں۔ ان ادھر کی اور ادھر ادھر کی تقریروں کے

بعد پنڈال میں مشاعرہ ہوگا۔ قوالی ہوگی اور آخر شب کے سہانے لمحات میں یہ متبرک مجلس ختم ہوجائےگی
تقریروں کا یہ انداز تو اسی وقت ہوگا جب کہ مقرر صاحب موضوع سخن کے اندر محدود رہنے کی کوشش
فرمائیں۔ ورنہ عام طور پر دیکھنے میں یہ بھی آتا ہے کہ سیرت کے جلسوں میں جو تقریریں کی جاتی ہیں وہ
کسی نہ کسی حیثیت سے نیم سیاسی اور نیم تاریخی ہو کر رہ جاتی ہیں یوم آخرت کا ذکر تو کیا ہوتا! اسوۂ نبوی
یا حیات طیبہ کا تذکرہ بھی بس کچھ یونہی سا ہوتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ رحمت کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک جس عنوان سے بھی کیا جائے
سرتاسر خیر و برکت ہے۔ لیکن قرآن میں مسلمانوں کو امۃً وسطاً کہا گیا ہے اس لئے قرآن و حدیث
کی تعلیمات اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی مقدس زندگیوں کی روشنی میں ہم کو
حقیقت پسندی اور واقعیت پژوہی سے کام لے کر احتساب نفس کرنا چاہئے کہ ہم جو کچھ کر رہے
ہیں اس میں خالص دینی جذبہ کا دخل ہے یا جو کچھ ہے وہ محض دوسری قوموں کی نقالی اور محض
ایک طرح کی رسم پرستی ہے۔ عوام سے تو ہم کیا کہیں کہ یہ خود اپنی کوئی رائے رکھتے ہی نہیں شکوہ
جو کچھ بھی ہے ان اکابر و زعمائے ملت سے ہے جو خود بھی مسلمانوں کی فریب خوردگی نفس کا شکار
ہو جاتے ہیں اور راہ حق دکھانے کے بجائے اور الٹے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

ان سطور کا مقصد سیرت النبی کے جلسوں کی مخالفت کرنا نہیں ہے بلکہ غرض صرف یہ ہے
کہ آپ جلسے کیجیے مگر اس طرح کہ فضول خرچی نہ ہو۔ غیر شرعی چیزوں کا ارتکاب نہ ہو۔ اور ان سے
مسلمانوں کو اعتقاداً و عملاً اسلام سے زیادہ سے زیادہ قریب لانے کا کام لیا جا سکے۔ یہ نہ ہو
کہ عید بقر عید کی طرح ایک تیوہار کی حیثیت سے آپ نے اس دن کو منایا اور بس! اور آپ کی
زندگی میں اس سے کوئی انقلاب پیدا نہیں ہوا۔

عربی کی ایک قلمی کتاب سے
تاریخ ہند پر نئی روشنی

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق استاذ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

(۴)

ابو صفاء عمر بن اسحاق شبلی نے کہا کہ میں نے ایک قریب البلوغ اور کار گزار غلام چار درہم (تقریباً دو روپئے) میں خریدا، اسی سے غلاموں کی ارزانی کا اندازہ کر لیجئے، شبلی نے کہا: غلاموں کی ارزانی کے باوجود ایسی ہندی کنیزیں بھی ہوتی ہیں جن کی قیمت میں ہزار تنکے (دس ہزار روپئے) اور اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ابن تاج حافظ نے بھی یہی بات کہی۔ میں نے پوچھا کہ اس قدر ارزانی کے باوجود کنیزوں کی قیمت اتنی زیادہ کیوں ہے تو سب راویوں نے بالاتفاق کہا کہ اس کی وجہ ان کا صوری و معنوی حسن ہے۔ اس نوع کی اکثر کنیزیں حافظ قرآن ہوتی ہیں، لکھنا جانتی ہیں، شعر اور تاریخ سناتی ہیں، گانے اور ستار بجانے میں ماہر ہوتی ہیں، شطرنج اور چوسر (نرد) کھیلتی ہیں، اس صنف کی کنیزیں فخر و مباہات میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی ہیں، کوئی کہتی ہے: "میں تو تین دن میں اپنے آقا کا دل موہ لیتی ہوں"؛ دوسری کہتی ہے: "میں ایک ہی دن میں اس کے دل کی ملکہ بن جاتی ہوں"؛ تیسری کہتی ہے: "میں ایک ہی گھنٹہ میں اُس کے دل پر فتح پا لیتی ہوں"؛ چوتھی کہتی ہے: "دن اور گھنٹے کیا، میرا جادو تو آنکھ جھپکتے چلتا ہے"۔ میرے راویوں نے بالاتفاق کہا کہ

ہند کی حسینائیں ترکی اور قبچاق کی عورتوں سے زیادہ دِل کش ہوتی ہیں ، ان کی عمدہ تعلیم و تربیت اور ہنر دانی اس پر مستزاد . ان کا رنگ بیشتر سنہرا یا چمپئی ہوتا ہے ، لیکن گوری اور گل فام عورتوں کی بھی کمی نہیں . ہندوستان میں ترکی ، قبچاق ، رومی اور ہر نسل و قوم کی عورتیں موجود ہیں پر ترجیح " بِلَاحِ ہندیّا" ہی کو دی جاتی ہے ، ان کی دل آویزی حلاوت اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے جن کے اظہار سے الفاظ قاصر ہیں .

سراج الدین عمر شبلی نے مجھ سے کہا :- اس مملکت میں روس اور اسکندریہ سے در آمد کئے السی کے کپڑے نہیں پہنے جاتے اِلّا یہ کہ سلطان کی طرف سے کسی کو پہنائے جائیں . عام طور سے (خوش حال) لوگ اعلیٰ قسم کی روئی کے کپڑے پہنتے ہیں ، روئی کے سوت سے بغداد کے چھوٹے کوٹ سے ملتی جُلتی قمیصیں بنائی جاتی ہیں ، لیکن بغداد کے کوٹوں یا نصانی (؟) کا ہندی قمیصوں سے کیا مقابلہ ! ہندی سوتی کپڑا اس سے کہیں بڑھیا اور دیدہ زیب ہوتا ہے . اس کی کچھ قسمیں عمدگی میں نَواسا (؟) کے ہم مرتبہ ہوتی ہیں اور خوب گفت اور آب دار .

شیخ مبارک نے مجھ سے بیان کیا :- بس وہ لوگ غلاف چڑھی یا زیور سے آراستہ زینوں پر بیٹھتے ہیں جن کو سلطان اِس قسم کا انعام عطا کرتا ہے . انعام پانے والے کو اب اس بات کی رخصت ہوتی ہے کہ زین کو غلاف یا زیور سے مزین کرلے . عام طور پر غلاف چڑھی زینوں پر چاندی کا کام ہوتا ہے یا چاندی کے زیور سے ان کو آراستہ کیا جاتا ہے . شیخ مبارک نے کہا :- سلطان سرکاری منصب داروں کو خواہ وہ اہلِ سیف ہوں ، خواہ اہلِ قلم ، خواہ اہلِ علم ، اعلیٰ قسم کا سامان ، جائدادیں ، مال دولت ، جواہرات ، گھوڑے ، زرکار زینیں ، زرکار

پٹکے اور قسم قسم کے کپڑے عنایت کرتا ہے، اس کے انعام کی فہرست سے صرف ہاتھی مستثنیٰ ہیں، ہاتھی رکھنا صرف شاہی حق ہے اور اس میں کوئی دوسرا اس کے ساتھ شریک نہیں ہوتا۔ ہاتھی کے کھانے چارہ کے لئے سرکار سے کئی قسم کے راتب مقرر ہیں، سلطان کے تین ہزار ہاتھیوں کے خرچ کے لئے شاید ایک بڑی حکومت کی آمدنی درکار ہوتی ہو۔ میں نے (مؤلف) نے شیخ مبارک سے پوچھا کہ شاہی ہاتھیوں پر کیا خرچ آتا ہے تو انھوں نے کہا: ہاتھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں اور اس کے مطابق ان کا کھانا چارہ ہوتا ہے۔ میں ہاتھی کی زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم غذا بتاتا ہوں۔ ایک ہاتھی کے لئے ہر دن زیادہ سے زیادہ، بیس[۲۰] سیر چاول، تیس سیر جو، بیس سیر گھی اور آدھی گٹھری گھاس درکار ہے۔ مہاوتوں اور دیکھ بھال کرنے والوں کا مشاہرہ بھی بہت ہوتا ہے اور کئی قسم کا۔ شیخ مبارک نے کہا: ہاتھیوں کا داروغہ اکابر سلطنت میں سے ایک ممتاز آدمی ہے جس کی جائداد بقول شبلی عراق جیسے بڑے ملک کے برابر ہے۔ سلاطینِ ہند میدانِ جنگ میں اس فوجی ترتیب سے کھڑے ہوتے ہیں: قلبِ لشکر میں بادشاہ ہوتا ہے اور اس کے اِرد گرد ائمہ و علماء آگے پیچھے تیر انداز، میمنہ و میسرہ دور دور تک پھیلے ہوتے اور ایک دوسرے سے متصل ہوتے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے ہاتھی لشکر ہوتا ہے، ہاتھی آہنی تاروں کی جھولیں پہنے ہوتے ہیں اور اُن پر کیلوں سے جڑے برجوں میں سورما براجمان ہوتے ہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا۔ برجوں میں تیر پھینکنے کے سوراخ اور جھروکے ہوتے ہیں جن سے جلتے پیٹرول کی بوتلیں پھینکی جاتی ہیں۔ ہاتھیوں کے سامنے پیادہ غلام، تلواروں اور ہتیاروں سے مسلح دشمن کے سواروں پر تلوار کے وار کر کے ہاتھیوں کے لئے راستہ کھولتے ہیں اور عقب میں تیر انداز برجوں سے تیر پھینک کر دشمن کے سواروں کو بھگاتے

ہیں، اور میمنہ اور میسرہ کے سوار دور دور تک چاروں طرف سے دشمن کو گھیر لیتے ہیں اور ہاتھیوں کے پیچھے اور آس پاس لڑتے ہیں، ان تدابیر سے نہ تو دشمن کے رسالوں کو غارت گری کا موقع ملتا ہے اور نہ فوج کے اندر گھسنے کا، اور اگر دشمن کا کوئی سپاہی فوج میں گھس بھی آئے تو مشکل ہی سے زندہ بچتا ہے کیوں کہ سلطان کی ہر طرف سے گھیرا ڈالی فوجیں محتاط رہتی ہیں، اوپر سے تیر اور آگ کی بارش ہوتی ہے اور نیچے سے پیدل فوج موقع پاتے ہی اچانک وار کرتی ہے، اس طرح موت اور تباہی دشمن کا ہر طرف سے محاصرہ کیئے رہتی ہے۔

ہند کے اس سلطان کو جو فتوحات اور کامیابیاں حاصل ہوئیں اور جس پیمانہ پر اس نے نئے نئے علاقے فتح کیئے، اور جس طرح اس نے کافروں کے مرکزوں کو ڈھایا، اور جادوگروں کا جادو توڑا، اور بتوں اور مجسموں کی پوجا کے حق میں اہلِ ہند کی دلیلوں کو جس طرح باطل کیا، ان سب امور میں ہند کا کوئی دوسرا مسلم تاج دار اس کا ہم سر نہیں۔ بحر ہند کے دور افتادہ گوشوں میں اِکا دُکا ایسے جزیرے رہ گئے ہیں جہاں اس کی حکومت نہیں ہے اور جن کی اس کو خبر بھی نہیں، اگر خبر ہوتی تو وہ ان کو بھی مسخر کر لیتا۔ ہند کی مجلسیں اس کے ذکر کی بہترین خوشبو سے مہک اٹھی ہیں۔ وَتحلّٰی زمانہُ بہا باعْلٰی قِیمۃٍ من جواھرِھا (؟) وہ آج سلطانِ ہند ہے اس لفظ کا اطلاق کسی اور پر نہیں ہوتا، اور یہ معزز نام اس کے سوا کسی اور کو راست نہیں آتا۔ شبلی نے کہا: مناسب ہے کہ مسلمان اس سلطان کے حق میں اس کے شوق جہاد کے لئے خدا سے دعاء خیر کریں — یہ ہیں اس کے احسانات اور یہ ہیں اس کی خصلتیں۔

محمد خجندی نے مجھ سے بیان کیا: یہ سلطان ہر ہفتہ بدھ کے دن ایک مجلس منعقد کرتا ہے جس میں عام لوگ جمع ہوتے ہیں۔ سلطان ایک بہت بڑے

میدان میں بیٹھتا ہے جہاں اس کے لئے ایک بڑا چتر لگایا جاتا ہے، اس کے نیچے ممتاز جگہ پر ایک اونچے تخت پر سلطان بیٹھتا ہے جس پر سونے کے پتر چڑھے ہوتے ہیں اور جواہرات جڑے ہوتے ہیں۔ اربابِ دولت، دائیں بائیں صفوں میں کھڑے ہوتے ہیں، پیچھے سلاحداریہ اور جمداریہ ومن حکمہ بین أرباب الأشغال الخاصۃ حکمھم (؟) اور دوسرے عہدے دار اپنے حسب مرتبہ جگہوں پر ہوتے ہیں۔ سلطان کے سامنے صرف خان، (۵/۲۲) صدر جہاں اور سکریٹری بیٹھتے ہیں، حاجب کھڑے ہوتے ہیں۔ عام منادی کرادی جاتی ہے کہ اگر کسی کو کوئی شکایت یا ضرورت پیش کرنا ہو تو لائے، جب کوئی آتا ہے یا بادشاہ کے حضور کھڑا ہوتا ہے تو اس کو نہ تو مارا جاتا ہے اور نہ اپنی عرضداشت پیش کرنے سے اس کو روکا جاتا ہے۔ وہ (آزادی سے) اپنی شکایت بادشاہ کے سامنے رکھتا ہے اور بادشاہ جو مناسب ہوتا ہے حکم دیتا ہے۔ (ہفتہ کے) باقی دنوں میں اس کی مجلس صبح شام منعقد ہوتی ہے جس میں خان، ملک اور امیر حاضر ہوتے ہیں۔ سلطان کے آدابِ مجلس میں ایک بات یہ ہے کہ کوئی شخص بڑا ہتھیار تو کیا چھوٹی چھری تک لے کر اس کے پاس نہیں آسکتا، اور ہر آنے والے کو سلطان کے پاس جانے سے پہلے غور سے دیکھا بھالا جاتا ہے۔ سلطان کی مجلس سات دروازے پرے ہوتی ہے اور پہلے دروازہ پر ایک شخص مامور ہوتا ہے جس کے پاس بگل ہوتا ہے۔ جب کوئی خان یا ملک یا بڑا آدمی آتا ہے تو وہ شخص بگل بجاتا ہے تاکہ سلطان کو معلوم ہو جائے کہ کوئی بڑی ہستی آرہی ہے اور وہ ہر طرح چوکنا اور تیار رہے۔ بابِ عالی پر آنے والا خواہ کتنا بڑا آدمی کیوں نہ ہو پہلے دروازہ سے پاپیادہ ہو جاتا ہے اور ساتوں دروازے پیدل چل کر سلطان کی خدمت میں

حاضر ہوتا ہے، ہاں معدودے چند لوگوں کو سلطان کی طرف سے رخصت ہوتی ہے کہ کچھ دروازے تک سوار رہیں۔ آنے والا جب دروازے طے کرتا ہے تو اس اثنار میں برابر بگل بجتا رہتا ہے، حتی کہ ساتویں دروازہ کے قریب پہنچتا ہے جہاں سب آنے والے مجتمع ہوتے ہیں۔ جب اذنِ باریابی پانے والوں کی تعداد پوری ہو جاتی ہے تو ان کو حاضری کی اجازت ملتی ہے۔ داخل ہونے والوں میں جو بیٹھنے کے اہل ہوتے ہیں، وہ سلطان کے آس پاس بیٹھ جاتے ہیں اور جو اہل نہیں ہوتے وہ کھڑے رہتے ہیں۔ قاضی، وزیر اور سکریٹری بیٹھتے ہیں، آخرالذکر ایسی جگہ بیٹھتے ہیں جہاں سلطان کی نظر ان پر نہیں پڑتی، بساط پھیلا دئے جاتے ہیں، حاجب عرضداشتیں پیش کرتے ہیں، ہر صنف کی درخواست کے لئے الگ حاجب ہوتے ہیں، ساری درخواستیں بڑے حاجب کو دے دی جاتی ہیں، وہ ان کو بادشاہ کے سامنے رکھتا ہے۔ جلسہ برخاست ہونے پر، سلطان، سکریٹری کے پاس بیٹھتا ہے اور وہ درخواستیں اس کے حوالہ کرتا ہے جن پر اس نے حکم لکھے ہوتے ہیں، سکریٹری ان کو نافذ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد سلطان خاص مجلس کرتا ہے اور ان عالموں کو بلاتا ہے جو عادۃً اس کی خدمت میں رہتے ہیں، وہ عالموں کے ساتھ بیٹھتا ہے اور ان کے ساتھ لطف و یگانگت سے پیش آتا ہے اور گفتگو کرتا ہے۔ یہ علماء اس کے "معتمد خاص" ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ ان کو لوٹنے کا اذن دیتا ہے اور اب ندیموں اور گویّوں کی محفل گرم ہوتی ہے، کبھی ندیموں سے مصروفِ گفتگو ہوتا ہے اور کبھی کوئی گویّا اس کو نغمے سناتا ہے، لیکن خلوت ہو یا جلوت وہ کسی حال میں پاکبازی، طہارت اور عفت کا دامن نہیں چھوڑتا، حرکت و سکون ہر حالت میں اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے، اور خلوت و جلوت دونوں میں خدا پر اس

کی نظر رہتی ہے، نہ خود کسی حرام کا مرتکب ہوتا ہے اور نہ دوسرے کو اس کی رخصت دیتا ہے۔ شبلی نے مجھ سے کہا: دلی میں بالکل شراب نہیں ہوتی، نہ تو ظاہرا نہ چھپا چوری، کیوں کہ شراب کے معاملہ میں یہ شخص (سلطان) خصوصیت کے ساتھ سخت ہے، اور شراب پینے والوں کو بہت ناپسند کرتا ہے، پھر اہل ہند خود بھی شراب سے رغبت نہیں رکھتے اور نہ دوسری نشہ آور چیزوں سے، کیوں کہ انھوں نے پان کو منکرات کا نعم البدل بنا لیا ہے، جو حلال اور پاک ہے جس میں کوئی آسودگی یا ضرر نہیں، بلکہ اس میں ایسی خوبیاں ہیں جو شراب میں مفقود ہیں، مثلاً یہ کہ وہ منہ کی بو کو خوشبو میں بدل دیتا ہے، کھانا ہضم کرتا ہے، اور روح میں خاص انبساط و سرور پیدا کرتا ہے، ہوش و حواس قایم رکھتا ہے، ذہن کو صاف کرتا ہے اور مزے دار ہوتا ہے، اس کے اجزائے ترکیبی تین ہوتے ہیں:- پان کا پتہ، چھالیہ اور چونا جو خاص طریقہ پر بنایا جاتا ہے۔ شبلی نے کہا:- اہلِ ہند کے نزدیک پان سے زیادہ پُر اعزاز مہمان نوازی کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی کو مہمان بنائے اور مختلف کھانوں، شربتوں، حلووں اور پھولوں سے اس کی خاطر مدارات کرے، لیکن پان نہ دے تو گویا اس نے مہمان نوازی کا حق ادا نہیں کیا اور مہمان کی پوری قدر و منزلت نہیں کی۔ اسی طرح اگر کوئی بڑا آدمی کسی ملاقاتی کی خاطر مدارات کرنا چاہے تو اس کو پان پیش کرتا ہے۔

عُلامہ سراج الدین ابو صفاء شبلی نے مجھ سے بیان کیا:- اس سلطان کو اپنی سلطنت، اپنے لشکر اور رعایا کے حالات معلوم کرنے کا خاص خیال رہتا ہے، اس کا ایک ادارہ ہے جس کے افسروں کو مُنہی کہتے ہیں۔ مُنہیوں کے کئی گریڈ یا طبقے ہیں، ان میں سے بعض کا تعلق لشکر اور عوام سے ہے، مُنہی

کو جب کوئی ایسی بات معلوم ہوتی ہے، جس کی خبر بادشاہ کو ہونا چاہیے تو وہ اپنے سے اوپر افسر کو رپورٹ بھیجتا ہے، وہ اپنے سے اوپر کو حتی کہ رپورٹ سلطان تک پہنچ جاتی ہے. دور دراز صوبوں سے خبریں بھیجنے کا طریقہ یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ایسی ڈاک چوکیاں ہیں جیسی مصر و شام میں پائی جاتی ہیں، لیکن یہاں زیادہ نزدیک ہوتی ہیں، تیر کی جو گنی مسافت پر واز پرا یا اس سے کم، ہر چوکی پر دس ڈاک بردار ہوتے ہیں، ان میں سے جس کی باری ہوتی ہے وہ ڈاک لے کر اپنے سے اگلے کے پاس امکان بھر تیزی سے بھاگتا ہے، اور اگلی چوکی کے ڈاک بردار کو دیتا ہے، اب یہ بھاگ کر اپنے سے اگلے ڈاک بردار کے حوالہ کرتا ہے، ڈاک دینے کے بعد ہر شخص عادی چال سے اپنی اپنی چوکی کو لوٹ آتا ہے، اس طرح ڈاک دور ترین جگہوں پر کم سے کم وقت میں پہنچ جاتی ہے، ڈاک گھوڑوں سے زیادہ جلد. ہر ڈاک چوکی پر مسجدیں ہیں جہاں نماز با جماعت ہوتی ہے، مسافر ٹھہرتے ہیں، پینے کے لئے پانی کے تالاب اور کھانا چارہ کے لئے بازار ہیں، اس لئے کسی مسافر کو اپنے ساتھ زادِ راہ اور خیمہ ڈیرہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی. اس سلطان کے اہتمام جہانداری میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے سلطنت کی دونوں راج دہانیوں ۔ دِلّی اور دیو گیر کے درمیان ڈاک چوکیوں میں ڈھول کے ذریعہ خبر رسانی کا انتظام کیا ہے. جہاں کہیں کوئی شہر فتح ہوتا ہے یا کسی قلعہ کا محاصرہ اُٹھتا ہے یا کوئی قلعہ حصار بند ہوتا ہے (؟) تو ڈھول بجایا جاتا ہے، جب اگلی چوکی پر اس کی آواز پہنچتی ہے، تو وہاں بھی ڈھول بجتا ہے، اس طرح سلطان کو جو موقع جنگ سے دور ہوتا ہے شہر کے

لے مصباح المنیر میں تیر کی مسافت پرواز چار سو ذراع یعنی قریب ۲۶۶ گز بتائی ہے، اس حساب سے دو ڈاک چوکیوں کا درمیانی فاصلہ لگ بھگ ساڑھے دس سو (۱۰۵۰) گز ہوا. مصباح المنیر، ذکر میل ص ۳۵۱

فتح ہونے یا قلعہ کے حصار بند ہونے کی خبر ہو جاتی ہے، آج کل ایسی خبریں ہر دن اس کو موصول ہوتی ہیں (۶) اس سلطان کے وقار اور دھاک کو دیکھ کر دل بیٹھتے ہیں حالاں کہ وہ لوگوں سے قریب رہتا ہے اور نرمی سے بات کرتا ہے۔ اگر کوئی اس سے ملنا چاہے تو باریاب ہوتا ہے، اس کے حاجب (داروغہ در) خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے ملاقات میں روڑے نہیں اٹکاتے، خدا نے اس کے عہدِ حکومت میں ہر قسم کے رزق کی ریل پیل کی ہے اور اپنی نعمتیں دگنی چوگنی کر دی ہیں، اگرچہ ہند ہر زمانہ میں خوش حالی اور داد و دہش کے لئے مشہور رہا ہے۔

خُجندی نے مجھ سے بیان کیا: میں نے اور میرے تین ساتھیوں نے دہلی کے ایک گاؤں میں پیٹ بھر کر گائے کا گوشت، روٹی اور گھی ایک جیتل (چار پیسے) میں کھایا۔ میں عنقریب اہلِ ہند کے سکے بیان کروں گا، اس کے بعد خُجندی نے ہند کے بھاؤ بتائے جو سکوں کے ذریعہ مقرر ہوتے ہیں اور جن کے ذریعہ نرخوں کا علم ہوتا ہے۔

شیخ مبارک نے مجھ سے کہا:- لکّ أحْمَر کے معنی ہیں سونے کے ایک لاکھ تنکے (مسالک میں ہے۔ لک أَبْيَض کے معنی ہیں سونے کے ایک لاکھ تنکے) ہند کے لوگ تَنْكَةُ الحَمْراء کو تنکہ سُرخ کہتے ہیں اور اس کی قیمت تین مثقال (سونے) کے برابر ہے۔ چاندی کا تنکہ اٹھنی (ہشتکانی) کے برابر ہوتا ہے یہ اٹھنی قیمت اور وزن میں چاندی کے اس درہم کے مُساوی ہے جو مصر و شام میں رائج ہے، اور جس کی قیمت دونوں ملکوں میں یکساں ہے۔ اُٹھنی چار سُلطانیوں کے برابر ہوتی ہے، سُلطانی کو دوٗ أنّی کہتے ہیں، سُلطانی، چھ أنّی کا تہائی ہوتی ہے، چھ أنّی تیسرا سکہ ہے جس سے ہند میں خرید و فروخت ہوتی ہے۔ سُلطانی

اَٹھنّی کی چوتھائی ہوتی ہے، اُس کے آدھے کو اِکنّی کہتے ہیں، اِکنّی اور جتیل قیمت میں برابر ہیں۔ ان کے علاوہ ایک سکّہ بارہ اَنّی ہوتا ہے، اَٹھنّی کا ڈیوڑھا۔ اور ایک اور سکّہ سولہ اَنّی ہوتا ہے، دو اٹھنیوں کے برابر۔ اس طرح ہند میں کل چھ سکے رائج ہیں :- سولہ اَنّی۔ (شانزدکانی، مسالک۔ شانزدکانی) بارہ اَنّی (دوازدکانی۔ مسالک۔ دوازدیدکانی) اَٹھنّی (ہشتکانی۔ مسالک۔ ہستکانی) چھ اَنی (ششتکانی) دو اَنی (سُلطانی) اِکنی (یکانی) سب میں چھوٹا اِکنّی ہے (مسالک۔ سب سے چھوٹا دو اَنی ہے) ان تمام سکوں کے ذریعہ (مسالک۔ ان تینوں سکوں سے) لین دین اور تجارت ہوتی ہے، لیکن دو اَنّی زیادہ چلتی ہے، دو اَنی کی قیمت مصر و شام کے نقرئی درہم کے چوتھائی کے برابر ہے۔ سُلطانی (دو اَنّی) میں آٹھ پیسے ہوتے ہیں یعنی دو جتیل، جتیل چار پیسے کا ہوتا ہے۔ اس طرح اٹھنّی میں جو مصر و شام کے چاندی کے درہم کے برابر ہے بتّیس پیسے ہوتے۔ (باقی)

ایرج مرزا اور اس کی شاعری پر ایک نظر

از

(جناب ڈاکٹر قاضی محمد ابراہیم صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ اسلامیہ یوسفی کالج جوگیشوری)

فارسی ادب کو جن شعراء پر ناز ہے ان میں ایرج مرزا کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے ایرج مرزا کی زندگی کا دور ایران کی تاریخ میں نہایت اہم ہے اس زمانے میں ایران مغرب سے اثر پذیر ہو رہا تھا جمہوریت اور آزادی کی صدائیں اس ملک کے گوشے گوشے میں سنائی دے رہی تھیں اہل ایران میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ شاہان وقت کے خلاف نعرے عام تھے قاچار خاندان کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اس بیداری کو ادیبوں اور شاعروں نے ہوا دے کر اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔ اسی زمانہ میں ایرج مرزا نے جنم لیا۔

ایرج مرزا ایران کے شاہی خاندان سے متعلق تھا زمانے کے حالات کے اعتبار سے قاچار خاندان ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ایران زمانہ دراز سے جنگ کا میدان بن چکا تھا۔ ہزاروں لڑائیاں اس عظیم الشان ملک میں لڑی گئیں۔ کئی خاندان برباد ہوئے اور کئی برسر اقتدار آئے۔ لیکن ان لڑائیوں میں جمہوریت اور آزادی کی بو نہ تھی۔ کسی نے آزادی کے نعرے نہیں لگائے۔ یہ لڑائیاں تخت و تاج حاصل کرنے کے مقصد سے لڑی گئیں کسی نے تلوار اٹھائی تو تاج کی حفاظت کے لئے کسی کا سر زیر تیغ ہوا تو تخت و تاج کے تحفظ کے لئے۔ تخت و تاج ہی کے لئے جاں بازوں نے جاں نثاروں نے اور بڑے بڑے سورماؤں نے اپنی جانیں کھو کر اپنی جاں بازی اور جواں مردی کا ثبوت دیا اس وقت کسی نے آزادی و جمہوریت کے لئے آواز بلند نہیں کی۔ سہراب و رستم کا یہ مایہ ناز ملک آزادی اور جمہوریت سے ہنوز ناآشنا تھا۔ شاید یہ آشنائی قاچاریوں کے نصیب میں تھی۔

ایرج مرزا کا پورا نام شاہزادہ ایرج مرزا جلال الملک بن غلام حسین مرزا ابن ملک ایرج بن فتح علی شاہ قاچار تھا[1] اس کی ولادت رمضان ۱۲۹۱ھ میں تبریز میں ہوئی جیسا کہ خسرو ایرج، ایرج مرزا کے

---

[1] دیوان ایرج مرزا ص ۸

دیوان کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں :

"شاہزادہ ایرج مرزا .... در ماہِ رمضان ۱۲۹۱ھ ہجری قمری در تبریز متولد شدہ"[1]

تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے ایرج مرزا کی ولادت کے متعلق یہی لکھا ہے۔ دراصل اس قسم کی معلومات میں ایک چیز کی کمی نظر آتی ہے۔ ایرج مرزا کو وفات پائے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اگر پیدائش کی ٹھیک تاریخ کا بھی سراغ لگتا تو زیادہ مفید ہوتا تاہم ریسرچ کے طلبہ کے لئے یہ چیز قابلِ تحقیق ہے۔ چوں کہ شاہی خاندان میں پیدا ہوا تھا اس لئے اس کی تربیت بھی شاہانہ طریقہ پر ہوئی جیسا کہ اس کے اپنے ذیل کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے۔ ان اشعار میں ایرج ان خادموں کا ذکر کرتا ہے جن کی گود میں اس کی پرورش ہوئی :

من آں ساعت کہ از مادر بزادم	بدامِ مہرِ چنگ مہ فتادم
مرا گشتند مہر و مہ دو خادم	بنوبت روز و شب بر من ملازم
یکی ماما یکی لالای من شد	سرِ زانوئے این دو جای من شد
بمن گفتند کیں لالا و ماما	کہن خدمت گذارانند بر ما
نیاکان ترا ہم این دو بودند	کہ روز و شب پرستاری نمودند
تو ہم از این دو یابی پرورشہا	خوری از سفر انیان خورشہا[2]

جوں ہی ایرج نے ہوش سنبھالا اس کے سرپرستوں نے اس کی تعلیم کی طرف توجہ دی اور بہتر سے بہتر اساتذہ کا اس کی تعلیم کے لئے تقرر کیا چنانچہ ان اساتذہ میں آقا محمد تقی (عارف اصفہانی) اور مرزا نصراللہ (بہار شیروانی) کے نام خاص قابلِ ذکر ہیں خسرو ایرج اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے :

"ایرج مرزا با وجود صغرسن در خدمت دو استاد بزرگ آقا محمد تقی (عارف اصفہانی) و مرزا نصراللہ (بہار شیروانی) تلمذ کردہ"[3]

افسوس اس بات کا ہے کہ تذکرہ نگاروں نے یہ نہیں بتایا کہ ایرج مرزا نے ان اساتذہ سے کیا سیکھا لیکن

---

[1] دیوان ایرج مرزا ص ۸ [2] ایضاً ص ۸ [3] ایضاً ص ۹

زمانہ کے رواج کے مطابق یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے ابتدا میں فارسی عربی اور ہندسہ کی تعلیم پائی، انیسویں صدی جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے ایران کی تاریخ میں انقلاب خیز ثابت ہوئی۔ اسی صدی میں ایران مغرب سے زیادہ متاثر ہونا شروع ہوا اور یہی وہ زمانہ ہے جب کہ فارسی ادب نے کروٹ لی اس میں بھی ایک انقلاب رونما ہوا یہ انقلاب خاص انقلاب تھا اس کی نوعیت ایک خاص نوعیت تھی اسی زمانے میں فارسی کے علم بردار اس کے لکھنے پڑھنے والے صاحب قلم اس کے ادیب اور شاعر اور جرنلسٹوں نے ایک نئی تحریک جاری کرکے فارسی کو عربی اور عربی الاصل الفاظ سے پاک کرنا شروع کیا یہی نہیں بلکہ ان کی جگہ مغربی زبانوں کے الفاظ کو استعمال کرنا شروع کیا خصوصاً ان ترقی پسندوں نے فرانسیسی الفاظ زیادہ استعمال کئے اس ذہنی انقلاب کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ اہل ایران نے فرانسیسی زبان کو اپنے ملک میں وہی رتبہ بخشا جو ہندوستان میں انگریزی کو حاصل تھا۔ لہٰذا ہر تعلیم یافتہ شخص اس زبان سے روشناس ہونا باعث فخر سمجھتا تھا۔ ایرج مرزا بھی اسی ملک کا باشندہ تھا۔ اس نے بھی اس زبان پر عبور حاصل کیا جس کا اندازہ اس کے کلام سے بخوبی لگ سکتا ہے اس ضمن میں اس کی ایک نظم بہت مشہور ہے جس کے متعلق ڈاکٹر ایم اسحاق صاحب یوں لکھتے ہیں :

"دریں ابیات خود را مقید کردہ است کہ کلمات فرانسوی در شعر استعمال کند" [1]

ایرج کے یہ اشعار حسب ذیل ہیں :

بسکہ در لیور و ہنگام لتہ — دوسیہ کردم کار تن ترتہ
بسکہ نت دادم و انکت کردم — اشتباہ بروت و نت کردم

---

[1] اس نظم کے فرانسیسی الفاظ یہ ہیں :

(۱)	لیور	L hiver	بمعنی زمستاں	(۷)	شمیز	Chemise
(۲)	لتہ	Lete	" تابستان	(۸)	پاراف	Paraphe
(۳)	دوسیہ	Dossier	" فائل	(۹)	بورو	Bureau
(۴)	پوتتر	Pomase	" نبس	(۱۰)	آمور	Amour
(۵)	ترتہ	Traite		(۱۱)	نومرو	Numero
(۶)	نت	Note		(۱۲)	زرو	Zero

سوزن آوردم و سنجاق زدم — پوتر و پنس باوراق زدم
هی نشستم بمناعت پس میز — هی تباندم دوسیه لای شمیز
هی باراقت ہشتم و امضا کردم — خاطر مدعی ارضا کردم
گاہ با زنگ و زمانی باہو — پیشخدمت طلبیدم بہ پورو
تو بمیری ز آمورہ افتادم — از شرو شور و شعور افتادم
چکنم زانہمہ شیفر و نومرو — نیست در دست مرا غیر زرو
ہی بدہ کارتن و بستان دوسیہ — ہی بیار از در دکان نسیہ

لہذا ایرج مرزا نے دوران تعلیم میں اس زبان کو بھی سیکھا۔ خسرو ایرج کی ذیل کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرج مرزا نے فرانسیسی زبان اور علوم متداولہ کو تبریز کے مشہور مدرسہ میں حاصل کیا یہ مدرسہ دارالفنون تبریز کے نام سے مشہور ہے۔ نیز ایرج مرزا نے منطق اور بیان کے درس بھی پڑھے چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"در ہنگام رشد برای تکمیل زبان فرانسہ و سایر علوم متداولہ بمدرسہ دارالفنون تبریز وارد شدہ خارج از مدرسہ در حوزہ درس آشنایانہای برای تحصیل منطق و معانی و بیان حاضر می شد۔"

تحصیل علم کے اسی دور میں ایرج مرزا کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوا۔ صغر سنی میں جب کہ وہ سولہ سال کا تھا اس کے کمزور کندھوں پر ازدواجی زندگی کا بوجھ رکھ دیا گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد اس کے والد کا انتقال ہوا جس کی وجہ سے اس کی ذمہ داریوں میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ سب سے بڑی چیز جو ایرج مرزا کی پریشانی میں اضافہ کر رہی تھی وہ خانوادہ کی پرورش اور تلاش معاش کی فکر تھی جس کی وجہ سے اسے اپنے اصولوں کی قربانی بھی دینی پڑی۔ شروع ہی سے ایرج نے حریت پسند طبیعت پائی تھی وہ ملازمت کو طوقِ زندگی سمجھتا تھا جہاں آدمی کو اپنی خودی کھو دینا پڑتی ہے اور اپنے آقا کی بے جا خدمت کرنا عین فرض سمجھا جاتا ہے زندگی کے اس موڑ پر آکر ایرج نے ان تمام چیزوں پر غور کیا۔ اس کے سامنے دو چیزیں تھیں ایک طرف کنبہ کی ذمہ داریاں اسے تلاش معاش پر مجبور کر رہی تھیں اور دوسری طرف احساس

خودی اسے روک رہی تھی کہ وہ خودی کو نہ بیچے زندگی کی اس کشمکش میں جیت کسی ایک کی ہوتی ہے
ایرج مرزا نے بادل ناخواستہ ملازمت کا طوق گلے میں پہن لیا۔ اس کے بیشتر اشعار سے معلوم ہوتا
ہے کہ وہ ملازمت اور غلامی سے سخت متنفر تھا لیکن نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن چنانچہ اس کے ذیل
کے اشعار سے اس کی نفرت کا پتہ چلتا ہے جہاں قدم قدم پر خوشامد کرنی پڑتی ہے :

گاہ حاکم شدن و گاہ دبیر　　　گہ ندیم شہ و گہ یارِ وزیر
با سفر ہای پیاپی کردن　　　ناقہ راحتِ خود پی کردن
گرد سرداری سلطاں رفتن　　　بلہ قربان بلہ قربان گفتن
گفتن اینکہ ملک ظل خداست　　　سینہ اش آئینۂ غیب نماست

ایرج نے ۱۳۲۴ھ میں جب کہ اس کی عمر ۲۳ سال کی تھی ملازمت اختیار کی اور اس طرح زندگی
کے ایک نئے دور میں اس نے قدم رکھا سب سے پہلے ایرج مرزا مظفر الدین شاہ قاجار کی خدمت میں داخل ہوا :

"ایرج مرزا در سنہ ۱۳۰۹ ہجری قمری در دربار ولی عہد (مظفر الدین شاہ قاجار) راہ یافتہ"

یہ چیز قابلِ ذکر ہے کہ قاجار خاندان کے سب ہی افراد علم و ادب کے دل دادہ تھے۔ اس خاندان کے سلاطین
نے اور شاہزادوں نے شعرا اور ادیبوں کی دل سے قدر کی اور انھیں بیش بہا صلے دے کر ان کی ہمت افزائی
کی۔ یہی نہیں بلکہ اس خاندان کے بیشتر افراد صاحب تصنیف اور شاعر بھی تھے۔ جیسے کہ ڈاکٹر رضازادہ
شفق کی ذیل کی تحریر سے واضح ہے یہ تحریر ان کی مشہور و معروف تصنیف "تاریخ ادبیات ایران"
سے ماخوذ ہے مصنف موصوف کا بیان ہے کہ فتح علی شاہ قاجار شاعر تھا اور نیز صاحب دیوان
بھی تھا اس کے علاوہ ناصر الدین نے قصائد بھی لکھے اور غزلیں بھی موزوں کی ہیں۔ اسی طرح اس
خاندان کے شاہزادوں نے بھی قصیدے، غزلیں اور مثنویاں لکھیں۔ فرہاد مرزا نے اپنے والد
عباس مرزا نایب السلطنت کے حالات کو ایک رسالہ میں نظم بند کیا ہے۔ یہ شاہزادہ شاعر بھی تھا۔
عباس مرزا کا بھائی محمود مرزا بھی مورخ اور اہلِ قلم تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر موصوف کے الفاظ یہ ہیں :
"بعضی از شاہان و شاہزادگانِ قاجار خود شاعر و مؤلف بودند چنانکہ فتح علی شاہ دیوان اشعار دارد

وناصر الدین شاہ قصاید وغزلیات سرودہ۔ عدہ ای از شاہزادگان قاجار نیز ......
اشعار سرودہ وقصائد وغزلیات وغزلیات ومثنوی ہاگفتہ اند ......[1]

شاہانِ قاجاریہ کی اس ادب دوستی کے علاوہ یہ بھی جاننا چاہیئے کہ انھوں نے شعرا کو صلوں سے نوازا اور ان کی ہمت افزائی کی۔ نشاط دورِ قاجار کا ایک مشہور شاعر تھا۔ ناچاقی فلک کی وجہ سے وہ سخت مقروض ہوگیا جس کی وجہ سے وہ سخت پریشان ہوا۔ فتح علی شاہ کو جب یہ حال معلوم ہوا تب اُس نے بقول "حیف باشد دلِ داناکہ مشوش شد" تیس ہزار تومان دئے نشاط نے چند اشعار لکھ کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ چنانچہ ابراہیم صفائی نے اپنی کتاب "نہضت ادبی ایران در عصر قاجار" میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔

"شاہ از حال ظاہری نشاط گرفتار یہائی اورادریافت ودقتی بقرضے او واقف شد دستور داد سی ہزار تومان سکوک طلا از خزانہ مخصوص بخانہ نشاط فرستادند .... دراین موقع بود کہ نشاط بہمت بلند ادب پروری شاہ آفرین خواندہ گفت :

زرمگر از زردیٔ دشمن رنگ بگرفت است دام کاینسان ہاں در پیشگاہ شاہ خوار است اینچنین"[2]

مظفر الدین شاہ اسی ادب نواز خاندان کا ایک فرد تھا۔ ابتداء ہی سے اسے علم و ادب سے دلچسپی تھی یہی نہیں بلکہ مظفر الدین بہت بڑا مربی بھی تھا۔ اس نے ایرج مرزا کی شاعرانہ استعداد کو بھانپ لیا اور اس کی قابلیت کی تعریف کی۔ چنانچہ اس نے ایرج مرزا کو صدر الشعراء کے لقب سے سرفراز کیا۔ ایرج مرزا ایک عرصہ تک شاہ کی خدمت میں رہا مظفر الدین شاہ ایرج سے کافی متاثر تھا۔ لہذا اسے اپنا منشی خاص مقرر کیا اور جب حکومت کے کاروبار کے سلسلے میں مظفر الدین شاہ طہران ۱۳۱۴ھ میں واپس آیا تب ایرج کو بھی اپنے ساتھ لایا۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا جب ایرج مرزا نے اپنے وطن سے باہر قدم رکھا۔ اسی زمانے میں شاہ نے کرمان اور یزد کے منشی کا عہدہ ایرج مرزا کو دیا۔ یہاں یہ نوٹ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حکومتِ ایران مغربی حکومتوں سے زیادہ ربط پیدا کرنے میں کوشاں تھی اس ضمن میں حکومتِ ایران نے ایک خاص پالیسی اختیار کی۔ حکومتِ ایران نے مغربی تعلیم

---

[1] تاریخ ادبیاتِ ایران ص ۳۴۵ [2] ص ۲۰

کو اپنے ملک میں علم کرنا ضروری سمجھا تاکہ ملک کی سیاسی اور اقتصادی حالت بہتر سے بہتر بن سکے۔ کچھ حد تک یہ پالیسی مفید ثابت ہوئی۔ اس پالیسی کے تحت ایران نے کئی لوگوں کو انگلستان، فرانس اور یورپ کے دیگر ممالک میں بھیجنا شروع کیا۔ ۱۸۵۹ء میں شاہ ایران نے ۴۲ طلبہ کو تحصیل علم کے لئے فرانس بھیجا۔ حکومت کے دیگر افراد نے بھی یورپ کا سفر کیا۔ مظفر الدین شاہ کا یورپ کا سفر ایران کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ شاہ کے علاوہ جن لوگوں نے یورپ کا سفر کیا ان میں مرزا احمد خان قوام السلطنت بھی تھا۔ اسی کی ہمراہی میں ایرج مرزا نے بھی یورپ کا سفر کیا یورپ سے واپس لوٹنے کے بعد حکومت کا ایک نیا شعبہ ایرج کے ذمہ کر دیا گیا۔ یہ تجارت کا شعبہ تھا۔ ۱۳۱۶ھ میں ایرج مرزا آذربایجان سے جہاں وہ عہدۂ مذکور پر فائز تھا نظام السلطنت کی معیت میں طہران آیا۔ تذکرہ نگاروں نے اس کی وجہ نہیں لکھی۔ دوسرے سال ایرج خمسہ روانہ ہوا۔ اس نے طہران کیوں چھوڑا خمسہ کیوں گیا عدم معلومات کی وجہ سے ان کے جوابات نہیں ملتے۔ تاہم ایرج کی سوانح لکھتے وقت اتنی معلومات بھی غنیمت ہے کہ ۱۳۱۶ھ میں وہ طہران میں تھا اور ۱۳۱۹ھ میں وہ خمسہ روانہ ہوا۔

دورانِ ملازمت میں ایرج مرزا نے حکومت کے مختلف شعبوں میں اپنی خدمتیں انجام دیں۔ ۱۳۱۹ھ میں اس کی ملازمت میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ حکومت کی مشنری میں کسٹمس کا محکمہ بہت اہم مانا جاتا ہے۔ ایرج کی قابلیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت ایران نے اس محکمہ کی خدمات ایرج کے سپرد کیں۔ بقول خسرو ایرج بلجیم کے چند افراد کی سفارش سے ایرج کا تقرر ہوا۔[1]

اس محکمہ میں اس نے چند سال کام کیا اس دوران میں اسے کرمان شاہ اور کردستان بھی جانا پڑا اس وقت روس کوشاں تھا کہ اپنا اثر ایران پر ڈالے چنانچہ اس نے شاہِ ایران کو ایک کثیر رقم بطور قرض دینے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ حتیٰ کہ روس نے ایران کے محکمۂ کسٹمس پر بڑی حد تک اپنا قبضہ جما لیا۔[2] شاہ کی اس حرکت کو شعرائے وقت نے بھی محسوس کیا بلکہ اشعار لکھ کر حکومت

---

[1] دیوانِ ایرج مرزا ص ۴ [2] ماڈرن پرشین پوئٹری ص ۱۲۵

کی مذمت بھی کی۔ جعفر سیاح کا ایک شعر نمونتاً سپرد قلم ہے : ؎

مظفر زروسہا ستانید وام وزاں وام افتاد گمرک بدام

دراصل شاہ کو قرض کی ضرورت اس لئے پڑی کہ وہ یورپ جاکر اپنا علاج کرانا چاہتا تھا۔ اس نے پہلی بار یعنی ۱۹۰۰ء میں روس سے ۲۴۰۰۰۰۰ پونڈ قرض لئے اس کے عوض میں حکومت کی کسٹمس کی کل آمدنی (سوائے فارس اور پرشین گلف) روس کو دینے کا اقرار کیا۔[1] اسی طرح ۱۹۰۲ء میں یعنی ایک ہی سال بعد شاہ نے ۱۰۰۰۰۰۰ روبل قرض لئے۔ ایسی حالت میں شاہ نے اگر ایرج کا تقرر اس محکمہ میں کیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیوں کہ وہ اپنے لوگوں کو محکمہ میں رکھنا پسند کرتا تھا جن پر اسے پورا بھروسہ ہو اور ایرج مرزا تو اسی خاندان کا ایک فرد تھا۔ ایرج مرزا اس محکمہ میں چار سال تک خدمت انجام دیتا رہا۔ اس محکمہ میں مقامی لوگوں کے علاوہ بلجیم کے لوگ بھی خدمت گذار تھے۔ چند وجوہات کی وجہ سے ایرج نے اس ملازمت کو خیرباد کہا۔ ایرج مرزا کی زندگی میں یہ چیز نمایاں معلوم ہوتی ہے کہ اس نے ایک سے زیادہ اداروں اور شعبوں میں کام کیا۔ یہ ادارے ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ دورانِ ملازمت میں ایرج نے اپنی لیاقت اور قابلیت کا سکہ حکومت کے بڑے افسروں پر جمالیا تھا۔ حکومتِ ایران اس کی قابلیت کا لوہا مان چکی تھی۔ اسی وجہ سے گمرک سے نکلنے کے بعد صنیع الدولہ نے ایرج مرزا کو محکمہ تعلیم میں نمایاں عہدہ دیا۔ ایرج نے ۱۳۲۵ھ تک اس محکمہ میں خلوص نیتی اور دلجمعی سے کام کیا۔ بقول خسرو ایرج اس محکمہ سے نکلنے کے بعد ایرج مرزا پھر محکمہ گمرک میں داخل ہوا۔[2] الغرض ایرج مرزا نے مختلف شعبوں میں خدمت انجام دی۔ دورانِ ملازمت میں ایرج مرزا کو ایک جانکاہ اور جگرخراش سانحہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۳۳۳ھ میں اس کا جوان لڑکا جعفر قلی مرزا اس دنیا سے چل بسا۔[3] ایرج مرزا نے ذیل کے اشعار میں اپنے لختِ جگر کی موت کا تذکرہ کیا ہے۔ آخری شعر سے تاریخ وفات بھی ملتی ہے :

ہر کہ آمد دریں جہاں ناچار رود از ایں جہاں چہ شہ و چہ گدا

---

[1] دیوان ایرج مرزا ص ہ [2] ایضاً

یک جہاں دگر خدای آراست / کہ بود نام آن جہاں بقا
سوی دار بقا رود ہر کس / کہ بیاید دریں سرای فنا
پور ایرج نوادۂ خاقان / آں ملک زادۂ فرشتہ لقا
من باد صرد او بمن عم بود / نہ من او را نہ او بدید مرا
ز بیست پنجاہ واند سال بدہر / چوں دریں خاکداں ندید دفا
سوی جنت برفت بادل شاد / تا بماناد جاوداں آنجا

بہر تاریخ فوتش ایرج گفت
رفت جعفر قلی از ایں دنیا[1]

دورانِ ملازمت میں ایرج نے ایک آسودہ زندگی بسر کی۔ چوں کہ شاہی خون رگوں میں تھا اس لئے رہنے سہنے کا طریقہ بھی ایسا ہی تھا جس سے شاہانہ جھلک نمایاں ہو چنانچہ اس کا مکان خاص رونق اور جاذبیت کا حامل تھا جس کے فرش بیش بہا قالین سے ڈھکے ہوتے جس کا صحن اس بات کا گواہ تھا کہ یہ کسی معمولی آدمی کا مکان نہیں ہے بلکہ ایک ثروت مند کا ایک صاحب جاہ وجلال کا یا ایک شہزادہ کا مکان ہے جس میں ایک اعلیٰ صحن ہی نہیں بلکہ ایک خوبصورت حوض بھی ہے جس کی خوبصورتی کے لئے بہتر سے بہتر انجنیئروں نے خون پسینہ ایک کیا تھا آرٹ کے بہترین نمونے تھے۔ ایسی عالی شان اور باوقار کوٹھی میں جو چیزیں رونق بڑھانے والی تھیں ان میں طرح طرح کے موسیقی کے آلات بھی تھے تاکہ لمحاتِ عیش میں اپنے آقا کو محظوظ کرسکیں۔ چوں کہ ادبی ذوق اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اس لئے اس نے بے شمار کتابوں کا ذخیرہ فراہم کیا جس سے ایک چھوٹا سا خوبصورت کتب خانہ بن گیا تھا۔ ایرج مرزا خود اس آسودہ زندگی کا اور اس شاندار مکان کا ذکر اپنے ذیل کے اشعار میں کرتا ہے:

ہمہ اسباب عیشم آمادہ / خانہ عالی و صحنِ خانہ گزیں

---

[1] دیوان ایرج مرزا ص ۱۷۶

فرشہا داشتم ہمہ زر تار | جہلہا داشتم ہمہ زرین
نرد و شطرنج از صنائع ہند | قلم و کاغذ از بدائع چین
میزہا خوب و پردہ ہا مرغوب | حوضم از سنگ و آیئنہ سنگین
دف و نی بے حساب در تالار | خم می بے عدد بشیب زمیں
اسپہا در طویلہ ام بستہ | ہمہ را پای بند و رشمہ و زین
در تشنگی کتابخانہ من | شدہ ہمچو نگار خانۂ من

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایرج نے حکومت کے مختلف شعبوں میں شہرت اور ہر دل عزیزی حاصل کی لیکن ان کے باوجود اس کی زندگی میں ایک خلا سا تھا۔ اطمینان، سکون اور سچی راحت جن کا وہ خواہاں تھا اسے نصیب نہیں ہوئے ملازمت اس کی طبیعت کے خلاف تھی لیکن حالات نے اسے مجبور کیا تھا اس پر طبیعت ایسی پائی تھی کہ آخر حسب خاطر پونجی باقی رہی نہ کوئی جائداد، اس کا ذکر وہ خود اپنے ذیل کے اشعار میں کرتا ہے:

بعد سی سال قلم فرسائی | نوکری، کیسہ بری، ملائی
گاہ حاکم شدن و گاہ دبیر | گہہ ندیم شہ و گہہ یار وزیر
گرد سرداری سلطان رفتن | بلہ بلہ قربان گفتن
باز ہم کیسہ ام از زر خالیست | کیسہ ام خالی و ہمت عالیست
نہ سری دارم و نہ سامانی | نہ دہی، مزرعۂ و نہ دکانی
نہ سرو کار بیک بانک مراست | نہ بیک بانک یکی دانگ مراست [۲]

چنانچہ اطمینانِ قلب کا ایرج آخر تک خواہاں تھا۔ اس ضمن میں خسرو ایرج کے یہ الفاظ قابلِ تحریر ہیں:

"ہموارہ غمگیں و مترصد استخلاص ازیں شغل نامطبوع بود" [۳]

ایرج کی زندگی میں کئی حادثات رونما ہوئے کئی طوفان آئے لیکن ایسے آلام و مصائب میں

---

[۱] دیوان ایرج مرزا ص ۱۴۸ [۲] ایضاً ص ۸۹-۹۰ [۳] ایضاً ص ۳

اس نے صبر و استقلال کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس نے زندگی کا مقابلہ ڈٹ کر کیا۔ اس نے زندگی کے اس تاریک پہلو پر کبھی زیادہ غور نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف کامیاب شاعر بنا بلکہ زندگی کے ہر مرحلہ پر مشعلِ راہ بنا جس کی روشنی سے اس نے اپنے ملک کی اپنے ہم وطنوں کی راہنمائی کی۔

ایرج مرزا کو ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ گو اس کی زندگی کا بیشتر وقت ملازمت و ربلی قربان بلی قربان کہتے گذرا تاہم ادبی ذوق ہمیشہ اس سے وابستہ رہا۔ ادب اور شاعری کا ایک غیر معمولی ذوقِ سلیم وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا جو اس کے کلام کے ہر لفظ سے بلکہ ہر حرف سے واضح و قاطع ہے۔ فارسی کے ساتھ ساتھ ایرج مرزا عربی اور فرانسیسی زبان اور ادب کا بڑا شائق تھا جس کا اندازہ اس کے کلام سے بخوبی لگ سکتا ہے۔ ایرج مرزا کو کتب بینی کا بے حد شوق تھا بسا اوقات اس کو حالاتِ مخالف اور نامساعد سے سابقہ رہا۔ سرکاری ملازمت کے قیود انتظامی عہدوں کی ذمہ داریاں اور ان کی وجہ سے علمی مرکزوں سے بُعدِ مسافت اور علمی صحبتوں کی عدم موجودگی میں کتابیں ہی اس کی بہترین انیس و ہمدم ہوا کرتی تھیں۔ کتابیں ہمیشہ اس کے ساتھ خلوت و جلوت میں رہتیں۔ کتب بینی کے لئے ایرج مرزا اتنا وقت ضرور نکال لیتا کہ وہ ان کا مطالعہ چند لمحوں کے لئے کر سکے مطالعہ کے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ جدید تصانیف یا دیوان پڑھتا رہے بلکہ شعرائے متقدمین کے کلام سے بھی اسے اتنا ہی لگاؤ تھا جتنا لگاؤ اسے جدید ادب و شاعری سے تھا۔ ذیل کے اشعار سے جہاں وہ نظامی گنجوی کے اشعار کی طرف اشارہ کرتا ہے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ شعرائے متقدمین کا کلام بھی اس کے مطالعہ کا ایک جزو تھا۔ یہ اشعار ایرج کی نظم "نصیحت بفرزند" سے ماخوذ ہیں۔

خوانم بتو بیتی از نظامی — آں میر سخنورانِ نامی
بالا نگری بغایت خود — بہتر ز کلاہ دوزیِ بد[1]

[1] دیوانِ ایرج مرزا ص ۲۸

نیز ایک قصیدے میں ایرج مرزا اپنے ممدوح کو (جو غالباً اس کا اپنا لڑکا ہی ہے) تحصیلِ علم کی طرف راغب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ درس و تدریس سے جب تیری طبیعت اکتا جائے تب میں تجھے تواریخ اور کتبِ سیر سے خلفائے راشدین کے قصے سناؤں گا تاکہ تیری تکان دور ہو جائے اس ضمن میں ذیل کے اشعار جس سے ایرج کی کتب بینی کا پتہ چلتا ہے ملاحظہ ہوں :

شب کہ از درس شدی خستہ واز مشق کسل　　نقل گویم بتو از روی تواریخ و سیر

قصہ ہا بہر تو خوانم بر ش ہیچ بود　　یعنی قصۂ عثمان و ابوبکر و عمر[۱]

ذوقِ کتب بینی کے ساتھ ساتھ ایرج مرزا کو کتب فراہمی کا بھی بڑا شوق تھا۔ اس سے ایرج کی اپنی لائبریری کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی تصدیق اس کے ایک شعر سے ہوتی ہے جہاں وہ اپنے کتب خانہ کا ذکر کرتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایرج مرزا نے کتابوں کی حفاظت اور آراستگی میں اپنی خاص توجہ دی تھی جس کی وجہ سے اس کا یہ کتاب خانہ نگارستانِ چین کو شرمانے کے لئے کم نہ تھا۔ چنانچہ اس کا شعر حسبِ ذیل ہے :

در تشنگی کتاب خانۂ من　　شدہ ہمچو نگار خانۂ چین

ایرج مرزا کو شعر و شاعری سے بے حد لگاؤ تھا۔ زندگی کے ہنگاموں سے جب فرصت ملتی وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہوتا۔ اس کی یہی دلچسپی تھی جس کی وجہ سے وہ مشاعروں اور مسابقوں میں حصہ لیتا تھا۔ طہران میں ایک مسابقہ ہوا جس میں بہت سے ادیبوں نے حصہ لیا تھا۔ مسابقہ کا مضمون ”مکن مارا فراموش“ یعنی ”ہمیں بھول نہ جا“ تھا۔ اس مضمون کو شعرا نے اپنے طور پر الگ الگ پیرایہ میں باندھا۔ اس وقت ایرج مرزا نے جو اشعار موزوں کئے وہ ”ہدیۂ عشق“ کے زیرِ عنوان اس کے دیوان میں موجود ہیں۔ ان اشعار میں ایرج نے ایک قصہ بیان کیا ہے جس میں وہ ایک عاشق کا ذکر کرتا ہے جس نے محبوب کی آرزو کو پورا کرنے کے لئے اپنی جان تک دے دی۔ چوں کہ ان اشعار کی تعداد زیادہ ہے اس لئے چند منتخب اشعار ذیل میں سپردِ قلم ہیں :

---

[۱] دیوان ایرج مرزا ص ۱۶۱

عاشقی محنتِ بسیار کشید | تا لبِ دجلہ بمعشوقہ رسید
تشدہ از گلِ رویش سیراب | کہ فلک دستہ گلی داد باب
نازنین چشم بشط دوختہ بود | فارغ از عاشقِ دلسوختہ بود
دید در روی شط آید بشتاب | نوگلی چوں گل رویش سیراب
گفت وہ وہ چو گلِ رعنائیست | لایق دست چو من زیبائیست
حیف ازایں گل کہ برد آب او را | کند از منظرہ نایاب او را
زیں سخن عاشق معشوق پرست | جست در آب چو ماہی از شست
باری آں عاشق بے چارہ چو بط | دل بدریا زد و افتاد بشط
دید آبیست فراوان و درست | بنشاط آمد و دست از جان شست
دست و پائی زد و گل را بر بود | سوی دلدارش پرتاب نمود
گفت کی آفتِ جاں سنبلِ تو | ما کہ رفتیم بگیر ایں گلِ تو
بکنش زیب سرائے دلبر من | یاد آبی کہ گذشت از سر من
جز برای دلِ من بوش مکن | عاشقِ خویش فراموش مکن

ایرج مرزا کو شروع ہی سے شاعری سے لگاؤ تھا۔ ایسی کم عمر میں اس کی استعدادِ شاعری کو دیکھ کر لوگوں نے اس کی ہمت افزائی کی ان لوگوں میں حسن علی خاں امیر نظام گروسی مشہور ہے۔ ایرج مرزا نے اپنی مشق جاری رکھی اور شعر موزوں کرتا رہا۔ اس نے ہر وقت نئے موضوعات کو شاعری میں داخل کیا۔ چنانچہ اس کا دیوان اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ اس میں متقدمین کا رنگ بھی پایا جاتا ہے اور اس کے اپنے زمانہ کا حال بھی رونما ہے ادب اپنے زمانے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جب تک شاعری بادشاہوں اور ان کے درباریوں کی جود و سخا کی مرہونِ منت رہی قصیدہ اور غزل سے آگے نہ بڑھ سکی۔ شاعروں نے اپنی تمام قوتِ فکر ممدوح کی بیجا اور بے جا تعریف میں صرف کر دی یہی وجہ ہے کہ فارسی ادب کا بیشتر حصہ قصیدہ گوئی۔ غزل سرائی اور مثنوی نگاری سے بھرپور ہے۔

اس وقت کوئی شاعر نہ تھا جو شعرگوئی کے میدان میں انقلاب پیدا کر سکتا تھا۔ کسی نے شاعری کو سیاست، اقتصادیات اور سماج کی ترقی کے لئے آلۂ کار نہیں بنایا کیوں کہ ایسا کرنا اس کے لئے موت کو پیغام دینے کے برابر تھا۔ صفوی دور میں ایران میں عظیم انقلاب کی ابتدا ہوئی اور یہ انقلاب قاچار دور میں عروج پر پہنچا۔ آزادی اور سلاطینِ وقت کے خلاف نعرے یہی زمانہ کی پکار تھی۔ نیز ملک اور اس کے باشندوں کی ترقی و خوش حالی نے شعرا کی توجہ مبذول کی تھی۔ آزادی کے متوالے شعرا نے لوگوں میں آزادی کی محبت کو ابھارا۔ علاوہ ازیں سماج کی خرابیوں کو دور کرنا بھی موضوعاتِ شاعری میں داخل تھا۔ لہذا شعرائے وقت کے کلام ان سے لبریز ہیں۔ اسی زمانہ میں ایرج نے جنم لیا تھا۔ لہذا ماحول کا اثر اس کی شاعری پر لازمی اور یقینی تھا۔ ایرج مرزا نے ملک و قوم کی ترقی کے لئے تعلیم کو زیادہ اہم سمجھا۔ ملک کی ترقی کا دارومدار بڑی حد تک اس کے تعلیم یافتہ ہونے پر ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کو ایرج نے مغربی ملکوں میں پایا۔ ان ملکوں کے مقابلہ میں ایرج نے ایران کو بہت پیچھے پایا۔

ایرج اس نظامِ تعلیم کے بھی خلاف تھا جو اس کے زمانہ میں رائج تھا۔ یہ نظامِ تعلیم ملک کی ترقی کے لئے زیادہ مفید نہیں تھا۔ اس قسم کی رائے ایرج مرزا نے غالباً اس وقت قایم کی جب اہلِ مغرب نے تعلیم کے میدان میں نئی چیزیں دریافت کیں۔ جس وقت روسو اور جان ڈیوی نے پورے تعلیمی نظام کو بدل کر رکھ دیا۔ ان لوگوں نے تعلیم میں بچہ کو زیادہ اہمیت دی انھوں نے بچوں کی ذہنی و جسمانی قابلیتوں اور اس کی استعداد اور پسند کو زیادہ اہم سمجھا اور اس کے مطابق نئے طریقے دریافت کئے لیکن ایران کا نظامِ تعلیم ہنوز پرانی طرز پر قائم تھا جہاں بچہ کی انفرادیت کو نظر انداز کیا جاتا اور معلومات کا ذخیرہ

۱؎ دیوان ایرج مرزا ص ۲۱

چنانچہ امیری شاعر نے علی الاعلان کہا کہ شعرا لیلیٰ و مجنوں کے قصوں کے بدلے شاعری سے وطن کی ترقی کا کام لیں۔ امیری کے شعر یہ ہیں:

قصۂ قیس و غصۂ لیلیٰ	حرف محمود و سرگذشتِ ایاز
کہنہ شد این فسانہا یکسر	کن حدیثِ نوی ز سر آغاز
بگذر از این فسون و این نیرنگ	دیگر ازین سخن فسانہ مساز
گر ہوائے سخن بود بسرت	از وطن بعد ازین سخن گو باز

بچوں کے دماغ پر جبراً ٹھونسا جاتا تھا چنانچہ ایرج کی ذیل کی نظم اس ضمن میں قابلِ ذکر ہے جس میں ایرج نے شاگرد اور استاذ دونوں کے نظامِ تعلیم سے بیزاری کا اظہار کیا ہے :

چنیں میگفت شاگردی بمکتب　　کہ ایں مکتب چہ تاریکست یارب
نباشد جز ہماں تاریک دیوار　　ہماں لوح سیاہ و تیرہ و تار
ہماں درس و ہماں بحثِ مبیّن　　ہماں تکلیف و آں جائی معین
ہمیشہ ایں کتاب و ایں قلمداں　　ہمیں دفتر کہ در پیش است و دیوان
نشاید خواند ایں را زندگانی　　کسالت باشد ایں نہ شادمانی
معلم در جوابش ایں چنیں گفت　　کہ باشد حالِ تو با حالِ من جفت
ہمیں منبر مرا ہموارہ در زیر　　کنم ہر صبحگہ ایں درس تکریر
نباشد جز ہماں قیل و ہماں قال　　ہماں تحویلِ صرف و نحو اطفال
چہ اطفالی کہ با ایں جملہ تدریس　　نمی دانند جز تزویر و تلبیس
چناں تنبل بوقتِ درس خواندن　　کہ ہم خود را کسل سازند و ہم من

بشاگرد و معلم بار بسیار
بگردن ہست و باید برد ناچار[1]

ایرج مرزا کے یہاں تعلیم کے متعلق اس قسم کی اور نظمیں بھی ہیں جو بچوں کی تعلیم کے لئے بہت مفید ہیں۔ اس کی ایک نظم جس کا عنوان "شوقِ درس خواندن" مشہور و معروف ہے ایرج نے آسان پیرایہ میں بچوں میں علم کا شوق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم کے ابتدائی اشعار یہ ہیں :

حمد پروردگار یکتا بود　　کہ مرا شوقِ درس خواندن داد
آشنا کرد چشمِ من بکتاب　　داد توفیق خیرم از ہر باب
در سرِ من ہوای درس نہاد　　در دلِ من محبتِ استاد[2]

---

[1] دیوان ایرج مرزا ص ۲۴-۲۵　[2] ایضاً ص ۱۱۲

نئے دور کے ماہرین تعلیم نے ٹکنیکل ایجوکیشن پر زیادہ زور دیا ہے اس میں علم طب ریاضی وغیرہ سب ہی شامل ہیں۔ چنانچہ اپنی ایک نظم میں ایرج نے اپنے لڑکے کو چند نصیحتیں لکھی ہیں جن میں ان پر بھی زیادہ زور دیا ہے۔ یہ نظم ایرج نے گو اپنے لڑکے کے لئے لکھی جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے لیکن پورا ملک اس سے مستفید ہو سکتا ہے چنانچہ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں :

امروز سہ سال پیش ازیں نیست　　بے علم دگر نمیتواں زیست

گر صنعت و حرفت ندانی　　زحمت ببری ز زندگانی

از طب و طبیعی و ریاضی　　قلب تو بہرچہ ہست راضی

یک فن بپسند و خاص خود کن　　تحصیل باختصاص خود کن [1]

تعلیم کے علاوہ ایرج سماج کی ترقی کے لئے بھی اپنی شاعرانہ استعداد کو کام میں لایا۔ عورت اور اس کی آزادی اور اس کا سوشل رتبہ شعراء کے کلام کا موضوع بن چکا تھا۔ نئے دور کے شعرا نے عورت کو اس کے اپنے حقوق دلانے میں بڑی مدد کی۔ انھوں نے عورت کے وجود کو نہایت اہم سمجھا۔ ان کی نظر میں عورت ملک کی ترقی میں اتنی ہی مفید ہے جتنا کہ مرد۔ لیکن عورت کی پسماندہ حالت کو دیکھ کر شعراء وقت نے صدائے احتجاج بلند کی۔ چنانچہ عارف اور دیگر شعرا کے کلام میں اس مسئلہ پر کافی اشعار ملتے ہیں۔ ایرج مرزا بھی عورت کو احترام کی نظر سے دیکھتا تھا جیسا کہ اس کے ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے۔ ان اشعار میں ایرج نے عورت کو مرآت جمالِ ذوالجلال کہا ہے اور دوسرے شعر میں اسے باغِ زندگی میں ریاحین سمجھا ہے :

(۱) تو مرآتِ جمالِ ذوالجلالی　　چرا مانند شلغم در جوالی [2]

(۲) بباغِ جان ریاحینند نسواں　　بجای ورد و نسرینند نسواں [3]

ایرج مرزا پردہ وحجاب سے متنفر تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عورت گھر کی چار دیواری میں منہ کو ڈھانکے بیٹھی رہے۔ بلکہ ایران کی تعمیر میں ایرج چاہتا تھا کہ وہ بھی مردوں کا ہاتھ بٹائے۔ نیز وہ

---

[1] دیوان ایرج مرزا ص ۲۸　[2] ایضاً ص ۴۴　[3] ایضاً ص ۴۰

رقمطراز ہے کہ حجاب کے متعلق نہ کوئی حدیث آئی ہے اور نہ کوئی خبر ہے کہ عورت اس طرح اپنا منہ چھپائے دنیا سے الگ رہے اس سوشل مسئلہ پر ایرج نے کئی اشعار لکھے۔ عارف نامہ میں ایرج نے بالخصوص اس مسئلہ پر مفصل بحث بھی کی ہے۔ ذیل میں اس کے چند اشعار سپرد قلم ہیں:

(۱) خدایا تا بکی مرداں بخوابند | زناں تا کئے گرفتارِ حجابند

(۲) بدآں خوبی در ایں چادر کریہی | بہر چیزی بجز انساں شبیہی
کہ داست آں حدیث و آں خبر کو | کہ باید زن کند خود را چو لولو

(۳) پیمبر آنچہ فرمودہ است آں کن | نہ زینت فاش نہ صورت نہاں کن
حجاب دست و صورت خود یقینت | کہ ضدِ نص قرآنِ مبین است

(۴) در اقطارِ دگر زن یارِ مرد ست | در ایں محنت سراسر بار مرد ست
تو اے با مشک و گل ہمسنگ و ہمرنگ | نمیگردد در ایں چادر دلت تنگ
نہ آخر غنچہ در سیر تکامل | شود از پردہ بیروں تا شود گل
تو ہم دستی بزن ایں پردہ بردار | کمالِ خود بعالم کن نمودار
تو ہم ایں پردہ از رخ دور میکن | در و دیوار را پر نور میکن

ایرج مرزا کی شاعری پر سرمایہ داری اور مزدور نے بھی اثر ڈالا ہے۔ شاعر کی حساس طبیعت نے ان دو انسانوں میں جو فرق پایا اس کا اظہار اس نے اپنے کلام میں کیا۔ ایرج مرزا سرمایہ داری کے خلاف تھا اور ملک کو اس کے خراب اثرات سے بچانے کے لئے اس نے اپنی شاعری سے کام لیا وہ سرمایہ داروں کے بے جا گھمنڈ کے سخت خلاف تھا۔ ایرج کی یہ رائے تھی کہ مزدور اور سرمایہ دار دونوں یکساں ہیں۔ بغیر مزدور کی مزدوری کے سرمایہ دار آگے بڑھ نہیں سکتا۔ اس یکسانیت کو قایم رکھنے کے لئے جس پر ملک و قوم کی ترقی کا بڑی حد تک دارومدار ہے ایرج نے ایک چھوٹی لیکن پر اثر نظم لکھی جس کا عنوان "کارگر" ہے، اس نظم کے چند منتخب اشعار یہ ہیں:

شنیدم کار فرمائی نظر کرد | ز روی کبر و نخوت کارگر را

بگفت انگبین را این نخوت از چیست | چو مزد رنج بخشی رنجبر را
تو از من زور خواہی من ز تو زر | چہ منت داشت باید یکدیگر را
زنی یک بیل اگر چوں من در انخاک | بگیری با دو دستِ خود کمر را
نشانم از جبیں گوہر در ایں خاک | نشانم از تو پاداش ہنر را
نہ باقی دارد ایں دفتر نہ فاضل | گہر دادی و پس دادم گہر را

ملک کی ترقی میں شراب بندی کو ایک خاص و عام کا کام سمجھا جاتا ہے۔ ہر ذی ہوش آدمی اس کے نقصانات سے بخوبی واقف ہے۔ تاریخ کے اوراق اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ سوشل رفارمرز نے شراب بندی کے واسطے بڑی جدوکد سے کام لیا۔ ایرج نے اس موضوع کو اپنے سامنے رکھا اور اس پر شعر موزوں کئے۔ اس نے نہایت دلچسپ قصہ بیان کرکے شراب کی مذمت کی ہے تاکہ لوگ اس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ قصہ یوں ہے: ایک شخص نے ابلیس کو خواب میں دیکھا جس کی شکل بڑی ڈراؤنی تھی اس نے اس شخص سے کہا کہ وہ موت ہے اگر تو جان کی سلامتی چاہتا ہے تو ان تینوں کاموں میں سے کوئی ایک کام کر یا تو اپنے باپ کو قتل کر یا بہن کو یا شراب پی۔ ان میں سے اس شخص نے شراب کو پسند کیا اور شراب پی لی کیوں کہ اسے باپ سے اور بہن سے محبت تھی۔ جوں ہی شراب سے وہ مست ہوا اس نے باپ اور بہن دونوں کو قتل کر ڈالا۔ چنانچہ ایرج نے اس قصہ کو اس انداز میں بیان کیا ہے:

ابلیس شبی رفت بہ بالینِ جوانی | آراستہ با شکل مہیبی سر و بر را
گفتا کہ منم مرگ و اگر خواہی زنہار | باید بگزینی تو یکی زیں سہ خطر را
یا آں پدر پیر خودت را بکشی زار | یا بشکنی از خواہر خود سینہ و سر را
یا خود ز می ناب بنوشی دو سہ ساغر | تا آنکہ بپوشم ز ہلاکِ تو نظر را
لرزید از ایں بیم جواں بر خود و جا داشت | کز مرگ فتد لرزہ بتنِ ضیغمِ نر را
گفتا نکنم با پدر و خواہرم ایں کار | لیکن بمی از خویش کنم دفع ضرر را

جامی دو سہ می خور چو شد چیرہ ز مستی | ہم خواہر خود را زد و ہم کشت پدر را
ای کاش شود خشک بن تاک خداوند | زیں مایہ شر حفظ کند نوع بشر را[1]

ایرج نے شاعری سے قوم اور ملک کی اصلاح کا کام لیا جیسا کہ مذکورہ بالا بحث سے واضح ہے۔ لیکن ایرج کی شاعری کو صرف اصلاح تک محدود کرنا ایک سخت ناانصافی ہے۔ اس کا دیوان گوناگوں موضوعات کا حامل ہے اس میں متقدمین کا رنگ ہی نہیں جھلکتا ہے بلکہ یہ زمانہ حال کا بھی آئینہ دار ہے۔ اس کے کلام میں رومی، حافظ اور سعدی کا اثر ہی نہیں بلکہ بہار۔ عارف اور دیگر شعرائے وقت کا اثر بھی نمایاں ہے۔ ایرج مرزا نے تصوف، فلسفہ اور سیاست تینوں کو اپنا میدان قرار دیا ہے۔ اس کی نظم "مرگ ضعیف"، "وفا"، "اشک شیخ" وغیرہ میں فلسفیانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ اور اس کے ذیل کے اشعار سے تصوف اور بے ثباتی عالم کا پتہ چلتا ہے:

ہر کہ آمد دریں جہاں ناچار | رود ازیں جہاں چہ شہ چہ گدا
یک جہان دگر خدای آراست | کہ بود نام آن جہانِ بقا
سوی دارِ بقا رود ہر کس | کہ بیامد دریں سرای فنا

اسی طرح یہ بھی اشعار ملاحظہ فرمائیے

چشم عبرت کشا ببیں کہ چساں | مسندِ جم بداد بر کف باد
ہمہ ناکام از زمانہ روند | زانکہ کام کسی زمانہ ندارد
جائہ مرگش آسماں دوزد | ہر کہ اندر زمیں ز مادر زاد

ایسے باکمال شاعر اور مصلح قوم نے دوشنبہ ۲۸ رشعبان ۱۳۴۳ھ میں وفات پائی۔ خسرو ایرج کا بیان ہے کہ قلب کی حرکت یکایک بند ہوجانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی چنانچہ اس کا بیان حسب ذیل ہے:

"...... روز دوشنبہ ۲۸ رشعبان ۱۳۴۳ھ ...... یکساعت بغروب در اثر سکتۂ قلبی دار فانی را بدرود گفتہ وطومار زندگانی را درہم پیچید"[2]

---

[1] دیوان ایرج مرزا ص ۱۰ [2] ایضاً ص ۵

مصر ۱۸۹۸ - ۱۸۹۹ء میں

ایک ہندوستانی سیاح کا سفرنامہ

(از جناب ڈاکٹر عابد رضا صاحب بیدار)

ہندوستان کے مشہور عربی داں عبدالرحمٰن امرتسری نے انیسویں صدی کے آخری برس مصر، شام اور ترکی کی سیاحت میں گزارے۔ اور واپسی پر ۱۹۰۵ء میں اپنے تاثرات کو کتابی شکل دے کر ایک سفرنامہ شائع کیا۔ یہ سفرنامہ اردو میں بلادِ اسلامیہ کا پہلا سفرنامہ ہے جو کسی ہندوستانی نے لکھا ہے۔ خواجہ غلام الثقلین کا سفرنامہ (اشاعت ۱۹۱۲ء) اور شبلی کا سفرنامہ روم و مصر و شام، (اشاعت ۱۹۱۴ء) اس کے بعد کی چیزیں ہیں۔ اس سفرنامہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ علمی، سیاسی، معاشرتی اور مذہبی ہر پہلو کا احاطہ کیا ہے اور کسی تفصیل کو نظرانداز نہیں ہونے دیا ہے۔ لیکن اس سے ایک خرابی بھی راہ پا گئی ہے کہ بعض بالکل فضول تفاصیل داخل ہو گئی ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کو عرصہ گزر گیا ہے اور اب اس کی حیثیت نایاب جیسی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے بہت کم طلبار کو اس کا علم ہو گا۔ اس کی افادیت کے پیشِ نظر میں نے سفرنامہ کے اس حصّہ کو جو مصر سے متعلق ہے، اور کتاب کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر محیط ہے، غیر ضروری تفاصیل کو چھوڑ کے مصنف ہی کی زبان میں، ضروری حصّوں کو ترتیب دے دیا ہے اور اس طرح آخر انیسویں صدی کے مصر کی ایک واضح تصویر سامنے آ جاتی ہے۔

مصر کی تاریخ میں یہ زمانہ کئی اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، ۱۸۹۸ - ۱۸۹۹ء تک مصر پر برطانوی تسلط، جس کی ابتدا ۱۸۸۲ء میں ہوئی تھی اپنی جڑیں مضبوط کر چکا تھا۔ سوڈان میں محمد احمد المہدی کی قیادت میں جو انقلابی تحریک شروع ہوئی تھی اور جس نے ۱۶، ۱۷ سال تک برطانیا کو پریشان کئے رکھا، آخر اس سال شکست کھا گئی۔ سوڈان پر برطانیا کا قبضہ ہو گیا اور ۱۸۹۹ء کے

معاہدہ کی رو سے سوڈان مصری، برطانوی مشترکہ مقبوضہ قرار دے دیا گیا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب مصر میں قومی تحریک کی چنگاری از سرِ نو بھڑکنے لگتی ہے۔ نئے خدیو مصر عباس حلمی کے انگریز دشمن رویہ سے شہ پاکر قوم پرست کافی دلیر ہونے لگے تھے۔ پھر نیا تعلیم یافتہ نوجوان گروپ تھا جو قوم پرستی کے جذبہ سے سرشار اپنے ملک کو غیر کے قبضہ میں دیکھ کر جھنجھلا اٹھتا تھا۔ انگریزی عہد میں اقتصادی اور انتظامی استحکام نے مصریوں میں ایک نئے درمیانی طبقہ کو جنم دیا تھا جو ملک کی باگ ڈور انگریز کے بجائے اپنے ہاتھ میں دیکھنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ پریس کی آزادی اور اخبار و رسائل کی فراوانی نے قومی شعور کو بیدار کرنے میں خاصا حصہ لیا تھا۔ نئی قومی تحریک کی قیادت انھیں اخبار نویس قائدوں کے ہاتھ میں تھی۔ مصطفیٰ کامل اس تحریک کا قائد اعلیٰ تھا۔ اعتدال پسند گروپ کی قیادت المؤید کے اڈیٹر علی یوسف کے ہاتھ میں تھی۔ اور خود خدیو بھی انگریزوں سے نفرت کرتا تھا۔

ان قوم پرستوں کی منطق سیدھی سادی تھی۔ انگریزوں نے ابھی تک مصر پر باقاعدہ قبضہ کا اعلان نہیں کیا تھا (اور یہ اعلان وہ ۱۹۱۴ء کی جنگ چھڑنے تک نہیں کر پائے) سلطنتِ عثمانیہ ابھی تک قانونی طور سے مصر کی حاکمِ اعلیٰ تسلیم کی جاتی تھی اور خدیو مصر اس کا نمائندہ۔ مصر ابھی تک ترکی کو مقررہ خراج ادا کرتا تھا۔ مصر کا سارا اندرونی انتظامی ڈھانچہ جوں کا توں تھا اور برائے نام خدیو اور اس کے وزراء حکومت کرتے تھے۔ انگریزوں نے صرف اتنا کیا تھا کہ ہر محکمہ میں ایک انگریز مشیر لگا دیا تھا جو بظاہر مشورہ دینے پر مامور تھا لیکن اصلاً اس کا مشورہ حکم کی حیثیت رکھتا تھا، سب سے اوپر انگریزی ایجنٹ اور قونصل جنرل لارڈ کرومر تھا، جو خدیو کے لئے مشیرِ اعلیٰ کی حیثیت رکھتا تھا، اس کا مشورہ ماننا خدیو کے لئے ناگزیر تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود بین الاقوامی حالات کے سبب انگریز کھل کر اپنے قبضہ کا اعلان کرنے کی سکت نہیں پاتے تھے اور اسی کو بنیاد بنا کر قوم پرست اپنی تحریک شروع کر رہے تھے۔

اس زمانہ کے سیاسی مصر کی تو کافی تصویریں مل جاتی ہیں۔ مصر کے مالک انگریزوں نے اس موضوع پر تصانیف کا ڈھیر لگا دیا ہے لیکن عوامی مصر کا ذکر مشکل سے ملتا ہے۔ یورپین سیاح بھی

اپنی سیاست میں مگن، اسی کے گن گاتے گاتے سفرنامے ختم کر دیتے ہیں۔ ایک ہندوستانی سیاح نے اس مصر کو قلم اور سیاہی کے رشتہ میں پرو کر محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے، ۱۸۹۸-۱۸۹۹ء کا مصر، جب انیسویں صدی دم توڑ رہی تھی اور بیسویں صدی جنم لینے کے لئے بے چین تھی :-

"۲۹ را پریل ۱۸۹۸ء کو میں جہاز پر سوار ہوا۔ چھ دن کے عرصہ میں عدن پہنچا جو بمبئی سے ۱۶۶۴ میل ہے۔ عدن سے روانہ ہو کر ۹ رمئی کو سوئز پہنچا، یہ سفر ۱۳۱۰ میل کا تھا جو غالباً چار دن کے عرصہ میں طے ہوا۔ بمبئی سے سوئز تک ہر درجہ کی تفصیل یہ ہے :-

مسافر درجہ اول کے واسطے ۳۶۰ روپے، درجہ دوم کے واسطے ۲۲۰ روپے، درجہ سوم کے واسطے ۵۰ روپے [۱]

شہر سوئز مصر کا مشرقی بندرگاہ ہے۔ زمانہ قدیم سے اس کو قلزم کہتے تھے، چنانچہ بحیرۂ قلزم اسی کے نام سے مشہور ہے۔ اس وقت تقریباً بارہ ہزار آدمی اس میں سکونت رکھتے ہیں۔ سوئز پہنچنے کے بعد مقامی خصوصیات میں سے جو چیزیں ایک مسافر کو حیرانی میں ڈال دیتی ہیں ان کا مختصر سا اندازہ ان حالات سے ہو سکتا ہے :

(۱) **سکّہ کی حالت** : اس جگہ بیشتر رواج مصری سکہ کا ہے جو تین علیحدہ علیحدہ دھاتوں سے بنایا جاتا ہے۔ سب سے ادنیٰ سکّہ 'ملیم' ہے جو تانبے سے بنایا جاتا اور تین پائی کے برابر ہوتا ہے۔ اس سے دیر چاندی کا سکّہ 'قرش' ہے جو شکل میں دوقّی کے برابر اور ۲ آنے ۹ پائی کے مساوی ہوتا ہے اس سے اعلیٰ 'ریال' ہے جو روپیہ سے شکل اور حجم میں بڑا اور قیمت میں تین روپے دو آنے کا ہوتا ہے سب سے انتہائی قیمت کا سکّہ 'جنی' ہے جس کو مصری اشرفی کہنا چاہیئے، اس کی قیمت پندرہ روپے سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ ان تمام سکّوں میں ایک طرف کو ضربِ مصر اور سنہ ہجری منقش ہوتا ہے اور دوسری جانب کو سلطانِ روم کا طغرا۔ [۲]

---

[۱] اب کارگو کا بھی اس سے زیادہ کرایہ لگتا ہے جو اس زمانہ میں درجہ اول کا تھا اچھے بحری جہازوں کا کرایہ ۸۰۰ سے کم نہیں تمام کارگو بھی ۵۰۰ میں کام چل جاتا ہے اور معمولی جہازوں کا تھرڈ کلاس ۲۵۰ سے ۳۰۰ تک ہوتا ہے اس میں کھانے اور ناشتے کے اخراجات شامل ہیں۔ [۲] سکّے کے نام اب بھی یہی ہیں صرف بیچ کا ریال ختم ہو گیا ہے اور سلطانِ روم کے طغرے کا اب کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دس ملیم کا ایک قرش ہوتا ہے اور سو قرش کی ایک جنی (گنی) قرش ہمارے پرانے نو پیسوں کے

(۲) **اختلافِ زبان:** سوئز اور تمام بلادِ مصر میں عربی زبان بولی جاتی ہے مگر اس کا تلفظ اس قدر بگڑا ہوا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ان لوگوں سے بات چیت کرنے میں پریشان ہو جاتے ہیں، نہ ان کی بات سمجھتے ہیں نہ ان کو اپنا مطلب سمجھا سکتے ہیں۔ مثلاً ما اسمک کی جگہ اسمک ایہ (تمھارا کیا نام ہے)۔ الیٰ این تروح کی جگہ تروح فین (تم کہاں جاتے ہو)

(۳) **وقت کا اندازہ:** مصریوں میں شام سے طلوعِ آفتاب تک اور پھر صبح سے غروبِ آفتاب تک گھنٹے شمار ہوتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی مصری یہ کہے کہ ہم سے دو بجے دن کے ملاقات کرنا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ آٹھ بجے صبح کے۔[1]

سوئز سے صبح و شام دو مرتبہ ریل قاہرہ جاتی ہے۔ میں ریل پر سوار ہو کر قاہرہ چلا اور سات گھنٹے میں وہاں پہنچا۔

میں ۱۰ مئی ۱۸۹۸ء کو قاہرہ پہنچا اور برابر ایک برس تک یہاں مقیم رہا۔ جب ہندوستان سے سفر کرنے کو تھا تو میرے بعض دوست مصر کی سخت گرمی سے مجھ کو ڈراتے تھے، لیکن یہاں پہنچنے اور کچھ عرصہ قاہرہ میں مسلسل قیام کرنے سے معلوم ہوا کہ ان کی یہ رائے کلیۃً طور پر صحیح نہ تھی۔ اگرچہ یہ ملک منطقۂ حارہ کے قریب ہے مگر بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ شام جو اس کے مشرق اور شمال میں واقع ہیں اور نیز دریائے نیل جو مصر کی زمین کو جنوباً و شمالاً سیراب کرتا ہوا گزرتا ہے، ان کے باعث سے یہاں کی حرارت ناگوار نہیں ہوتی باوجودیکہ جون، جولائی اور اگست میں اس جگہ بارش نہیں ہوتی اور دن کو آفتاب کی حرارت بھی تیز ہوتی ہے مگر رات کو شمال مغربی ہواؤں کے چلنے سے خنکی ہو جاتی ہے۔ یہاں کے لوگ اسی خنکی کے باعث اکثر اوقات موسم گرما میں رات کے وقت مکانوں کے اندر سوتے ہیں۔ قاہرہ سے شمالی شہروں کی ہوا موسم گرما میں بہت زیادہ لطیف ہوتی ہے اور اس آب و ہوا کی عمدگی کا نتیجہ ہے کہ پیداوارِ ارضی بہت عمدہ اور لوگ خوبصورت ہوتے ہیں۔ لیکن جو شہر جنوب میں ہیں ان میں گرمی کے آثار زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔

---

[1] وقت کا اندازہ اب بالکل ہندوستان جیسا ہے، کوئی اختلاف نہیں سوائے جغرافیائی فرق کے۔

مصر کا موسمِ سرما یورپ اور امریکا کے دولت مندوں کے واسطے بڑی نعمت ہے۔ ہر سال صدہا سیاح اپنے ملک کی سخت سردی کے باعث اور مصر کی عمدہ آب و ہوا کے باعث یہاں چلے آتے ہیں۔

سب سے آخری مردم شماری جو ۱۸۹۷ء میں ہوئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں ۹۷ لاکھ ۳۴ ہزار باشندے آباد ہیں[1] جن میں ۸۹ لاکھ ۹۷ ہزار مسلمان، ۷ لاکھ ۳۰ ہزار عیسائی اور ۲۵ ہزار یہودی ہیں۔ اس مجموعی تعداد میں سے ایک لاکھ بارہ ہزار اجنبی ہیں جن کی تعداد لارڈ کرومر معتمد دولت انگریزی نے اپنی گزشتہ رپورٹ میں اس طرح بیان کی تھی: یونان، ۳۸ ہزار ایک سو چھتر۔ اٹلی، ۲۴ ہزار ۴ سو ۶۷۔ انگلستان ۱۹ ہزار ۵ سو ۵۷۔ فرانس، ۱۴ ہزار ایک سو ۵۵۔ آسٹریا، ۷ ہزار ایک سو ۲۳۔ روس، ۳ ہزار ایک سو ۹۳۔ جرمنی، ایک ہزار ۲ سو ۷۷۔ دیگر ممالک کے لوگ، ۴ ہزار ۵ سو ۵۵۔

شہر قاہرہ، دریائے نیل کے مشرقی کنارے پر سویز سے چھتر میل مغرب کو اور اسکندریہ سے ۱۱۲ میل جنوب مشرق کو واقع ہے۔ بنیادی پتھر کسی ایسی ساعتِ سعید میں رکھا گیا کہ ساڑھے نو سو برس گزرنے پر بھی اس کی عظمت و شوکت بدستور قایم ہے۔ سالِ گزشتہ کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی مع مضافات کوئی ۵ لاکھ ستر ہزار دریافت ہوئی ہے جس میں سے ۳۵ ہزار کے قریب ممالکِ غیر کے باشندے ہیں۔ قاہرہ کا کچھ حصہ میدان میں آباد ہے اور کچھ ایک پہاڑ کی سطح پر۔ سب سے پُر فضا مقام ازبکیہ ہے[2] جو پہلے ایک ویران جگہ تھی مگر اب وہاں ایک بہت خوبصورت باغ شہر کو رونق دے رہا ہے اس کے اندر تالاب اور باہر چاروں طرف سوداگروں کی بہت بارونق اور اعلیٰ درجہ کی دکانیں، ہوٹل، بنک، سرکاری دفاتر ہیں۔ شہر میں جس قدر عمدہ قہوہ خانے ہیں ازبکیہ ان کا ممتاز مقام مانا گیا ہے[3]۔ یورپین اور امریکن سیاحوں کے ٹھہرنے کے لئے اعلیٰ درجہ کے نفیس اور شاندار ہوٹل اسی موقع پر ہیں۔ سڑکوں پر گیس کی روشنی ہوتی ہے، آب رسانی کا انتظام نلکوں

---

[1] موجودہ آبادی ۲ ½ کروڑ سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ [2] [3] ازبکیہ اور خان خلیل کی اب بھی یہی پوزیشن ہے۔

کے ذریعہ سے ہے۔ شہر کے بڑے بڑے حصوں میں برقی ٹریموے جاری ہے۔ باوجود ان ترقیات کے شہر کی تنگ گلیوں اور غربا کے چھوٹے چھوٹے مکانوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی صلاحات کی گنجایش ہے۔

عماراتِ اندرونِ شہر میں ایک مشرقی بازار خان خلیل کے نام سے مشہور ہے۔[1] اس میں ہندستان، ایران، شام، استنبول اور اور ملکوں کے سوداگر اپنے اپنے ملکوں کی بے نظیر دستکاریاں اور ایشیا کے عجائباتِ قدیمہ کی تجارت کرتے ہیں۔ اس بازار کے اندرونی حصہ پر چھت پٹی ہوئی ہے، اس وجہ سے سورج کی تپش ان دوکانوں میں بھی داخل نہیں ہوتی۔

مضافاتِ قاہرہ میں، بولاق دریائے نیل کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ پیشتر یہ جزیرہ تھا مگر اب خشکی سے پیوند ہو کر نیل کا بندرگاہ بن گیا ہے۔ مصر العتیقہ (مصر قدیم) بھی نیل کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ خلفائے فاطمیین کی فتوحات سے پہلے اس کو فسطاط کہتے تھے۔ قبہ وہ مقام ہے جہاں خدیو معظم کے محلاتِ شاہی بنے ہوئے ہیں۔ یہ شہر سے کچھ فاصلہ پر ہے۔ عباسیہ کی آبادی فصیل شہر کے متصل اور دو میل لمبائی میں چلی گئی ہے۔ یہ دونوں آبادیاں آب و ہوا کی عمدگی کی وجہ سے مشہور ہیں۔

یہاں کی مسجدیں بہت قدیم اور عمدہ بنی ہوئی ہیں۔ اس وقت پرانی مسجدوں کی تعداد پانسو کے قریب ہے۔ مسجدوں میں امام، موذن اور خادم جس قدر ہیں، ان سب کو محکمۂ اوقاف سے تنخواہیں ملتی ہیں۔

قاہرہ میں اہلِ بیت اور بزرگانِ دین کے چند مزار ہیں، ان میں سب سے مقدس زیارت گاہ سید الشہدا امام حسین رضی اللہ عنہ کی ہے۔ مصر کے پہلے فاطمی خلیفہ کو جب ملک مصر اور شام پر تسلط ہوا تو وہ امام صاحب کا سرِ مبارک شام سے قاہرہ لے آیا اور اس جگہ بڑا عظیم الشان مقبرہ تعمیر کیا۔ منجملہ مزاراتِ مقدسہ کے حضرت سیدہ نفیسہ بنت زید بن علی بن امام حسین کی قبر ہے۔ مصر کے فاتح عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا مقبرہ بھی اسی جگہ ہے حضرت امام شافعی کے مقبرہ کا فخر اس سرزمین کو حاصل ہے جن کا مذہب تمام ملک مصر میں پھیلا ہوا ہے۔

---

[1] تکیوں کا یہ سسٹم اب بھی جاری ہے

جو مسافر بے سروسامان اس ملک میں آ جاتے ہیں ان کے قیام کے واسطے متعدد تکیے موجود ہیں۔ تکیہ کا لفظ غالباً مسافر خانہ کے مرادف ہے۔ جہاں مسافر بے کرایہ اور بغیر کسی قسم کے اعتبار کے رہ سکتا ہے۔ ہر ملک کے واسطے علیحدہ علیحدہ تکیہ موجود ہے اور ہر تکیہ میں اسی ملک کا ایک شخص منتظم تکیہ ہوتا ہے جس کو مصریوں کی اصطلاح میں شیخ التکیہ کہتے ہیں۔ مجھے صرف ہندی تکیہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت دس بارہ مسافر اس میں موجود ہیں، دو تین بنگالی اور پوربی بیس بیس برس سے پڑے ہوئے ہیں۔ شیخ التکیہ کو ہر سال ضروری مصارف محکمۂ اوقاف سے ملتے ہیں۔ پہلے دن ان مسافروں کو روٹی بطور مہمان مفت ملتی ہے۔ کچھ قہوہ کا خرچ روزانہ ملتا ہے مگر روٹی پھر نہیں ملتی۔[1]

عام (مصریوں) کے مزاجوں میں عموماً اور اہل حرفہ کی طبیعتوں میں خصوصاً طمع، دروغ گوئی اور خود غرضی از حد ہے۔ متوسطین کی طبع میں یوں تو ظاہر داری بہت ہے اور بات بات میں خوش کن الفاظ استعمال کرتے ہیں مگر کچھ سرد مہری اور بے مروتی کی بو ان میں پائی جاتی ہے۔ امراء اور تعلیم یافتہ لوگوں کے اخلاق بہت اچھے ہیں۔ خاص خوبی ان میں یہ ہے کہ قومی معاملات میں مدد کرتے ہیں چنانچہ مصنفین کی محنت کی داد دینے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے خیال سے ان کی تصانیف کی کچھ جلدیں خرید کر لوگوں میں مفت تقسیم کر دیتے ہیں۔ لائق اخبار نویسوں کی امداد ضروری سمجھتے ہیں۔

مصری کھانوں میں سب سے عمدہ اور لذیذ بھنا ہوا گوشت ہوتا ہے۔ پلاؤ نیم پخت اور صرف مصریوں کے مذاق کے موافق۔ روٹی تنور کی خمیری عموماً دو تین دن کی باسی جو اس ملک کی آب و ہوا کے لحاظ سے زود ہضم سمجھی جا سکتی ہے سرکہ کے اچار کا اس ملک میں بہت رواج ہے۔

مصری عورتیں پردہ کرتی ہیں مگر کاروبار کے انصرام کے واسطے گھر کے باہر آتی، جاتی ہیں، سودا سلف کے واسطے بازاروں میں پھرتی ہیں، دوکانوں کے اندر کرسیوں پر بیٹھ کر چیزیں پسند کرتی ہیں۔[2]

منگنی اور بیاہ کے جو طریقے اس ملک میں مروج ہیں ان میں اور ہندوستانی رسم و رواج میں بہت کچھ

---

[1] تکیوں کا یہ سسٹم اب بھی جاری ہے [2] مصری عورتیں پردہ کرتی ہیں مگر . . . . . ، اب یہ لکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی۔

تفاوت ہے۔ منگنی کے ابتدائی مراتب کو لڑکے کی ماں خود طے کرتی ہے اور چند قریبی رشتہ دار عورتوں کو ہمراہ لے کر لڑکی کے گھر جاتی ہے۔ گفتگو کے بعد اگر فریقین باہم متفق ہو جائیں تو جو عورتیں باہر سے آئی تھیں خوشی کے نغمے گاتی ہوئی نکلتی ہیں جن کو 'زغروط' کہتے ہیں۔ اس زغروط سے محلہ والوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ شادی قرار پاگئی۔ اور اگر لڑکی کی ماں کو شادی کرنے میں عذر ہوتا ہے تو وہ کہہ دیتی ہے کہ مردوں سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دیا جائے گا اور اس حالت میں یہ عورتیں جیسے چپ چاپ آئی تھیں ویسے ہی خاموش واپس چلی جاتی ہیں۔ منگنی کی بات چیت جب عورتوں میں ہو جاتے تو پھر یہ سوال مردوں کے روبرو صرف پختگی کی غرض سے پیش ہوتا ہے۔ اس وقت سب سے اہم معاملہ تعینِ مہر کا ہوتا ہے۔ مہر جو کچھ قرار پائے اس کا نصف لڑکی کے باپ کے حوالے ضرور کر دینا پڑتا ہے، اور یہ رقم اس قدر ہوتی ہے کہ جس کا نصف آسانی سے پیشگی ادا ہو سکے۔

شادی کے دن دولھا اپنے والدین اور رشتہ داروں اور دوستوں کے ہمراہ شام کے وقت دلھن کے گھر جاتا ہے آگے آگے باجا ہوتا ہے، پیچھے چند نوجوان براتیوں کے ہاتھ میں ایک ایک کاغذی فانوس موم بتی سے روشن، جو برات کے واسطے روشنی کا کام دیتا ہے۔ براتی اور دولھا شب کا کھانا کھا کر اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ دوسرے دن دلھن کے والدین عروس کو بگھی میں سوار کر کے دولھا کے گھر بھیج دیتے ہیں اور جہیز کا سامان بھی ساتھ کر دیتے ہیں۔

یہاں کی عورتیں محب الوطن ہوتی ہیں، غیر ملک میں جانا پسند نہیں کرتیں۔ طلاق کی رسم مصریوں میں کچھ معیوب نہیں سمجھی جاتی، اور نہ کسی مرد کو طلاق شدہ عورت سے نکاح کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ بہت تھوڑے اشخاص ہوں گے جن کو ایک ہی عورت سے زندگی بسر کرنے کا موقعہ ملا ہو، اور کثرت سے ایسی عورتیں ہوں گی جنھیں ایک سے زیادہ مرتبہ نکاح کا اتفاق ہوا ہو۔ البتہ امراء و معززین میں طلاق دینے کا دستور کم ہے۔

مصریوں کو زندگی بسر کرنے اور دوستوں سے میل ملاقات کے واسطے قہوہ خانہ سب سے عمدہ جگہ ہے۔ ایک دوست کی موجودگی میں جتنے احباب آئیں ان سب کے مصارف وہی ادا کرتا ہے جو پہلے

سے قہوہ خانہ میں بیٹھا ہوتا ہے۔ دوستوں کی ملاقات اور باہمی تبادلۂ خیالات کے لئے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ ان قہوہ خانوں میں صبح سے شام تک چہل پہل رہتی ہے۔ کچھ مدت پیشتر شرفا قہوہ خانوں میں جانا معیوب سمجھتے تھے، مگر اب یہاں کی نشست زندگی کی روزانہ ضروریات میں داخل ہوگئی ہے۔

مصر میں گدھے بڑے قیمتی ہوتے ہیں اور پانچ پانچ سو روپے کو بکتے ہیں ان پر نہایت پُرتکلف زین کسے جاتے ہیں اور ہر چوک میں صبح سے دس بجے رات تک موجود رہتے ہیں۔ جب کوئی شخص گدھے پر سوار ہوتا ہے، تو گدھے والا ایک چابک گدھے کی پیٹھ پر لگاتا ہے اور گدھا دوڑنے لگتا ہے گدھے والا بھی ساتھ ساتھ دوڑتا جاتا ہے۔ یہ سواری مصر میں اس قدر مروج ہے کہ سوداگر اور شرفا گدھے پر چڑھنا کچھ معیوب نہیں سمجھتے، بلکہ عورتیں بھی بے تکلف سوار ہوتی ہیں۔ قاہرہ کے اکثر اہلِ علم اور مشائخ کے ہاں سواری کے واسطے گدھے موجود رہتے ہیں۔ میں نے دو تین شخصوں سے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بیان کیا کہ گھوڑے کے واسطے دانہ گھاس اور ایک آدمی ملنے دلنے کو درکار ہے جس کے مصارف کی میزان ساٹھ روپے ماہوار سے کم نہیں ہوتی۔ لیکن گدھے کے واسطے سائیس کی کچھ ضرورت نہیں، تھوڑے سے جو اور تھوڑی سی گھاس اس کی گزران کے واسطے کافی ہے۔

قاہرہ میں علوم قدیمہ اور جدیدہ کی تعلیم ہندوستان کی طرح اب تک علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے۔ ازہر میں اس وقت دس ہزار طالب علم اور تین سو مدرس موجود ہیں، مدرس اول جو شیخ الازہر کہلاتے ہیں، پرنسپل کا درجہ رکھتے ہیں، ان کا مشاہرہ اس وقت ۱۲۰ پونڈ یا ایک ہزار آٹھ سو روپے ماہوار ہے۔ اس وقت اس جگہ پر شیخ حسونہ مقرر ہیں۔

ہندوستانی طلبا کے واسطے جامع ازہر میں فقط دو کمرے ہیں، ایک میں شیخ الرواق (رواق ٹون) رہتا ہے اور دوسرے میں طلبا۔ اس وقت تین ہندستانی طالب علم رواق ہندی میں رہتے ہیں۔[۵۲]

سرکاری ملازمت میں اگرچہ (جدید) مدارس کے پاس شدوں کو ترجیح دی جاتی ہے اور ہندستان کی طرح یہاں بھی لوگ روزگار کی خاطر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ لیکن عموماً باشندگانِ مصر کا میلانِ طبع

قدیم تعلیم کی جانب اب تک بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ مدارس ابتدائی (کے) کل امیدواروں کی تعداد (۹۸-۱۸۹۷ء) ۱۳۸۱ تھی جن میں ۲۷۰۴ پاس ہوئے۔ مصر میں اب تک اعلیٰ تعلیم کے واسطے کوئی کالج قایم نہیں ہوا۔

مصریوں نے علمی امور میں جہاں اور ترقیاں کی ہیں وہاں فن اخبار نویسی کو بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیا ہے عامۂ خلائق میں اخبار بینی کا مذاق اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ معمولی قابلیت کے لوگ بھی اخبار کا مطالعہ ضروری سمجھتے ہیں۔ قریباً سب دوکاندار اخبار خریدتے ہیں امراء کی قدردانی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ کسی گھر میں جتنے زیادہ آدمی لکھے پڑھے ہوں اتنے ہی زیادہ پرچے وہاں آتے ہیں اس وقت خاص قاہرہ میں پچاس کے قریب پرچے نکلتے ہیں[1] مگر میں ذیل میں صرف ان اخباروں اور رسالوں کا ذکر کروں گا جن کے مطالعہ کا مجھے موقعہ ملا اور جن کے اڈیٹروں سے ملاقات کا اتفاق ہوتا رہا۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) **المؤید**: یہ اخبار مصری روزانہ اخباروں میں سب سے بڑا، شاندار، باوقعت اور آزاد نگار مانا گیا ہے اور شیخ علی یوسف صاحب کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے اس میں ملک مصر اور مسلمانوں کی ضروریات پر نہایت پر زور اور مدبرانہ آرٹیکل لکھے جاتے ہیں۔ اور یہ جملہ مضامین تو اکثر شیخ موصوف کے قلم سے نکلے ہوتے ہیں لیکن فرانسیسی اخباروں کے ترجمہ کے واسطے مسعود آفندی اور انگریزی اخباروں کے ترجمہ کے واسطے حافظ آفندی ان کے دولائق مددگار ہیں۔ یہ حافظ آفندی ہی کی توجہ و قابلیت کا نتیجہ ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان کے قومی و مذہبی کوائف اور مختلف جلسوں کے حالات مصریوں کے مطالعہ میں آتے رہتے ہیں۔ یوں تو قدرت نے شیخ علی یوسف کے دماغ کو اخبار نویسی کے ساتھ پہلے ہی سے ایک خاص مناسبت رکھی تھی مگر شام، استنبول، فرانس و لندن کے سفروں سے ان کے خیالات میں بہت کچھ وسعت و روشنی پیدا ہو گئی ہے، اگر یہ شخص یورپ کی کسی زبان میں ید طولیٰ رکھتا تو ضرور اسے مشرقی دنیا میں یورپ کے مشہور اخبار نویسوں کے مساوی درجہ ملتا اس اخبار کی آزادی رفتار سے ایک زمانہ میں سلطان المعظم کسی قدر کبیدہ خاطر ہو گئے تھے اور بلاد ترکی میں اس کا داخل ہونا بند کر دیا تھا۔ مگر آخر کار اس کی صداقت اور استیاز

[1] ۱۸۹۸ء میں ہرٹمین نے مصری صحافت پر ایک مبسوط کتاب لکھی اس میں اخباروں اور رسالوں کی تعداد دو سو کے لگ بھگ

اور وقعت و احترام کو دیکھ کر پھر داخلہ کی اجازت دے دی اور شیخ کو سلطانی تمغہ بھی عطا کیا۔ اس اخبار کی روزانہ اشاعت آٹھ ہزار ہے اور سالانہ قیمت دو پونڈ یا تیس روپے ہے۔[1]

(۲) **اللواء**: اس کے مالک اور ایڈیٹر مصطفےٰ بک کامل ہیں جو کچھ عرصہ پیشتر مصریوں کے حقوق کی تائید کے واسطے ہر سال موسم گرما میں وائنا، برلن اور پیرس جاتے رہتے تھے اور فرانسیسی زبان میں دھواندھار لکچر دیا کرتے تھے۔ جنوری ۱۹۰۰ء سے انھوں نے اپنا روزانہ پرچہ اللواء کے نام سے جاری کر دیا۔ اس کی سالانہ قیمت دو پونڈ یا تیس روپے ہے۔[2]

(۳) **المقطّم**: اس اخبار کے ایڈیٹر اور مالک دو شخص یعقوب آفندی اور ڈاکٹر صروف ہیں جو شام کے رہنے والے ہیں اور قدمائے نصاریٰ کی نسل سے ہیں۔ عربی ان کی مادری زبان ہے انگریزی اور فرانسیسی بیروت کے مدرسۂ کلیہ (کالج) سے حاصل کی ہیں۔ اخبار نویسی میں ان کی قابلیت مسلّم ہے مگر المقطّم کی پالیسی انگریزی قبضہ کی تائید کے لحاظ سے اہل مصر کے نزدیک عموماً مسلمانوں کے خلاف اور خصوصاً مصریوں کے ملکی حقوق سے متجاوز ہوتی ہے۔ اس وجہ سے مصری مسلمان اس اخبار سے متنفر ہیں۔ اس کی قیمت قریباً ۱½ پونڈ یا ساڑھے بائیس روپے ہے۔[3]

---

[1] ''المؤید'' جو ۱۸۸۹ء میں جاری ہوا، اس وقت کا چوٹی کا روزنامہ تھا۔ جس کے گرد آہستہ آہستہ ایک سیاسی گروپ بن گیا جو ۱۹۰۷ء میں منظم سیاسی پارٹی کی شکل اختیار کر گیا، ''حزب الاصلاح علی المبادی الدستوریہ'' اس کا نام تھا۔ ۱۹۱۳ء میں علی یوسف کا انتقال ہو گیا (علی یوسف اور 'المؤید' کے بارے میں 'المنار' اکتوبر، نومبر ۱۹۱۳ء؛ — الصحافۃ والادب فی مصر ہرٹ مین ''مصر کی عربی صحافت'' ص ۹۱-۱۸۹ ج I: ''آج کا مصر'') [2] مصطفےٰ کامل کا اللواء شروع ہونے کے بعد سارے ایجیٹیشن کا مرکز 'اللواء' اور کامل بن گئے۔ اللواء بیسویں صدی کے ابتدائی چند سالوں کی پوری قومی تحریک کا نشان تھا۔ دس سال بعد جب یہ ختم ہوا تو قوم پرستوں نے ایک دوسرا اخبار 'العلم' نکال ڈالا اور پھر 'الشعب'، ۱۹۰۷ء میں اللواء کے گرد جو گروپ جمع ہو گیا تھا وہ مصطفےٰ کامل کی قیادت میں منظم ہو گیا۔ اس سیاسی پارٹی کا نام 'الحزب الوطنی' قرار پایا اور اللواء اس سرکاری پارٹی کا ترجمان۔

اللواء اور کامل کے بارے میں مزید تفصیلات ہرٹ مین۔ 'مصر کی عربی صحافت'۔ ''عبدالرحمٰن الرافعی: مصطفےٰ کامل'': حاجی عبداللہ براؤن: ''بوناپارٹ مصر میں'' — اور موجودہ مصری: ''عبداللطیف حمزہ: الصحافۃ والادب فی مصر'، I: ''آج کا مصر'')

علمی رسالوں میں سب سے زیادہ مشہور المنار[1]، الہلال، المقتطف ہیں۔

مصر میں مفسد اور دریدہ دہن اخبار نویسوں کی موجودگی مندرجہ بالا اخباروں کی عظمت بڑھاتی ہے۔ چنانچہ مصر کی ایک مفسد پارٹی نے ایک اخبار صرف اسی غرض سے جاری کر رکھا ہے کہ اس میں سلطان المعظم اور خدیو مصر کے برخلاف مضمون شائع کئے جائیں۔ عدالت کی جواب دہی کے واسطے ایک نوجوان احمد فواد کو پھانس رکھا ہے جو اس کا اڈیٹر کہلاتا ہے۔

اس وقت مصر کے حکمراں خدیو عباس حلمی پاشا ہیں جو توفیق پاشا مرحوم کے خلف الرشید اور خاندانِ محمد علی کے ساتویں فرمانروا ہیں۔ یہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ۱۸۹۲ء میں تخت نشین ہوئے[2]۔ آپ وقتاً فوقتاً ملک میں دورہ بھی کرتے ہیں جو رعایا کے اصلی حالات سے آگاہی حاصل کرنے کا اچھا ذریعہ ہے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ جمعہ کی نماز مع حشم وخدم باری باری سے مختلف مسجدوں میں ادا کرتے ہیں۔ چوں کہ اس کا اعلان کئی روز پہلے ہو جاتا ہے اس لئے لوگ جوشِ عقیدت وانقیاد سے اسی مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں۔ آپ کے مصارف کے واسطے ایک لاکھ پونڈ سالانہ یا سوا لاکھ روپے ماہوار ہے جس کے مصارف زیادہ تر خیرات وفائدہ رسانی خلائق پر مبنی ہوتے ہیں۔ خورونوش، لباس ودیگر اسبابِ راحت کے بارہ میں آپ سادگی پسند ہیں اور تکلفات وآرائش سے بالطبع متنفر۔ اکثر سادے کپڑے زیبِ تن فرماتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۶ المقطم کھلم کھلا مصر میں انگریزی قبضہ کا حامی تھا، ایڈیٹر شامی عیسائی تھے جو پہلے بیروت سے المقتطف نکالتے تھے۔ جب لبنان کی سرزمین ان پر تنگ ہوگئی تو مصر چلے آئے اور المقطم، اور المقتطف، یہاں سے شروع کئے۔ المقطم، المؤید سے چند ماہ پیشتر ۱۸۸۹ء ہی میں نکلنا شروع ہوا اور ۲۰، ۲۵ سال تک قوم پرستوں کے بدترین مخالفوں کا ساتھ دیتا رہا۔ آج کا مصر" د حمزہ : "الصحافۃ والادب"

[1] المنار، عبدہ کے لائق شاگرد رشید رضا ۱۸۹۹ء سے ماہانہ نکالتے تھے، الہلال، جرجی زیدان کا مشہور اخبار نما رسالہ ہے اور المقتطف انھیں نمر اور صروف کا علمی رسالہ۔

[2] مصر کے اس حکمراں سلسلہ کا آغاز، جس کا خاتمہ شاہ فاروق پر ہوا محمد علی سے ہوتا ہے جو نپولین کے حملۂ مصر کے زمانے میں عثمانی فوج کے البانوی سپہ سالار کی حیثیت سے فرانسیسی فوجوں سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا اور آخر میں حالات، ساز گار دیکھ کر یہیں رہ پڑا ۱۸۰۵ء میں وہ مصر کا عثمانی گورنر ہو گیا۔ ۱۸۴۹ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد عباس اول، سعید، اسمٰعیل اور توفیق ایک دوسرے کے جانشین ہوتے رہے۔ توفیق کے عہد میں برطانیہ نے مصر پر قبضہ کیا۔ ۱۸۹۲ء میں توفیق کے انتقال پر عباس علمی ۱۷، ۱۸ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔

کارکنانِ سلطنت کی یہ رائے ہے کہ ہر بالغ نوجوان کا اصلی فرض اپنے ملک کی حفاظت ہے۔ جو لڑکا بیس برس کی عمر کو پہنچ جائے اور تندرست صحیح المزاج ہو اسے فوج میں بھرتی کر لیتے ہیں۔ جس شخص کو فوجی خدمت ناپسند ہو وہ بیس پونڈ یا تین سو روپے معاوضہ دے کر بری ہو جاتا ہے۔ بعض مذہبی پیشواؤں کی اولاد اعزازی طور پر اس خدمت سے مُستثنیٰ کی گئی ہے۔ جو لڑکا تعلیم میں مشغول ہو وہ ہیڈ ماسٹر کی تصدیق پر ایک زمانہ معین تک مستثنیٰ سمجھا جاتا ہے اور جس نے کسی دینی یا دنیاوی صیغہ کا اعلیٰ امتحان پاس کر لیا ہو وہ مدت العمر کے لئے الگ کر دیا جاتا ہے۔ بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ جامع ازہر میں جو طلبا، کی اتنی کثرت نظر آتی ہے اس کی وجہ کسی قدر فوجی خدمت کی سختی سے بھی علاقہ رکھتی ہے۔

فوجی خدمت سے مصر والے جو بے اعتنائی برتتے ہیں وہ ان واقعات سے بخوبی ظاہر ہو سکتی ہے کہ بعض لڑکے انتخاب کے زمانہ میں طرح طرح کی دوائیں استعمال کرتے ہیں جو انھیں کمزور وناتواں بنا دیں۔ بعض لڑکے اپنے ہاتھ پاؤں زخمی کر لیتے ہیں تاکہ ڈاکٹر انھیں فوجی خدمات کے ناقابل قرار دے[1]

جس قدر لڑکے فوجی خدمت کے لئے منتخب ہوتے ہیں ان میں سے ہر شخص کو ایک مقررہ تنخواہ ملتی رہتی ہے۔ چار برس کے بعد ان کو اختیار دیا جاتا ہے کہ خواہ فوجی ملازمت جاری رکھیں یا خواہ اپنے گھر واپس جا کر کسی اور کام میں مصروف ہو جائیں۔

اس وقت مصری فوج میں ۷۶ انگریز افسر ہیں، اور سپاہیوں کی تعداد ۱۵۱۵۳ ہے علاوہ ازیں تین ہزار آدمیوں کی ایک خالص فوج اور، مصر میں قایم کی گئی ہے جس کے تمام مصارف مصری گورنمنٹ کے ذمہ ہیں۔ اس کو جیش احتلال، یعنی فوجِ قابض کہتے ہیں۔ یہ فوج گویا انگریزی

---

[1] یہ عجیب بات ہے کہ آدھی صدی پہلے، عہد محمد علی میں بھی بالکل یہی حالات ملتے ہیں۔ محمد علی کو اپنی سلطنت وسیع تر کرنے کے لئے ہر روز نئی فوج کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس عہد کے سیاحوں کا بیان ہے کہ فوجی ملازمت سے بچنے کے لئے غریب مصری اپنی انگلیاں کاٹ لیتے تھے، اور بعض بعض تو لنگڑے لولے تک ہو جاتے تھے۔ مائیں اپنے بچوں کو اندھا کر دیتی تھیں یا ہاتھ پیر کاٹ دیتی تھیں۔ لوگ مردم شماری کرنے والوں کو رشوت دے دے کر اپنے نام مردم شماری سے ختم کرا دیتے تھے (جیمس آگسٹس سینٹ جان ص ۳۲۰-۲۱۔ میلی سفرنامہ ۲ ص ۶۳-۶۴

قبضۂ مصر کی تائید کے لیے متعین اور صرف انگریزی فوائد کی محافظ ہے۔

انگریزی نگرانی کہنے کو تو صرف مالی نگرانی ہے، مگر عملی طور پر ہر محکمہ کے انتظام میں انگریز دخیل ہیں۔ ہر تجویز میں یہ شریک ہوتے ہیں، ہر کارروائی کی نگرانی کرتے ہیں، فوجی معاملات ان کے زیر اثر ہیں، خزانۂ شاہی پر ان کا اقتدار ہے[1]

مصریوں کے انگریزی قبضہ کی نسبت خواہ کیسے ہی خیالات ہوں، لیکن انگریزوں کے آنے سے ملک کی حالت میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اس کا اثر ایک سیاح کی طبیعت پر اس اعتبار سے بہت مسرت انگیز پڑتا ہے کہ انتظام کے ہر صیغہ اور ہر حصہ میں ترقی دکھائی دیتی ہے۔ اس حسنِ انتظام کا بڑا حصہ لارڈ کرومر برٹش ایجنٹ کی اعلیٰ لیاقت کا ممنون ہے۔[2] ان کا اس وقت مصر میں وہ رعب و اثر ہے کہ کبھی کسی غیر کو نصیب نہیں ہوا[3]

اس وقت مصر میں بیس قنصل موجود ہیں۔ اعلیٰ حضرت سلطان المعظم کی طرف سے بھی ایک معتمد ہمیشہ مصر میں مقیم رہتا ہے۔ بالفعل اس منصب جلیل پر غازی احمد مختار پاشا مقرر ہیں[4] اور بڑی شان و تمکنت سے ترکی اثر و اقتدار کو تھامے ہوئے ہیں۔

---

[1] ۱۸۸۲ء میں اعرابی پاشا کی قیادت میں مصریوں نے آزادی کے لیے جنگ لڑی اور ہار گئے، برطانوی قبضہ مکمل ہو گیا اس کے باوجود برطانیا کھلے طور پر اس کا اعلان نہ کر سکا۔ برائے نام حاکمیت عثمانی خلیفہ ہی کی چلتی رہی جس کا قانونی نمائندہ خدیو مصر تھا۔ لیکن انتظامی امور میں سارا عمل دخل انگریزوں کا تھا۔ سارے اہم کلیدی عہدے انگریزوں کے سپرد تھے۔ ہر مصری وزیر کی نگرانی کے لئے ایک انگریز مشیر تھا اور اوپر چل کر خدیو کے لئے خود برطانوی ایجنٹ مشیر خاص کی حیثیت رکھتا تھا انگریز بظاہر بالکل الگ تھے لیکن وہ حکومت کرنے والوں پر براہ راست حکومت کرتے تھے۔ توجیہ سیدھی سادی تھی اس طرح وہ مصریوں کو ٹریننگ دے رہے تھے۔ (کرومر: مصر جدید حصہ دوم" : کالون ص ۹۴۔ ۵۰: سٹانی لو ص ۲۰۰۔ ۲۰۱" : کوہن ص ۱۸۶) [2] لارڈ کرومر ۱۸۸۳ء سے ۱۹۰۷ء تک برطانوی ایجنٹ کے فرائض انجام دیتے رہے رعب و دبدبہ کا واقعی یہ عالم تھا کہ عام مصری کرومر ہی کو مصر کا بادشاہ کہا کرتے تھے۔ [3] مختار پاشا مصر کی تاریخ میں اس وقت نمودار ہوئے جب حکومت عثمانیہ اور برطانیا کے درمیان مصر سے برطانوی فوجوں کے انخلاء کی بات چیت چلی اور ایک مرحلہ میں آکر کافی امید ہو گئی کہ معاملات طے ہو گئے، یہ ۱۸۸۵ء اور ۱۸۸۸ء کے درمیانی عرصہ کی بات ہے۔ مختار پاشا عثمانی نمائندہ تھے۔ آخر میں ملکہ انگلستان نے تو معاہدہ پر دستخط کر دئے سلطان عبدالحمید کچھ دوسری طاقتوں کے بہکائے میں آگئے اور بات ختم ہو گئی۔ لیکن ختم ہو کر بھی مختار پاشا کو اپنی یادگار چھوڑ گئی جو اسی زمانہ سے مصر میں ترکی کے ہائی کمشنر کی حیثیت سے قیام پذیر رہے۔" (ڈانسی: خدیویت کی کہانی)

مغربی علوم و فنون پر اسلام کا اثر

از

مولوی فضیل الرحمٰن عثمانی (فاضل دیوبند)

ضروری تو نہیں ہے کہ جو قوم سیاسی اعتبار سے غلام ہو اس کو ذہنی و فکری لحاظ سے بھی غلام کہا جائے لیکن عموماً ہوتا یہی ہے کہ کسی قوم کی مادّی مغلوبیت اس کے ذہنی و فکری انحطاط کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

مسلمان آج کل کچھ اسی قسم کے حالات سے دوچار ہیں اگر کہیں سیاسی و مادّی اعتبار سے آزاد بھی ہیں تو ذہنی اعتبار سے وہی غلامی ان کے ہر گوشۂ حیات میں کارفرما نظر آتی ہے وہ مغرب کی متعین کردہ راہوں پر چلتے، مغرب کے دماغ سے سوچتے اور مغرب ہی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اپنی تہذیب، ثقافت، ترقیات کو بھول کر مغرب ہی کو اصل معیارِ زندگی مان بیٹھے ہیں، اسلامی علم و عمل اور قرآنی معیار کو چھوڑ کر مغرب کی تقلید کر رہے ہیں اور غیر شعوری طور پر یہ مفروضہ دل میں جاگزیں ہو چکا ہے کہ جو مغرب کہتا ہے وہی حق اور وہی صحت و درستگی کا اصل معیار ہے لیکن اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ مغرب کی یہ قابلِ رشک ترقی خود مسلمانوں ہی کی مرہونِ منت ہے، یہ موجودہ روشنی اسی چراغ کی ہے جو کبھی خود مسلمانوں نے روشن کیا تھا۔

آسمانِ یورپ آفتابِ اسلام کے طلوع ہونے سے پہلے جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور گویا منتظر تھا کہ اسلام کا درخشاں آفتاب اُفقِ مشرق سے طلوع ہو اور تمام ظلمت و تاریکی کو نور سے بدل دے، وہاں کی پیاسی زمین اس بات کی محتاج تھی کہ اسلام کا ابرِ کرم اُٹھے اور اپنے فیض و عطا کی بارش برسائے۔ اہلِ یورپ نے جہاں عربوں کے پاکیزہ تمدن سے بہت کچھ حاصل کیا وہیں انھوں نے ان کے بے پایاں علم و فن سے بھی خوشہ چینی کی اور ان کی موجودہ ترقی کی بنیادیں عربوں ہی کے علوم و فنون پر استوار ہیں چنانچہ ایک مغربی مصنف "گسٹاؤ ڈیوکونڈری" اپنی کتاب "تاریخ تمدن" میں لکھتے ہیں

"صدیوں تک عربوں نے تمدن کی تاریخ میں اہم بالشان خدمات انجام دیں وہ نہ صرف ایشیا کے دور دراز ملکوں میں علم کی اشاعت کرتے رہے بلکہ یورپ کو بھی ایسے علوم سکھائے جن سے مغربی اقوام نے بڑا نفع حاصل کیا۔

اسی سلسلہ میں "مسٹر اسٹینلی لین پول" Stanley Lan pole - کی رائے بھی پیش کرتا ہوں ـــــــــــ

"مختلف علوم و فنون میں جیسی ترقی اسپین کے مسلمانوں نے کی تھی کسی دوسرے ملک یا قوم نے نہیں کی۔ انگلینڈ، فرانس اور جرمنی سے طلبا اس چشمہ سے سیراب ہونے کے لئے آتے تھے جو صرف اسپین کے شہروں میں بہتا تھا۔ اندلس کے طبیب اور جراح تمام دنیا سے آگے تھے۔ علم ریاضی، ہیئت، نباتات، فلسفہ اور فقہ کی تکمیل صرف اسپین میں ہو سکتی تھی۔ زراعت۔ آب پاشی۔ قلعہ بندی۔ جہاز سازی وغیرہ میں بھی وہاں کے مسلمان اعلیٰ درجہ پر تھے۔

کیا تاریخ بھول سکتی ہے؟ کہ گھڑی سب سے پہلے "فرنکس" کے شہنشاہ "شارلین" کو ایک مسلمان بادشاہ کی طرف سے ہدیہ بھیجی گئی تھی اس سے ظاہر ہے کہ گھڑی کی ایجاد مسلمانوں سے ہوئی۔ لیکن دسویں صدی میں حالات نے کروٹ لی اور ایک نیا انقلاب رونما ہوا "پاپائے روم" کی ترغیب پر یورپ بیت المقدس کو فتح کرنے کے لئے جنگ میں مصروف ہو گیا اس جنگ کے دوران اہل یورپ نے عربوں کے اخلاق اور تمدن کا بغور اور قریب سے مطالعہ کیا اور پہلی بار انھیں مختلف شعبہ ہائے حیات میں عربوں کی برتری کا اندازہ ہوا چنانچہ یہیں سے یورپ کے علمی و فکری انقلاب کا آغاز ہوتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں یورپ نہ صرف علمی و ذہنی حیثیت سے تہی دامن تھا بلکہ مذہبی لحاظ سے بھی پوری طرح دیوالیہ ہو چکا تھا، مذہبی رہنماؤں کے ہاتھوں دین عیسوی کی صالح قدریں مسخ ہو چکی تھیں ـــــــــــ

"پاپائے روم" غیر محدود اختیارات کا مالک ہوا کرتا تھا اُس نے ان اختیارات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کثیر رقم کے عوض "معافی نامہ" کی تقسیم کا طریقہ رائج کیا ـــــ معافی نامہ دوزخ سے نجات اور جنت میں داخلہ کا ایک پروانہ یا سرٹیفکٹ تھا۔ لیکن اہل یورپ نے جب "اسلامی تعلیمات" اور

"قرآن مجید" کی خوبیوں کا مطالعہ کیا تو وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، پاپائے روم کے جابرانہ اختیارات ان کے لئے باعث نفرت بن گئے آخر کار کافی جدو جہد کے بعد یہ لوگ ایک "آزاد مذہبی فرقہ" قایم کرنے میں کامیاب ہو گئے جہاں تک میرے علم میں ہے سب سے پہلے اس مذہبی انقلاب کا تصور "لوتھر" Luther (پروٹسٹنٹ Protestant فرقہ کا بانی) اور "کالون" (جنیوا کا مشہور خطیب کالونزم کا بانی) کے ذہن میں پیدا ہوا۔ "لوتھر" نے اطالوی درسگاہوں میں جہاں عربی فلسفہ کا درس دیا جایا کرتا تھا تعلیم پائی تھی اور اسے قرطبہ و غرناطہ کے علمی حلقوں سے بھی استفادہ کی نوبت آئی جو اس زمانہ میں عربی فلسفہ کی تعلیم کے مرکز تھے بہر حال لوتھر اور کالون کا یہ ذہنی انقلاب اسلامی تعلیمات ہی کا مرہونِ منت تھا۔

علوم و فنون عربوں کے تمدن سے اہلِ یورپ کے مذہبی تصورات ہی میں ایک خوش گوار انقلاب نہیں پیدا ہوا بلکہ ان کے تعلیمی اور فنی ڈھانچے میں بھی ایک قابلِ فخر تبدیلی رونما ہوئی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب روم و یونان کی شاندار ترقی معدوم ہو چکی تھی ان کی علمی تصنیفات اور فنی کاوشیں افسانہ بن چکی تھیں تو دوبارہ عربوں ہی نے انھیں حیاتِ نو بخشی۔ کنگس کالج لندن کے عربی کے پروفیسر مسٹر "ایچ۔ اے۔ سلیمن۔ سی آئی ایم" "سلطنت عرب کا عروج و زوال" میں لکھتے ہیں ——————

"اس مادہ میں نئی روح پھونکنے کا فخر صرف عربوں کو حاصل ہے یہ عرب ہی تھے جنہوں نے گم شدہ یونانی مصنفین کو دنیا سے روشناس کرایا اہلِ عرب نے علم کی وہ شمع روشن کی جس نے تاریخ کے سیاہ صفحات کو چمکا دیا اور یقیناً اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تاریخ اتنی شاندار نہ ہوتی۔

مشاہدہ ہے کہ قوموں کی علمی ترقی کی ابتدا تصنیفات کے بجائے عموماً تراجم و تالیفات سے ہوتی ہے عربوں نے اس میں بھی گہری دلچسپی لی اور ترجموں کی بدولت سنسکرت اور یونانی مصنفین کو زندہ جاوید بنا دیا "پیکتھال" لکھتا ہے ——————

"خلیفہ المامون کے دور میں روم و یونان کے تاریخی تراجم زیادہ تر ہوئے جن کی اصل قسطنطنیہ سے قبضہ کر کے بغداد لائی گئی ہے"

الجبرا | چنانچہ جہاں انھوں نے "یونانی فلسفہ" کو ترقی دی وہاں الجبرے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے مغربی مصنفین نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ـــــ

"الخوارزمی کی تصنیفات نے اہلِ یورپ کے لئے الجبرے کے نکات حل کرنے میں رہبر کا کام دیا ہے۔

(انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۶ صفحہ ۵۹۶)

پکھتال لکھتا ہے "الجبرا مسلمانوں کی ایجاد ہے" ـــــ موجودہ علم کیمیا "ابو موسیٰ جعفر کوفی" کی وسیع تحقیقات کا نتیجہ ہے۔

ھیئت | علم الجبرا، ریاضی، اور کیمیا کی طرح علم ہیئت بھی عربوں کا زیرِ بارِ احسان ہے اس سلسلہ بن احمد بن محمد ـــــ حسن ابن حسین اور محمد بن وسنی کے نام خاص طور پر لیے جاتے ہیں علم ہیئت عرب اپنے ساتھ اسپین میں لائے اور ۱۰۸۰ء میں "ابو اسحاق زرقانی" نے اس میں کچھ جدول و اشکال اختراع کیں۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۲ ص ۸۱۱ مطبوعہ ۱۹۱۱ء)

خورد بین کا موجد عموماً "گلیلیو" کو سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا موجد ابو الحسن تھا۔

کلام | یورپ میں یہ ایک عام خیال ہے کہ علمِ کلام کا موجد لارڈ بیکن (Lord Bacon) ہے چنانچہ "ہسٹری آف دی انگلش" میں ٹامسن (Thompson) نے بھی لارڈ بیکن ہی کو علم کلام کا موجد قرار دیا ہے امرِ واقعہ یہ ہے کہ علمِ کلام کی بنیاد امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ڈالی ہے اور یہ بات یقین کی حد تک اس لئے کہی جا سکتی ہے کہ امام غزالیؒ کی وفات کا زمانہ بیکن کی پیدائش سے تقریباً سو برس پہلے ہے بہت ممکن ہے کہ لارڈ بیکن نے اولاً اس علم کو امام غزالیؒ سے لیا ہو اور بعد میں ہی کو موجد سمجھ لیا گیا ہو چوں کہ بیکن اسپینی زبان جانتا تھا اور امام غزالی کی تصنیفات اس وقت تک اسپینی میں منتقل ہو چکی تھیں۔

تاریخ | ابتداءً تاریخ صرف واقعات کی افسانوی نوعیت کا نام تھا اس کے اسباب و علل موضوعِ بحث نہ تھے عرصہ تک "تاریخ" اس صورت میں باقی رہی عربوں نے اس کو ایک فن کی حیثیت دی اور واقعات کے اسباب و علل سے بحث کرنے لگے "المقری" کی تصانیف میں فنِ تاریخ کے

نقوش نظر آتے ہیں عرب مؤرخین کی یہی کوششیں اہلِ یورپ کے لئے چراغِ راہ بنیں ـــــ علمِ سیاست
کی بنیاد عرب مؤرخین کے ان ہی خیالات پر رکھی گئی ہے ۔ دنیا کا مشہور ترین مؤرخ ابنِ خلدون اس کا
امام ہے جس کی تصانیف سے اہلِ یورپ نے بہت کچھ خوشہ چینی کی ہے ۔

جغرافیہ | تجارت نے عرب سیاحوں میں "جغرافیہ نویسی" کا شوق پیدا کیا اور وہ اپنے سفر کے واقعات
قلمبند کرنے لگے یہ واقعات اگرچہ ذاتی حیثیت رکھتے ہیں مگر ان کی دوسری نوعیت جغرافیائی ہے
یہ کہیئے کہ یہ سفرنامے ہی علمِ جغرافیہ کی بنیاد بنے ۔ مثال کے طور پر ابن بطوطہ کا سفرنامہ بہت سے شہروں
اور ملکوں کا جغرافیہ ہے اور اس کے پڑھنے سے ہم متعدد مقامات کی جغرافیائی پوزیشن جان سکتے ہیں ۔

عربوں کے قدم اندلس پہنچے تو یہ خطہ مردم خیزی کا سبزہ زار بن گیا ادریسی یہیں کا رہنے والا تھا
جس کا جغرافیہ فنی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اہلِ یورپ ایک زمانہ تک ادریسی کے جغرافیہ سے فائدہ
اٹھاتے رہے ہیں ادریسی نے ۱۱۵۴ء میں جغرافیہ لکھا ۔ ادریسی کا جغرافیہ تقلیدی نہیں تحقیقی تھا علاوہ تحقیق
وانکشاف کے بہت سے نقشے بھی تفصیل کے ساتھ درج کئے جس نے ادریسی کے جغرافیہ کی اہمیت کو
بہت زیادہ بڑھا دیا ہے ۔ "بکھتال" عربوں کی جغرافیہ دانی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"عرب اپنے دور کے عظیم ترین سیاح، تاجر اور جہاں پیما سرگذشت سفر لکھنے کے عادی تھے جس جگہ سفر
کرتے تھے وہاں کا نقشہ تیار کرتے تھے، نیز اس خطے کے سیاسی، سماجی اور کاروباری حالات لکھتے
تھے اور اسکولوں میں تعلیم اسی انداز سے ہوتی تھی ۔

(The Coltoral Side of Islam صفحہ 70)

علمِ طب و جراحت | فنِ طب کو عربوں نے آسمانِ ترقی پر پہنچا دیا تھا بو علی سینا اور ابو بکر رازی فنِ
طب کے امام سمجھے جاتے ہیں اور اس فن میں ان کی تصانیف آج بھی دنیا کے لئے سنگِ میل کی حیثیت
رکھتی ہیں ۔

ایقاسیس فنِ جراحت کے امام تھے اس مایۂ ناز سرجن نے بہت سے آلاتِ جراحی ایجاد
کئے فنِ جراحت پر اس کی مبسوط تصنیف آج بھی اس کے کمال کا بین ثبوت ہے، ابن رشد کو تو

کون بھول سکتا ہے جس نے اس فن میں اپنا جوہر کمال دکھلایا۔

آپریشن سے پہلے سُن کرنے کی دواعربوں کی ایجاد ہے۔ زخم کو ریشمی ٹانکوں سے سینے کا رواج عربوں نے دیا۔ موتیا بند، پتھری اور فتق جیسے امراض کا علاج آج سے بہت پہلے عرب اطبا دریافت کر چکے تھے۔

مسلمانوں نے ایسے شفا خانے قایم کیے جس میں امراض کے اعتبار سے طبقہ وار مریضوں کو رکھا جاتا تھا اور صفائی ستھرائی کا مکمل انتظام ہوتا تھا۔ (اسلام کا ثقافتی پہلو از کپتان صاحب)

یہ چند عبرت آموز تاریخی حقایق اُس ملّت خوابیدہ کو دعوتِ بیداری دیتے ہیں جو کبھی تشنگانِ علوم کے لئے سیرابی کا سرچشمہ تھی اور اب خود تشنہ جان و تشنہ لب ہے، وہ قوم جس سے غیروں نے اندازِ جہانبانی سیکھا تھا آج اپنی بے عملی و جمود کی بنا پر اسیرِ پستی و غلامی ہے۔

"فاعتبروا یا اولی الابصار"

فارسی و اُردو کی چند کم یاب کتابیں

کتاب خانۂ دانش گاہ دہلی میں

از

(جناب نثار احمد صاحب فاروقی)

(۲)

۷۔ سفرنامۂ حکیم ناصر خسرو | مولانا الطاف حسین حالی مرحوم[۱] کے سوانح نگاروں میں بہت کم اس حقیقت

---

[۱] الطاف حسین حالی کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش ہے ان کا سلسلہ نسب شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری (۳۹۵ - ۴۸۱ ہجری) سے ملتا ہے۔ حالی کی پیدائش بقول خود تقریباً ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں ہوئی۔ پانی پت ضلع کرنال کے محلہ انصاریان میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ "سادات شہداپور" کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ حالی نے بے ضابطہ طور پر تعلیم حاصل کی لیکن وہ اُردو، فارسی اور عربی میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ اُن کی تصنیفات میں یادگارِ غالب، حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید، مقدمہ شعر و شاعری اور مسدس مدو جزرِ اسلام، زندۂ جاوید ہیں۔ حالی نے بیک وقت اردو میں تنقید کی روایت مستحکم کی، شاعری کے فرسودہ سانچوں کو توڑا، مسلمانوں میں تعلیمی سرگرمیوں کا احساس پیدا کیا، اُردو نثر میں سادگی اور سلاست کو رواج دیا، اور شاعری میں حب الوطنی اور قوم پروری کے جذبات پیش کیے۔ اس طرح وہ گویا اُردو ادب کا ایک انقلابی دور ہیں اُن کی ذات سے کئی عہد شروع ہوتے ہیں کئی روایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ شاعری میں انھوں نے غالب اور شیفتہ سے استفادہ کیا۔ جدید اُردو شاعری کا بانی بھی حالی کو سمجھا جاتا ہے سب سے پہلے حالی اور محمد حسین آزاد نے موضوعاتی نظمیں لکھیں۔ ۱۸۷۰ء میں وہ پنجاب کے محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے ۱۸۷۵ء میں اینگلو عربک کالج دہلی میں مدرس ہو گئے۔ ۱۸۹۱ء میں ملازمت سے استعفا دے دیا۔ ۱۹۰۴ء میں شمس العلما کا خطاب بھی ملا۔ سو روپے ماہوار حیدر آباد سے وظیفہ خدمات علمی کے صلے میں ملتا تھا اسی پر قناعت کیے رہے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو ۷۷ برس کی عمر میں انتقال فرمایا (مطابق ۱۳ صفر ۱۳۳۳ھ) انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پانی پت ہی میں مدفون ہوئے۔ حالی پر مزید مطالعے کے لئے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ رسالہ اُردو جلد ۱۳ و ۳۳۔ ۲۔ چند ہم عصر۔ ۳۔ یادگار حالی: صالحہ عابد حسین
۴۔ داستان تاریخ اردو: حامد حسن قادری ۵۔ تلامذہ غالب: مالک رام
۶۔ زمانہ کانپور: حالی نمبر ۷۔ مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی
۸۔ Halis poetry Jamil Ahmed ۹۔ مطالعہ حالی: شجاعت علی سندیلوی۔ وغیرہ

سے واقف ہیں کہ مولانا نے حکیم ناصر خسرو[۱] کے سفرنامہ کو مرتب کرکے شائع کرایا تھا صالحہ عابد حسین کی کتاب "یادگار حالی" کا دیباچہ لکھتے ہوئے مولانا ابو الکلام آزاد نے اس کی طرف توجہ دلائی تھی انھوں نے خود بھی یہ کتاب نہیں اس کا اشتہار دیکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"خواجہ صاحب کی علمی خدمات کے سلسلے میں ایک کتاب کا ذکر رہ گیا ہے یعنی حکیم ناصر خسرو کے سفرنامے کی تصحیح اور اشاعت۔ حیات سعدی کا پہلا ایڈیشن جو دہلی میں چھپا تھا میرے کتب خانے میں ہوگا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کے ٹائیٹل پیج پر اس سفرنامے کا اشتہار چھپا تھا اس سے معلوم ہوا کہ حیات سعدی سے پہلے یہ کتاب چھپ چکی تھی"[۲]

اول تو کسی نے حالی کے علمی کارناموں کی فہرس بناتے ہوئے اس کتاب کا نام ہی نہیں لکھا اور جنھوں نے لکھا وہ بھی اس کتاب کو دیکھنے کے مدعی نہیں۔ پروفیسر حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اردو میں حالی کی "تصانیف نثر بہ ترتیب تصنیف" درج کی ہیں (ص ۵۴۶ - ۵۴۷) لیکن "سوانح عمری حکیم ناصر خسرو ۱۸۸۲ء / ۱۲۹۹ھ" کے بعد لکھا ہے کہ "اب نایاب ہے"۔

دوسری بار یہ اصل سفرنامہ ۱۹۴۱ء میں انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے ترجمہ ہو کر مع حواشی و تعلیقات کے شائع ہو چکا ہے۔ ترجمہ مولانا عبد الرزاق کانپوری (مصنف "البرامکہ" و "نظام الملک طوسی") نے کیا تھا۔ اس میں ۱۷ صفحوں کی فہرس مضامین (ص الف تا س) ۱۸ صفحوں پر مقدمہ و خاتمہ اور ۱۵۶ صفحات میں متن کا ترجمہ پھر صفحہ ۱۵۷ سے صفحہ ۲۲۳ تک "حواشی سفرنامہ متعلق امصار و دیار و مشاہیر حکما و علما وغیرہ ہیں۔ سائز وہی ہے جو انجمن کی کتابوں کا ہوتا ہے۔

یہ سفرنامہ سب سے پہلے الطاف حسین حالی نے ۱۸۸۲ء میں ایڈٹ کرکے شائع کیا تھا جو ۲۶×۱۰

---

[۱] حکیم ناصر خسرو کے سفرنامے پر حالی کا مقدمہ بہت جامع ہے اور اب تک اردو خواں حلقے کے سامنے نہیں آیا ہے اس کی جامعیت اور افادیت کے پیش نظر ہم اس کا اردو ترجمہ آئندہ قسط میں پیش کریں گے انشاء اللہ۔ مرتب

[۲] یادگار حالی: صالحہ عابد حسین ص۱۸

سائز پر دو قسم کے کاغذ پر چھاپا گیا تھا۔ "قسم اوّل کی فی جلد ایک روپیہ اور قسم دوم کی فی جلد بارہ آنہ قیمت" تھی۔ سرورق کے آخری صفحے پر "The travels of Nasir khosrau

" کا اشتہار یا تعارف انگریزی میں بھی تھا۔

اس سفرنامے کا ایک نسخہ کتب خانہ دانش گاہ دہلی میں محفوظ ہے۔ جس کے سرورق کی عبارت ہے:

هُوالمستعان

سفرنامہ حکیم ناصر خسرو علوی بلخی متضمن حالات سفر ایران و ارمینیہ و شام و فلسطین و عراق

و عرب و مصر واقع ۴۳۷ھ

مع

سوانح عمری مصنف

رقم زدہ جناب مولانا خواجہ محمد الطاف حسین صاحب حالی مدرس اول السنہ مشرقیہ اینگلو عربک اسکول دہلی۔ حسب فرمائش جناب منشی محمد یعقوب علی صاحب

۱۸۸۲ء

در مطبع اخبار خیر خواہ ہند دہلی باہتمام مہا زائن طبع گردید

حسب ضابطہ رجسٹری نمودہ شد

"ص ۱" سے اس کا مقدمہ بہ عنوان "سیرت حکیم ناصر خسرو۔ صاحب سفرنامہ، رقم زدہ کلک گہر سلک جناب مولوی خواجہ محمد الطاف حسین صاحب انصاری پانی پتی مقیم دہلی متخلص بہ حالی سلمہ،" زبان فارسی میں ہے اور ص ۳۲ تک پھیلا ہوا ہے۔ ص ۳۳ سے "سفرنامہ ناصر خسرو علوی ۱۲۹۹ھ" شروع ہوتا ہے جو ص ۱۳۴ پر ختم ہو جاتا ہے۔ ص ۱۳۵ سے "خاتمہ" ہے جس میں محمد یعقوب علی نے لکھا ہے کہ:

"اگرچہ مسلمان سیاحوں نے عربی زبان میں اکثر سفرنامے لکھے ہیں، خلفائے اندلس کے ہاں جو سیاح اپنے سفر کے حالات لکھتے تھے اُن کی کمال قدردانی کی جاتی تھی مگر فارسی زبان میں قدیم

زمانے کا کوئی سفرنامہ اس کے سوا نہیں دیکھا گیا۔ یہ سفرنامہ بھی نہایت نادر الوجود تھا صرف عالی جناب مستطاب نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب[1] بہادر کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا وہاں سے لے کر فرانس کے ایک نامی مصنف چارلس شیفر صاحب نے اس کا ترجمہ اپنی زبان میں شائع کیا ہم نے بھی یہ چاہا تھا کہ اس کا ترجمہ اردو میں کیا جائے مگر چوں کہ آٹھ سو برس کی تصنیف اور اس کی طرزِ تحریر خود ایک ایسی یادگار چیز تھی جس کا اہل وطن کو دکھانا ضرور تھا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ مصنف کی اصل زبان ہی میں اس قدیم سفرنامے کی اشاعت کی جائے۔ ناصر خسرو کے نام سے ہمارے ہم وطن بہت کم واقف ہیں لیکن تمام ممالک ایران اور ترکستان وغیرہ میں وہ اعلیٰ درجے کا حکیم اور اعلیٰ درجے

---

[1] نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں، نواب احمد بخش خاں رستم جنگ والیٔ لوہارو، و فیروز پور جھرکہ کے صاحبزادے تھے۔ گلی قاسم جان دہلی میں مستقل قیام رہتا تھا جو اُن کے جدِّ اعلیٰ کے نام سے منسوب ہے۔ نواب صاحب کی نشست گاہ وہ تھی جس میں آج کل روزنامہ الجمعیۃ دہلی کا دفتر ہے۔ نواب احمد بخش خاں نے چار فرزند اپنی یادگار چھوڑے تھے ایک بیوی سے نواب مرزا خاں داغ کے والد نواب شمس الدین احمد خاں تھے جو ولیم فریزر ریزیڈنٹ دہلی کو قتل کرانے کے الزام میں پھانسی پا گئے تھے (۱۸۳۵ء) دوسری بیوی سے نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں تھے۔ احمد بخش خاں نے جب ریاست اپنے فرزندوں میں تقسیم کی تو فیروز پور جھرکہ نواب شمس الدین احمد خاں کے حصے میں آیا اور لوہارو مؤخر الذکر دونوں بھائیوں کو ملا۔ لوہارو کی ریاست میں حصہ کے عوض اُن میں ۱۰ ہزار سالانہ سرکار انگریزی کے خزانے سے ملتے رہے۔ نواب ضیاء الدین خاں کی تعلیم و تربیت میں غالب نے بھی دل چسپی لی تھی انھوں نے مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ اور مولوی کریم اللہ جیسے علماء سے کسبِ علوم کیا۔ فارسی میں غالب سے اور اُردو میں غالباً مومن سے اصلاح لیتے تھے فقہ، تفسیر، منطق اور ادب کے علاوہ نجوم، ہیئت، تاریخ اور جغرافیہ میں کافی درک رکھتے تھے۔ ان کا کتب خانہ بڑا نادر تھا لیکن سب غدر میں تاراج ہو گیا غدر کے بعد جو کتابیں جمع کیں اُن کا کچھ حصہ اب ندوۃ العلماء لکھنؤ میں محفوظ ہے۔ رخشاں کا کلام "جلوۂ صحیفۂ زریں" کے نام سے اُن کے فرزند نواب سعید الدین احمد خاں نے جمع کر کے ۱۹۱۵ء میں طبع کرا دیا تھا اس میں اُن کے حالاتِ زندگی بھی شامل ہیں۔ اس کا بھی ایک نسخہ کتب خانہ دانش گاہ دہلی میں محفوظ ہے۔ نواب ضیاء الدین نے ۱۳ رمضان المبارک ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۷ جون ۱۸۸۵ء بروز شنبہ انتقال فرمایا اور درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ میں اپنے والد ماجد کے پہلو میں مدفون ہوئے "روز شنبہ، سیزدہ ماہ صیام" مادۂ تاریخ ہے جس سے ۱۳۰۲ھ برآمد ہوتے ہیں۔ (تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو: تلامذۂ غالب: مالک رام ص ۲۸۵ تا ۲۹۰ - جلوۂ صحیفۂ زریں، اور ذکر غالب وغیرہ۔)

کا شاعر اور صوفی مانا جاتا ہے اور سیادت کے سبب اس کی اور بھی زیادہ تعظیم کی جاتی ہے۔ اگرچہ کتب تواریخ وسیر میں اس کے اکثر حالات افسانے کے طور پر لکھے گئے ہیں مگر شہسوار عرصۂ سخن دانی فارس مضمار نکتہ پروری حضرت مولوی محمد الطاف حسین صاحب حالیؔ نے تمام حالات خود اس کے کلام سے اخذ کر کے لکھے ہیں اور کوئی بات بغیر کافی ثبوت کے تحریر نہیں فرمائی سب سے زیادہ حکیم صاحب کا حال تذکرہ آتش کدہ اور تذکرہ دولت شاہی میں لکھا گیا ہے مگر حضرت ممدوح کی تحقیقات سے ناظرین کو واضح ہوگا کہ ان تذکروں میں کس قدر کم بیان تشفی اور اطمینان کے قابل تھا حق یہ ہے کہ جناب موصوف نے آٹھ سو برس بعد حکیم مغفور کو از سر نو زندہ کیا اور اس کی لالف پر جو بے شمار پردے پڑے ہوتے تھے وہ بالکل اٹھا دیئے ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے ہم وطن اس عزیز الوجود کتاب کی جو مولوی صاحب ممدوح کی تصحیح سے طبع ہوئی دل سے قدر کریں گے۔ خاکسار محمد یعقوب علی" (صـ۱۳۶)

اس تعارف کے بعد اسی صـ۱۳۶ پر "قطعۂ تاریخ از نتائج فکر بلند نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر رئیس لوہارو متخلص بہ نیّر" درج ہے وھو ھذا ؎

سفر نامہ ناصر خسرو است — کہ گردید طبع اندریں روزگار
بہ تصحیح و تحریر دیباچہ اش — بپرداخت حالیؔ حکمت شعار
بود سال اتمام طبع کتاب — "سفر نامہ ناصر ہوشیار" ۱۲۹۹ھ

ناصر خسرو کے حالات میں حالی نے جو ۳۲ صفحوں کا مقدمہ فارسی میں لکھا ہے وہ اب تک اُن کے کسی مجموعہ مضامین میں شامل نہیں ہوا ہے۔ اُن کی فارسی نویسی کا مختصر نمونہ اور اس عالمانہ مقدمے کا اُردو ترجمہ "حالیات" سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے آئندہ پیش کیا جائے گا۔

ادبیات

غزل

از

(جناب آثم مظفر نگری)

زمانہ زندگی سے بڑھ کے بیتابانہ ملتا ہے — بڑی مدت میں دیوانے سے جب دیوانہ ملتا ہے

جسے فیضِ خدا سے ذوقِ درویشانہ ملتا ہے — اسی کو دو جہاں میں منصبِ شاہانہ ملتا ہے

پئے تسکینِ وحشت جائیں کیوں صحرا کو دیوانے — انھیں گلشن کے ہر ذرے میں اک ویرانہ ملتا ہے

نہ سمجھو رائگاں بربادیوں کو محفلِ غم کی — یہاں اب بھی نشانِ منزلِ پروانہ ملتا ہے

دکھا دیتا ہے ہر پردے سے چشمِ شوق کو جلوہ — وہ ملتا ہے تو ہر عالم میں آزادانہ ملتا ہے

مجھے کیوں زندگی اس منزلِ ہستی میں لے آئی — یہاں تو ہر یگانہ صورتِ بیگانہ ملتا ہے

یہ ہے اک جرأت بے ضابطہ ساقی سے کیا پوچھوں — بھری محفل میں خالی کیوں مجھے پیمانہ ملتا ہے

جسے ہر سننے والا جانتا ہے داستاں اپنی — لبِ ہستی پہ ایک ایسا بھی تو افسانہ ملتا ہے

بتا دے بادہ نوشوں کو یہ تیرا فرض ہے ساقی — بہار آنے پہ ہر دم وا درِ میخانہ ملتا ہے

خودی پرور تھیں جس کی مستیاں درِ انا الحق میں — وہ بادہ آج بھی پیمانہ در پیمانہ ملتا ہے

نہ ان ٹوٹے ہوئے محراب و در کو رائگاں سمجھو — انھیں سے تو ثبوتِ ہمتِ مردانہ ملتا ہے

نگاہِ غور سے دیکھا جو میں نے بزمِ ہستی کو — ہر اک عشرت کدے کے ساتھ ماتم خانہ ملتا ہے

بہاریں ساتھ اپنے لے گئیں داغِ محبت کو — کہاں اب وہ حریفِ ظلمتِ غم خانہ ملتا ہے

نتیجہ سجدۂ بے ضابطہ کا اور کیا ہوتا — حرم کو ڈھونڈتا ہوں ور درِ بت خانہ ملتا ہے

جو ملنا ہے آثم سے دشتِ وحشتناک میں ملئے
اسی جنگل میں وہ پیغمبرِ ویرانہ ملتا ہے

تبصرے

اے ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ جلد اول | تقطیع کلاں ضخامت ۶۳۰ صفحات ٹائپ جلی اور روشن قیمت مجلد ۲۵ روپیہ پتہ :- دی بورڈ آف ڈیٹرس ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی -

حکومت پاکستان نے ۵۲ء میں ایک بورڈ اس غرض سے قائم کیا تھا کہ ہندو پاک برصغیر میں اورنگ زیب عالم گیر کی وفات (۱۷۰۷ء) سے لے کر ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان تک مسلمانوں نے آزادی کے لئے جو جدوجہد کی ہے اُس کی تاریخ مرتب کی جائے بورڈ آف ڈیٹرس کے خاکہ کے مطابق یہ تاریخ چار جلدوں میں مرتب ہوگی - زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلہ کی پہلی جلد ہے جو ۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۸۳۱ء یعنی بالاکوٹ میں حضرت سید احمد شہید کی شہادت تک کے واقعات پر مشتمل ہے - اس جلد میں بیس ابواب ہیں جن کو ہندوپاک کے مستند اور مشہور اساتذہ تاریخ ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی - شیخ عبدالرشید - مولوی خلیق احمد نظامی - ڈاکٹر عبدالحلیم - ڈاکٹر معین الحق - ڈاکٹر ریاض الاسلام - ڈاکٹر احمد بشیر - جناب رشید اختر ندوی - ایم تفضل داؤد - مرزا علی اظہر - ڈاکٹر عبدالباری اور نامدار خاں صاحب نے لکھا ہے جیسا کہ فاضل صدر بورڈ نے اپنے مقدمہ میں کہا ہے چونکہ اس جلد کی ترتیب وتدوین سے اصل مقصد مسلمانوں کی جدوجہد آزادی اور اس کے محرکات کو واضح اور نمایاں کرنا ہے اس بناء پر اس میں اگرچہ ترتیب وار وہ تمام سیاسی حالات وواقعات بیان کر دئے گئے ہیں جو ۱۷۰۷ء سے ۱۸۳۱ء تک پیش آتے رہے لیکن زیادہ تفصیل سے ان تحریکات اور تحریکات کے بانیوں کے حالات وسوانح کو بیان کیا گیا ہے جن کا تعلق براہ راست جدوجہد آزادی سے ہے - چنانچہ شاہ ولی اللہ الدہلوی - احمد شاہ ابدالی - ٹیپو سلطان - اور حضرت سید احمد شہید کے سوانح حیات اور

ان کے کارناموں پر مستقل دو دو باب ہیں ان کے علاوہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے علامات - اورنگ زیب عالم گیر کے جانشین - سکھ، مرہٹے نوابانِ اودھ - روہیلے - آصف جاہ - اور ایسٹ انڈیا کمپنی پر ایک ایک مستقل باب ہے شروع میں ڈاکٹر قریشی نے ایک طویل مقالہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر قیام پاکستان کی تاریخ - ہندو مسلمانوں کے تعلقات، تہذیبی اور سماجی حالات - مختلف تحریکات سیاسی و مذہبی پر ایک تبصرہ کیا ہے اور اپنے نقطۂ نظر سے اس دور کے تاریخی واقعات و حوادث کی توجیہ کی ہے اس طرح یہ کتاب انگریزی زبان میں سب سے پہلی کوشش ہے جس میں تاریخ ہند کے ایک خاص دور کو بڑی جامعیت اور تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا اور جس میں واقعات کے ساتھ ان کے تہذیبی اور سماجی موثرات و عوامل کو دیدہ وری اور بصیرت کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے اس کامیاب کوشش پر بورڈ آف اڈیٹرس لائق مبارک باد ہے امید ہے کہ اس سلسلہ کی باقی جلدیں بھی جلد شائع ہوں گی -

احکام سلطانیہ تقطیع متوسط ضخامت ۵۳۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر - قیمت مجلد چھ روپے پتہ :- محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب - قرآن محل - مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی -

علامہ ابوالحسن ماوردی کی کتاب "الاحکام السلطانیہ" اہل علم میں کافی مشہور و مقبول ہے جس میں اسلامی نظام حکومت یعنی حکومت کی تشکیل، اُس کے اغراض و مقاصد - اُس کے مختلف شعبے - اُن کے حدود عمل - ذرائع و مصارف آمدنی - حدود و تعزیرات - وغیرہ ان سب امور کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے - لیکن چوں کہ اصل کتاب عربی میں تھی اس لئے اہل علم ہی اُس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے - اب اردو کے مشہور اہل قلم مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی نے اُس کو سلیس اور شگفتہ اردو میں منتقل کر دیا ہے تو اردو خواں حضرات بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں - موجودہ زمانہ میں کتاب کے موضوع بحث کی جو اہمیت ہے اور خصوصاً پاکستان میں وہ ظاہر ہے اس لئے امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے -

آشفتہ بیانی مری از پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ تقطیع متوسط۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد سے غیر مجلد عہ پتہ سر سید بک ڈپو شمشاد بلڈنگ۔ علی گڈھ۔

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے خود علی گڈھ کے تعلق سے اپنی جو سرگذشت علی گڈھ میگزین کے خاص نمبروں میں مختلف مضامین کی شکل میں شائع کی تھی وہ اس کتاب میں یکجا جمع کردی گئی ہے۔ علی گڈھ رشید صاحب میں اس طرح رچا اور بسا ہوا ہے کہ جب کبھی وہ علی گڈھ کی زندگی کے کسی ایک پہلو پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی تحریر میں ایک خاص قسم کی توانائی اور طرفگی پیدا ہوجاتی ہے چنانچہ یہ کتاب بھی رشید صاحب کے چند خاص شاہکاروں میں شامل ہونے کے لائق ہے اس میں علی گڈھ کی اجتماعی، تہذیبی اور تمدنی زندگی کے بہت سے رُخ اور اس زندگی کے جو حضرات عناصر ترکیبی تھے ان کے خصائص اور حالاتِ زندگی بڑی خوبی سے بیان ہوگئے ہیں اگرچہ اس کتاب کو علیگڈھ کی تاریخ نہیں کہا جاسکتا تاہم ادبی حیثیت سے اور بعض خاص تاریخی معلومات کی وجہ سے یہ کتاب علیگڈھ کی ادبیات میں ایک قیمتی اضافہ ہے امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے۔

سہل قواعد تجوید تقطیع خرد۔ ضخامت ۵۹ صفحات، کاغذ وطباعت معمولی قیمت ۸/ ۔ پتہ مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن۔

بچوں کو تجوید کے قواعد سے اس حد تک مناسبت پیدا کردینی ضروری ہے کہ صحیح طور پر قرآن پاک کی تلاوت کے قابل ہوجائیں۔ اس مقصد کے پیش نظر مذکورہ بالا کتاب لکھی گئی ہے۔ اس میں تجوید کے عام اور ضروری مسائل کو آسان زبان میں مناسب ترتیب سے بیان کیا گیا ہے کہ بچے بہ سہولت ان قواعد کو اپنا سکیں۔

کتاب کے مؤلف سید کلیم اللہ حسینی پروفیسر فارسی جامعہ عثمانیہ ہیں جن کو تجوید وقرأۃ سے علمی و عملی بہر طور شغف ہے۔ اس فن پر ان کی اصل تالیف سراج الترتیل کے نام سے چھپی تھی دوبارہ اس فن

کی ترویج کے خیال سے انھوں نے اپنی کتاب کا ایک خلاصہ شایع کیا تھا اب اسی خلاصہ کو ضروری ترمیم اور مفید اضافہ کے بعد سہل قواعد تجوید کے نام سے شایع کیا ہے۔

کتاب صرف دو باب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں قرآن پاک کی تعلیم و تعلم کی فضیلت درفنِ تجوید کی تعریف و تعارف کے بعد دس فصلوں میں مخارج حروف، صفات حروف، لام جلالہ وغیرہ، قواعد را، نون ساکن وتنوین، میم ساکن و میم نون مشدد، ہائے ضمیر، مد و قصر، وقف و ابتدار کے مسائل بیان کئے ہیں اور ہر فصل کے اخیر میں مشقی سوالات بھی درج ہیں۔ باب دوم متفرق فوائد و مسائل پر مشتمل ہے۔ تجوید کے ابتدائی درجوں میں یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔

علماء ہند کا شاندار ماضی جلد ۲ ہندوستان مسلمان اور تحریک آزادی

تقطیع خورد۔ ضخامت ۴۰۰ صفحے، طباعت وکتابت دیدہ زیب قیمت مجلد ہے، پتہ :۔ الجمعیۃ بک ڈپو قاسم جان سٹریٹ دہلی۔ مصنفہ مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند۔

اس سلسلہ کی پہلی جلد ۱۹۳۹ء میں شائع ہوکر ملک میں قبولِ عام حاصل کر چکی ہے اب اٹھارہ انیس سال کے بعد دوسری جلد ۱۹۵۷ء کے وسط میں شائع ہوئی ہے جس میں مصنف علامہ نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خانوادۂ عالیہ کے مجوزہ سیاسی پروگرام کی تشریح و تنقید کے جملہ تاریخی پہلوؤں کو بڑی جامعیت سے واضح فرمایا ہے۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں جن عظیم شخصیتوں نے اپنے ایثار و فرض شناسی کے تابناک نقوش صفحۂ تاریخ پر چھوڑے ہیں ان کے مجاہدانہ کارناموں اور انقلابی اقدامات کے سلسلہ میں تمام تاریخی حقائق کو مرتب فرما کر محترم مصنف نے ملک و قوم کو اپنا مرہونِ منت بنا لیا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید مولانا اسماعیل شہید اور ان حضرات کے اعوان و انصار کی انقلاب انگیزیوں کے علاوہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے سیاسی ماحول سے متعلق بہتیرے جزئیات اس مقدس صحیفہ میں یکجا مرتب نظر آتے ہیں۔

لکھنو اور جنگ آزادی تقطیع خرد۔ ضخامت ۱۳۶ صفحات، کاغذ و طباعت بہتر، قیمت عہ پتہ۔ ادبی اکیڈمی نیا گاؤں لکھنو

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی صد سالہ یادگار کے موقعہ پر مختلف زبانوں میں چھوٹی بڑی کتابوں اور مقالات کی اشاعت ہو چکی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو دراصل مجموعہ ہے

چند ایسے مقالات کا جن کا مقصد تحریک آزادی میں لکھنو کے حصہ کو واضح کرنا ہے۔ مقالات سنجیدہ اور پراز معلومات ہیں لکھنے والوں میں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، شیخ تصدق حسین، عبدالاحد خاں جلیل اور خان محبوب طرزی کی شخصیتیں ہیں۔ یہ مجموعہ آزادی وطن کی اس تاریخی تحریک کے سلسلہ میں مفید اضافہ اور ادبی اکیڈمی کی قابل قدر پیشکش ہے۔

بُرہان

جلد ۴۱ شمارہ ۵

نومبر ۱۹۵۸ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

گذشتہ مہینہ پاکستان میں جو سیاسی انقلاب ہوا ہے۔ وہ اگرچہ ایک عظیم انقلاب ہے جس کے اثرات ونتائج بہت دور رس ہو سکتے ہیں۔ لیکن حیرت انگیز ذرا نہیں۔ کیوں کہ ملک کی سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کی خود غرضی و نفس پرستی کے باعث پاکستان کو کبھی کوئی مضبوط حکومت میسر نہ آسکی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے تمام شعبوں میں بدنظمی و اختلال کا دور دورہ ہوگیا۔ رشوت ستانی اور فرض ناشناسی عام ہوگئی اور ملک پر اس صورتِ حال کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں کے اخلاق بگڑ گئے۔ بددیانتی اور خیانت روزمرہ کا مشغلہ ہوگیا۔ اور ہوائے نفس کا اتباع وظیفۂ حیات بن گیا۔ ان حالات کے بیشِ نظر اربابِ بصیرت پہلے سے سمجھتے تھے کہ کسی نہ کسی قسم کا کوئی فوجی انقلاب ضرور ہوگا۔ جیسا کہ ایشیا کے دوسرے ملکوں میں ہوچکا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ۷ اکتوبر کو اس اندیشہ کی تصدیق ہوگئی۔ لیکن یہ انقلاب جس پُر امن طریقہ پر ہوا ہے اور اس سے عوام کی زندگی پر جو فوری طور پر خوش گوار اثر پڑا ہے اُس کی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ انقلاب اسی نوع کے اُن دوسرے انقلابات سے یکسر مختلف ہے۔

پاکستان میں فوجی حکومت کے قیام کے بعد سے اب تک لاکھوں کی تعداد میں جو ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی چیزیں برآمد ہورہی ہیں اُن کے اعداد و شمار انتہائی حیرت انگیز اور ایک مسلمان سوسائٹی کے لئے بے حد افسوسناک اور لائق ہزار شرم ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فساد کس طرح معاشرہ کی رگ رگ میں سرایت کرگیا تھا اور اس پر آپریشن کرنے کی کس قدر سخت ضرورت تھی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ آپریشن سے صرف مادۂ فاسد کا اخراج ہوجاتا ہے لیکن زخم کو مندمل کرنے اور آپریشن کی وجہ سے جسم میں جو ضعف پیدا ہوجاتا ہے اُس کی تلافی کرنے کے لئے مختلف قسم کی تدبیروں اور دواؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس بنا پر یہ ظاہر ہے کہ پاکستان میں فوجی حکومت کا یہ دور ابتدائی اور بالکل عبوری دور ہے

جس کے پیش نظر مستقبل کے لئے ابھی کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ اس سے گذرنے کے بعد پاکستان کو اپنے مستقل نظامِ حکومت کے مسئلہ پر غور کرنا ہوگا اور اُس وقت ہی دنیا فیصلہ کرسکے گی کہ موجودہ فوجی انقلاب پاکستان کے حق میں کس حد تک سیاسی استحکام۔ اور اندرونی امن و عافیت کا باعث ثابت ہوسکا اور اُس نے بین الاقوامی سیاسیات کے دربار میں ملک کو کون سا مقام اور مرتبہ دیا ہے۔

بہر حال ایشیا کے ارباب فکر و نظر کو اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے کہ آج آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس خطۂ ارضی کے اکثر ملکوں نے عہدِ حاضر کی مروجہ جمہوریت کے راستہ کو چھوڑ کر ڈکٹیٹر شپ یا اسی قسم کے دوسرے نظامِ حکومت کو پسند کیا ہے؟۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایشیائی ملکوں نے آزاد ہوتے ہی امریکہ اور برطانیہ کی نقالی میں اپنے لئے بھی وہی نظام حکومت پسند کیا جو ان ملکوں میں رائج تھا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ کوئی پھل خواہ کتنا ہی لذیذ اور خوش ذائقہ ہو ہر ملک کی آب و ہوا میں پھل پھول نہیں سکتا۔ ایک ایسا نظامِ حکومت جس میں فیصلے ووٹوں کی اکثریت پر مبنی ہوں صرف اسی ملک میں امن و امان اور خوش حالی کا باعث ہوسکتا ہے جس کے عوام تعلیم یافتہ ہوں اپنے مسائل کا صحیح شعور رکھتے ہوں۔ اور جو ملک و قوم کے مفاد پر ذاتی اغراض کو ترجیح نہ دیتے ہوں۔ چنانچہ آج برطانیہ اور امریکہ میں یہ نظامِ جمہوریت کامیاب ہے تو اُس کی وجہ یہی ہے کہ ان ملکوں میں تعلیم عام ہے۔ یہاں کے عوام بھی بیدار مغز اور روشن خیال ہیں اور اُن کو قومی زندگی کے ساتھ پوری دلچسپی ہے۔

لیکن اس کے برخلاف ایشیائی ملکوں کے عوام کا حال کیا ہے؟ اُن میں تعلیم کا کیا تناسب ہے؟ انھیں ملکی اور قومی مسائل کے ساتھ کتنی دلچسپی ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چند خود غرض قسم کے لوگ عوام کے جذبات کو غلط طریقہ پر اپنے ساتھ لے کر ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوجاتے ہیں اور اپنے شخصی اغراض و اہوا کی خاطر اُن لوگوں کے راستہ میں دقتیں اور دشواریاں پیدا کرتے ہیں جو ایمان داری اور خلوص سے ملک اور قوم کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر جمہوریت عوام کے حق میں رحمت ہونے کے بجائے زحمت ثابت ہوتی ہے۔ اور ملک میں پراگندگی عام ہوجاتی ہے

اس لئے کسی ملک میں نظامِ جمہوری کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہے کہ عوام کو تعلیم سے آراستہ کرکے اُن میں ایسی خود داری۔ خود اعتمادی پیدا کی جائے کہ وہ اربابِ غرض کا آلہ کار نہ بنیں۔ اُن میں ایسا دیدہ امتیاز پیدا ہو کہ وہ بے غرض خادمانِ ملک اور غرض مند لیڈروں میں ملک کے نفع و نقصان میں، حق اور باطل میں تمیز کرسکیں اور ان کا قومی کیرکٹر اس درجہ بلند ہو کہ بد دیانتی اور خیانت کو کسی حالت میں بھی گوارا نہ کرسکیں۔

ماہ ربیع الاوّل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یومِ ولادت کی تقریب سے یوں تو ملک کے طول و عرض میں سیکڑوں ہزاروں جلسے اور کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس مرتبہ گذشتہ مہینہ ادارۂ اسلامی پانی پت کے زیرِ اہتمام خاص مہاراجہ پٹیالہ کے محل میں سیرت النبی کا جو عظیم الشان جلسہ ہوا وہ اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے خاص طور پر لائقِ ذکر ہے۔ یہ جلسہ تین روز تک رہا۔ اور ہر جلسہ میں ساٹھ ستر ہزار سامعین شریک ہوتے رہے جن میں مسلمان مشکل سے چار سو یا پانچ سو ہوں گے۔ باقی سب ہندو اور سکھ ہی ہوتے تھے جلسوں میں مسلمان علما اور زعما کے علاوہ وزیرِ اعظم پنجاب اور مہاراجہ پٹیالہ کی بھی تقریریں ہوئیں اور بعض اہلِ علم مسلمان جو اس کانفرنس میں شریک تھے اُن کا بیان ہے کہ یہ دونوں تقریریں محض رسمی نہیں تھیں، بلکہ سرورِ عالم کے لئے قلبی تعظیم و تکریم کی آئینہ دار تھیں۔ کانفرنس کے اختتام پر مہاراجہ پٹیالہ نے پُرزور الفاظ میں کہا کہ "اس قسم کی کانفرنس ہر سال ہونی چاہیئے۔ اور ہوتی رہے گی، کانفرنس کے اخراجات بھی تقریباً سب کے سب برادرانِ وطن نے ہی برداشت کئے۔

تدوینِ حدیث

علیؓ

صرف تاریخ کی روشنی میں

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے قلم سے

مترجم

(مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی)

مصر کے شہرۂ آفاق ادیب و محقق ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے عہد خلافت پر دو مبسوط اور محققانہ کتابیں لکھی تھیں، ان کتابوں میں تاریخی واقعات کا تجزیہ جس خاص انداز سے کیا گیا ہے اُس کا اثر یہی ہونا چاہیے تھا کہ دنیائے اسلام میں ان کی دھوم مچ گئی اور ناقدین نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق ان پر خوب، خوب اظہار رائے کیا، یہ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین ہمارے دور کے ایک ایسے مؤرخ ہیں جن کے قلم میں شوخی و لطافت اور زورِ بیان کے ساتھ جرأت و آزادی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اس لئے قدرتی طور پر ان کے اسلوب و تعبیر میں وہ احتیاط باقی نہیں رہ سکتی تھی جو خلافت راشدہ اور عہدِ خلفائے راشدین کے بیان میں ہونی چاہیئے، اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں اپنے رنگ میں یکتا ہیں اور ان میں بہت سے نازک اور الجھے مسائل کا غیر جانب دارانہ اور مورخانہ جائزہ لیا گیا ہے، مولانا عبدالحمید نعمانی نے جو جدید عربی زبان کے استاد ہیں اور عربی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی عمدہ استعداد رکھتے ہیں ۱۹۵۵ء میں "عثمانؓ صرف تاریخ کی روشنی میں" کا ترجمہ کیا تھا جس کے بہت سے ابواب "برہان" میں بھی شائع ہوئے تھے، موصوف نے اب دوسری کتاب

"علیؓ صرف تاریخ کی روشنی میں" کا ترجمہ بھی مکمل کر لیا ہے اور قدیم روایات کے مطابق اس کے بعض خاص اور اہم ابواب کا ترجمہ سب سے پہلے "برہان" کے لئے مرحمت فرمایا ہے امید رکھنی چاہیئے کہ پہلی کتاب کی طرح دوسری کتاب بھی جلد شایع ہوگی۔ ("برہان")

مسلمان، حضرت عثمانؓ کے بعد

حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد مسلمانوں کو دو ایسی خطرناک مشکلیں درپیش آئیں جن کی صدیق اکبرؓ کے عہد سے لے کر اب تک کی مشکلات میں کوئی مثال نہیں ملتی، ایک مشکل کا تعلق خود منصب خلافت سے ہے اور دوسری نظام کے برقرار رکھنے اور قاتلوں اور فسادیوں کو اللہ کے حکم کے مطابق سزا دینے سے متعلق ہے۔

حضرت عثمانؓ کے حادثے کے دن شام ہو چکی تھی اور مسلمانوں کا کوئی امام نہ تھا جوان کے معاملات کا منتظم، ان کے نظام کا نگراں اوران کے اقتدار کا حاکم ہوتا، اللہ کے احکام ان میں جاری کرتا، اوران سب کاموں کے بعد وہ اس عظیم الشان حکومت کے معاملات پر نظر رکھتا جس کو صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ نے قایم کیا تھا اور عثمان غنیؓ نے جس کے حدود مغرب و مشرق تک پھیلا دئے تھے، اس لئے کہ یہ مفتوحہ مقامات اور علاقے جہاں ابھی مسلمانوں کا اقتدار پوری طرح جم نہ سکا تھا اس کے محتاج تھے کہ کوئی انھیں سنبھالے، وہاں کے نظام میں استقلال اور مضبوطی پیدا کرے، اور ان کی سرحدوں کو بہت دور کر دے جو متعین ہونے نہیں پائی تھیں اور حضرت ابو بکرؓ کے عہد سے مسلسل فتوحات کی بنا پر تغیر پذیر تھیں کہ اتنے میں فتنہ و فساد کا دور آگیا اور مسلمان ادھر متوجہ ہو گئے، یا یوں کہئے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت فتوحات سے ہٹ کر فتنوں میں مشغول ہو گئی اسلامی فوجوں کا پڑاو سرحدوں پر اس طرح رہا کرتا کہ آج ہی کل آگے بڑھیں، ان فوجوں کا کام صرف یہ نہ تھا کہ فتوحات حاصل کریں بلکہ مفتوحہ سرزمین میں آئین کا اجرار بھی انھیں کا کام تھا وہ پہلا پرانا اقتدار ختم کر کے اس کی جگہ نیا اقتدار قایم کرتی تھیں، پھر نظام میں ایک طرف فاتحین کے

مزاج کے مطابق کچھ اضافے کرتیں، دوسری طرف مفتوحین کی طبیعت اور افتاد کی رعایت سے پہلے نظام کی کچھ باتیں باقی رکھتیں، ان اسلامی فوجوں کو اس کی ضرورت تھی کہ مزید فوج اور سازو سامان سے کوئی ان کی امداد کرتا رہے، پلان بتائے اور ضرورت کی ہر چیز ان کے لئے فراہم کرے۔

ظاہر ہے کہ جن مہاجر اور انصار نے صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ اور خود حضرت عثمانؓ کی بیعت کی تھی ان کے دامن پر حضرت عثمانؓ کے خون کا کوئی دھبہ نہیں یہ تو بصرہ، کوفہ اور مصر کی سرحدوں پر مقیم فوجوں میں سے بعض ٹولیوں کا کام تھا اور بعض ان دیہاتیوں کا جو ان ٹولیوں کے ساتھ ہو گئے اور کچھ مہاجر زادے بھی اس کے ذمہ دار ہیں جنہوں نے اس سلسلہ میں اعانت کی۔

بڑے بڑے مہاجر اور انصار صحابہ اس حادثے میں تین مختلف خیال کے تھے، زیادہ تر تو ایسے تھے جو صورتِ حال دیکھتے، رنجیدہ ہوتے، اصلاح کا ارادہ کرتے لیکن کچھ بن نہ پڑتی اور پھر کوتاہی یا بے نیازی سے نہیں بلکہ مجبوری اور بے چارگی سے خاموشی اختیار کر لیتے، کچھ صحابہ ایسے تھے جن پر معاملات اچھی طرح کھل نہ سکے انھوں نے خیریت اسی میں دیکھی کہ فتنے سے دور گوشۂ عافیت میں جا بیٹھیں اور غیر جانب دار رہیں ان تک اللہ کے رسول کی وہ حدیثیں پہنچی تھیں جن میں فتنوں سے ڈرایا اور ان سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے، چنانچہ کچھ تو خانہ نشین ہو گئے اور بعضوں نے مدینہ کی سکونت چھوڑ دی کہ اپنا دین اپنے ساتھ لئے لوگوں سے دور رہیں کچھ صحابہ ایسے تھے جنہوں نے نہ گوشۂ عافیت میں جانا پسند کیا اور نہ اپنے کو بے چارگی کے حوالے کرنا بلکہ وہ حضرت عثمانؓ اور ان کے مخالفین کے درمیان میں کھڑے ہو گئے، بعضوں نے خلیفہ کی خیر خواہی کرتے ہوئے کوشش کی کہ باغیوں اور خلیفہ میں مصالحت کرا دیں اور بعضوں نے حضرت عثمانؓ سے شدید اختلاف کیا اور ان سے اپنی انتہائی ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے ان کے خلاف لوگوں کو ابھارا، ان سے دشمنی پر آمادہ کیا اور بعضوں نے ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جس کا مطلب کم سے کم یہ نکلتا ہے کہ انھوں نے نہ باغیوں کو برا سمجھا اور نہ ان کو مقابلہ کرنے سے روکا۔

پھر جب حضرت عثمانؓ قتل ہو گئے تو اکثر صحابہ بری طرح متاثر ہوئے کہ وہ خلیفہ کی کچھ مدد نہ کر سکے، اب انھوں نے مستقبل پر غور کیا اور تہیّہ کر لیا کہ اپنے معاملات اور آنے والے واقعات کا مقابلہ کریں گے، گوشۂ عافیت میں چلے جانے والوں نے کنارہ کشی میں اور شدت پیدا کر لی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اپنی روش پر قایم رہے گناہ میں شرکت نہیں کی اور فتنے سے بچا لئے گئے، اب رہے دوسرے حضرات تو وہ انتظار کرنے لگے کہ لوگ کیا کرتے ہیں اپنے دین پر اعتماد کرتے ہیں یا کسی لیڈر کی پناہ لیتے ہیں اور مسلمانوں کا کوئی مقررہ نظام محفوظ شکل میں یا تحریری صورت میں تو تھا نہیں جس کے مطابق منصب خلافت جب وہ خالی ہو، پُر کر لیا کریں وہ تو ایسے مواقع پر جس طرح بن پڑتی اس خلا کو پُر کر لیا کرتے تھے۔

آپ کو معلوم ہے کہ صدیق اکبرؓ کی بیعت کس طرح ہوئی آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ فاروق اعظمؓ کس طرح اپنی بیعت کو ایک اتفاقی معاملہ فرماتے ہیں جس کے ذریعے اللہ نے مسلمانوں کو فتنے سے بچا لیا، آپ سے یہ بھی مخفی نہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ سے اور مسلمانوں سے ایک بات کہی اور مسلمانوں نے اس کو مان لیا، نہ کسی کو ناگوار ہوئی نہ کسی نے جھگڑا کیا، مہاجرین میں سے بعضوں نے خود صدیق اکبرؓ سے کچھ لے دے کرنا چاہی لیکن آپ نے ان کو ایسا جواب دیا جس سے وہ مطمئن ہو گئے، اس کا بھی آپ کو پتہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے کسی کو کوئی ہدایت نہیں کی بلکہ اس کے لئے چھ مہاجروں کی ایک مجلس شوریٰ بنا دی جن سے اللہ کے رسولؐ زندگی بھر راضی رہے، ان میں سے حضرت عثمانؓ کا انتخاب ہوا جس سے کسی نے اختلاف نہیں کیا، پھر حضرت عثمانؓ نے بھی کسی کے لئے کوئی ہدایت نہیں کی اور اگر وہ فرماتے بھی تو لوگ ان کی بات نہیں مانتے اس لئے کہ وہ اُن سے، اُن کے حاشیہ نشینوں سے اور ان کے گورنروں سے واقعات کی بناء پر ناراض تھے۔

پھر یہ بھی پیش نظر رہے کہ حضرت عمرؓ نے جن چھ صحابہ کو باہمی مشورہ کی ہدایت کی تھی حضرت عثمانؓ کے بعد وہ چار ہی رہ گئے تھے اس لئے کہ عبد الرحمٰن بن عوفؓ کا عثمانی خلافت کے دوران ہی میں انتقال ہو چکا تھا بس سعد ابن ابی وقاصؓ، زبیر ابن العوامؓ، طلحہ بن عبید اللہؓ اور علیؓ

ابن ابی طالبؓ باقی رہ گئے تھے، ان چاروں میں بھی سعد ابن ابی وقاصؓ نے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی لہٰذا کل تین ہی رہ گئے تھے، مزید برآں یہ بھی ملحوظ رہے کہ سابق خلفاء کی بیعت کرنے والے بہت سے صحابہ اب مدینہ منورہ میں معاملے کے وقت موجود نہ تھے کچھ لوگ تو ارتداد کی لڑائیوں، اور روم و فارس کی فتوحات میں شہید ہو چکے تھے اور کچھ سرحدوں پر اللہ کی رحمت کو پہنچ گئے تھے ایک جماعت جس میں جہاد کی طاقت تھی سرحدوں پر خیمہ زن تھی اور جن میں جہاد کی طاقت نہ تھی وہ نئے نئے شہروں میں بس گئے تھے پس حضرت عثمانؓ کے حادثے کے موقع پر مہاجر اور انصار کی جو جماعت موجود تھی وہ مدینہ کی اُس جماعت جیسی نہ تھی جو تینوں خُلفا کی بیعت کے موقع پر حاضر تھی۔
پھر علیؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ میں بھی باہم اتحادِ خیال نہ تھا، مظلوم خلیفہ کے ساتھ ہر ایک کا طرزِ عمل الگ تھا، اور اسبابِ قتل پر ہر ایک کی رائے دوسرے سے جدا تھی۔

حضرت علیؓ نے لوگوں کو بغاوت اور فساد سے روکنے کی امکانی کوشش کی جیسا کہ اس کتاب کے پہلے حصہ میں گذرا انھوں نے باغیوں اور حضرت عثمانؓ کے درمیان گفت و شنید کا فرض انجام دیا، باغیوں کو مدینہ سے واپس کیا بعد میں ایک مرتبہ اور بیچ میں پڑے اور حضرت عثمانؓ کو راضی کر لیا، پھر جب باغی بلا اطلاع مدینہ میں گھُس آئے اور حضرت علیؓ ان کو نکال باہر کرنے سے مایوس ہو گئے تو چاہا کہ حضرت عثمانؓ کی حمایت میں کھڑے ہو جائیں لیکن ایسا نہ کر سکے، پھر سخت محاصرے کے زمانے میں جب حضرت عثمانؓ بہت پیاسے تھے آپ نے کوشش کی کہ میٹھا پانی آپ تک پہنچا دیں۔

زبیرؓ نے نہ تو باغیوں کو روکنے میں نمایاں حصہ لیا اور نہ مخالفوں کو ابھارنے اور آمادہ کرنے میں قابلِ ذکر سرگرمی دکھائی البتہ وہ موقع کا انتظار کرتے رہے، طبیعت ان کی باغیوں کے ساتھ تھی، شاید وہ یہ خیال کرتے تھے کہ نوبت یہاں تک نہیں پہنچے گی۔

اب رہے طلحہؓ تو وہ کھلم کھلا باغیوں کی طرف جھکے ہوئے تھے باغیوں کو علانیہ بھڑکاتے تھے ان کی ایک جماعت کو اپنا گرویدہ بنا رہے تھے حضرت عثمانؓ نے اس کی شکایت کھلے طور

پر بھی کی اور بصیغۂ راز بھی بار بار اظہار کیا، راویوں کا بیان ہے کہ اس سلسلے میں حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ سے امداد چاہی، چنانچہ آپ طلحہ کے پاس گئے اور دیکھا کہ باغیوں کا ایک بڑا گروہ وہاں جمع ہے، حضرت علیؓ نے کوشش کی کہ طلحہ اپنی یہ روش چھوڑ دیں لیکن وہ باز نہ آئے، تب حضرت علیؓ ان کے پاس سے لوٹ کر بیت المال آئے اور جو کچھ اس میں تھا نکال کر لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر طلحہ کے ساتھی ان کے پاس سے اٹھ کھڑے ہوئے، حضرت علیؓ کی اس کارروائی سے حضرت عثمانؓ خوش تھے۔

راویوں کا خیال ہے کہ یہ دیکھ کر طلحہ حضرت عثمانؓ کے پاس آئے اور معذرت کرنے لگے، حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ یہ حاضری معذرت اور ندامت کی نہیں بلکہ ناکامی اور شکست کی ہے طلحہ تجھ سے خدا حساب لے گا۔

بات جو کچھ بھی رہی ہو بہرحال حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد مدینے میں یہ تینوں منتظر تھے کہ لوگ کیا کرتے ہیں اور حالت یہ تھی کہ پوری آبادی پر باغیوں نے خوف و ہراس کا وہ عالم طاری کر دیا تھا کہ مظلوم خلیفہ کی لاش رات کی تاریکی میں لوگوں سے بہت چھپا کر دفن کی جا سکی۔

حضرت عثمانؓ کے بعد امام کی بیعت کے بارے میں راویوں کا اختلاف ہے ایک گروہ کا خیال ہے کہ قتل کے بعد ہی حضرت علیؓ کے لئے بیعت لی گئی لیکن یہ واقعہ نہیں ہے، اس مبہوت کر دینے والی شورش اور بغاوت کے پیش نظر واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں کئی دن تک لوگوں نے اس طرح گذارا کہ ان کا کوئی امام نہ تھا ان دنوں ان کے معاملات کی لگام بغاوت کے ایک لیڈر غافقی کے ہاتھ میں تھی۔

خلیفہ سے فرصت پا لینے کے بعد باغی حیران تھے، وہ جانتے تھے کہ لوگوں کے لئے ایک امام کی ضرورت ہے اور اس امام کی بیعت جس قدر جلد ممکن ہو کر لینی چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت عثمانؓ کے گورنر ان پر قابض ہو جائیں اور ان سے جی بھر کر انتقام لیں اور معاویہ نہ کہیں اپنی فوج بھیج کر مدینہ اپنے اقتدار میں کر لیں اور پھر باغیوں کو ان کے کئے کی سزا دے دیں، باغی یہ بھی

جانتے تھے کہ ان میں سے کوئی بھی مسلمانوں کا امام نہیں بن سکتا، اس لئے کہ امامت کا معاملہ مہاجرین اور انصار کے ہاتھ میں ہے وہی قریش کے کسی فرد کو چن کر بیعت کرتے ہیں۔

پھر ان کی خواہشیں بھی مختلف تھیں، مصری حضرت علیؓ کو چاہتے تھے کوفہ کے لوگ زبیرؓ کے ساتھی تھے، بصرہ کے باشندے طلحہؓ کے طرفدار تھے۔ ان میں سے ہر ٹولی اپنے اپنے لیڈروں کے ہاں آتی جاتی تھی لیکن تینوں لیڈر اپنی جماعت کی طرف سے پیش کردہ امامت قبول کرنے سے انکار کرتے تھے، بالآخر باغیوں کو یقین ہو گیا کہ وہ اکیلے امام کا تقرر نہیں کر سکتے اور اس سلسلے میں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ مہاجر اور انصار کا تعاون حاصل کریں جو ان تینوں میں کسی کو پسند کریں اور اس سے اس منصب کے قبول کرنے پر اصرار کریں تب یہ ان کے اصرار کی تائید کریں یہاں تک کہ وہ راضی ہو جائے۔ چنانچہ یہ باغی صحابہ کے گھروں کے چکر لگانے لگے اور ان سے اصرار کے ساتھ درخواست کرنے لگے کہ امت کے لئے ایک امام چن دیجئے، مہاجر اور انصار نے دیکھا کہ یہ کام تو بہرحال کرنا ہے، پس انھوں نے خود سوچا اور آپس میں تبادلۂ خیالات کیا، اندازہ یہ ہوا کہ عام رجحان حضرت علیؓ کی طرف ہے اور لوگ ان کو طلحہؓ اور زبیرؓ دونوں پر مقدم خیال کرتے ہیں۔

اس طرح انصار اور مہاجرین نے حضرت علیؓ کو خلافت کا منصب پیش کیا اور ان سے قبول کر لینے پر اصرار بھی کیا، پھر باغیوں نے اس اصرار کی تائید کر دی، حضرت علیؓ نے انکار کرنا چاہا لیکن انھیں انکار کی کوئی صورت نظر نہیں آئی، باغیوں کے پیش کرنے پر آپ نے ضرور انکار کیا تھا لیکن اب جب کہ مہاجر اور انصار بھی پیش کر رہے ہیں اور سابق خلفا کی طرح کرنا چاہتے ہیں تو انکار کی کوئی وجہ نہیں رہی چنانچہ آپ نے ان کی درخواست قبول کر لی، اور سابقہ روایت کے مطابق منبر نبوی پر جا بیٹھے، اور لوگ آکر بیعت کرنے لگے، ہاں چند آدمیوں نے انکار کیا اور حضرت علیؓ نے ان سے اصرار بھی نہیں کیا اور نہ باغیوں کو اجازت دی کہ ان کو مجبور کریں، ان چند آدمیوں میں ایک سعد ابن ابی وقاص بھی ہیں جو مجلس شوریٰ کے

ایک رکن تھے انھوں نے انکار کرتے ہوئے حضرت علیؓ سے کہا "میری طرف سے آپ مطمئن رہیئے"، حضرت علیؓ نے ان کو اس کی آزادی دے دی، انکار کرنے والوں میں دوسرے عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ حضرت علیؓ نے ان سے امن پسندی اور لوگوں کے معاملات میں دخل درمعقولات نہ کرنے کی ضمانت طلب کی عبداللہ ابن عمرؓ نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا، حضرت علیؓ نے کہا چھوٹے سے بڑے ہو گئے لیکن میں نے ہمیشہ تم کو ناشائستہ پایا اس کے بعد فرمایا اسے جانے دو میں خود اس کا ضامن ہوں، گوشہ نشینوں کی ایک جماعت نے بھی بیعت سے انکار کیا تھا حضرت علیؓ نے ان کو بھی مجبور کرنا نہیں چاہا اور نہ اُن پر کسی زیادتی کے روادار ہوئے طلحہؓ اور زبیرؓ نے بھی بیعت نہیں کی تھی لیکن باغیوں نے ان کو مجبور کیا اور حضرت علیؓ نے بھی ان دونوں کو سعد ابن ابی وقاصؓ، عبداللہ ابن عمرؓ وغیرہ کی طرح معاف نہیں کر دیا اس لئے کہ باغیوں کی طرح ان کو حضرت علیؓ بھی خوب جانتے تھے، ان کو معلوم تھا کہ طلحہؓ حضرت عثمانؓ کے کٹر مخالفوں میں سے ہیں اور خود خلیفہ بننے کا بھی حوصلہ رکھتے ہیں، وہ جانتے تھے کہ زبیرؓ نے حضرت عثمانؓ کی مخالفت پر کسی کو اکسایا نہیں لیکن کسی باغی کو روکا بھی نہیں اور پھر خلافت کی تمنا میں طلحہؓ سے کم نہیں اس لئے ان کو بیعت سے معاف نہیں کیا کہ جس قدر بھی ہو سکے ان کو پابند کر لیں، بعض روایات کے مطابق حضرت علیؓ کی بیعت حضرت عثمانؓ کے قتل کے پانچ دن بعد ہوئی اور بعض روایتوں میں آٹھ دن ہے، اس کے بعد یہ بات عام ہو گئی کہ بصرہ، کوفہ اور مصر کی سرحدوں اور حجاز پر حضرت علیؓ کی سیادت قایم ہو گئی۔

حضرت علیؓ کے لئے ایک غور طلب اور پیچیدہ مسئلہ شام کا تھا، صورتِ حال یہ تھی کہ ایک تو شام بغاوت سے الگ رہا، دوسرے اس کی زمام حکومت حضرتِ عثمانؓ کے چچا زاد بھائی معاویہؓ کے ہاتھ میں تھی، آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ شام اور معاویہؓ کے ساتھ حضرتِ علیؓ کا طرز عمل کیسا رہا۔ لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ مسلمانوں کے امام ہو گئے مدینے میں جو مہاجر اور انصار موجود تھے انھوں نے آپ کی بیعت کر لی، سرحدوں کی طرف سے اُن

باغیوں نے آپ کی بیعت کی جو اس وقت مدینہ میں موجود تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ دو
خطرناک مشکلوں میں سے ایک یعنے خلافت اور خلیفہ کی مشکل کا خاتمہ ہو گیا دوسرے لفظوں
میں یوں کہیئے کہ حضرت علیؓ اور عام لوگوں پر یہ واضح ہو گیا کہ مصیبت دور ہو گئی اور اب اس
کے بعد تمام معاملات میں امن، خوش گواری اور استقلال پیدا ہو جائے گا۔

نئے امام کے لئے ضروری تھا کہ اب دوسری خطرناک مشکل کی طرف متوجہ ہو، یہ دوسری
مشکل مقتول امام کا مسئلہ ہے، نئے امام کا فرض ہے کہ وہ مقتول امام کے خون اور اس کے
قاتلوں کے بارے میں اللہ کے فرمان اور دین کے حکم کا اعلان کرے، اگر مقتول امام ظالم تھا
تب تو بدلے کی اور قاتلوں سے قصاص کی کوئی بات نہیں، لیکن اگر مظلوم تھا تو جدید امام
کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس کا بدلا لے اور قاتلوں پر قصاص کا حکم جاری کرے جو اللہ کا فرمان ہے،

مہاجر اور انصار صحابہ کی رائے تھی کہ حضرت عثمانؓ مظلوم تھے اور امام کے لئے اس کے
سوا چارہ کار نہیں کہ وہ اس خون کا بدلا لے اور اگر حقوق کی پامالی کی جاتی رہی، خوں ریزی
ہوتی رہی اور حدود کا اجرا عمل میں نہیں آیا تو دین کے قیام کی کوئی صورت نہ ہو گی مقتول اگر کوئی
معمولی انسان ہوتا تب بھی یہ سب کچھ ہونا ضروری ہے چہ جائیکہ وہ امام اور مسلمانوں کا خلیفہ
ہو، مہاجر اور انصار کہا کرتے تھے ـــ عثمان کے قاتلوں سے اگر ہم قصاص نہ لیں تو لوگ
کس طرح اس بات سے رک سکیں گے کہ جس امام پر غصہ آیا اس کے خلاف بغاوت کر دی اور
پھر اس کو قتل کر دیا، یہی بات لوگوں نے حضرت علیؓ سے کہی، آپ نے سنا اور ان کے خیال کی
تصدیق کی اس کے بعد اُن کے سامنے حقیقت کی یہ تصویر پیش کی کہ جہاں تک اقتدار کا سوال
ہے بلا شک وہ بیعت کے ذریعے میری طرف منتقل ہو چکا ہے، لیکن عملاً تو وہ اب تک
باغیوں کے ہاتھ میں ہے آج شہر پر انہیں کا فوجی قبضہ ہے خلیفہ اور صحابہ بے بس ہیں وہ شہر
اور شہریوں کے بارے میں جیسا بھی چاہیں فیصلہ کر سکتے ہیں ایسی حالت میں اچھا یہ ہے کہ
کچھ دنوں مہلت اور معقولیت کا سہارا لیا جائے تا آنکہ معاملات سیدھے ہو جائیں اور خلیفہ

بلا اقتدار مستحکم ہو جائے اس کے بعد اس مسئلے پر نظر ڈالی جائے گی اور کتاب و سنت کی روشنی میں اللہ اور رسولؐ کے احکام کا اجرار کیا جائے گا۔

صحابہ تو حضرت علیؓ کے نقطۂ نظر سے مطمئن ہو گئے لیکن باغیوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ انھوں نے خلیفہ کا خون اس لئے کیا ہے کہ وہ ظالم تھا جس کے لئے بدلے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ امام کو اس کے عوض کسی کی جان لینی چاہیئے۔

مگر اس کے باوجود حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے خون کی تحقیق کا ارادہ کیا لیکن کارروائی کی تکمیل کی صورت نہ نکل سکی ایک جماعت بضد تھی کہ حضرت عثمانؓ کے خون میں محمد ابن ابو بکر کا بھی ہاتھ ہے یہ محمد ابن ابو بکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کے صاحبزادے ہیں ام المومنین حضرت عائشہؓ کے بھائی اور خود حضرت علیؓ کے سوتیلے بیٹے ہیں، حضرت ابو بکرؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ نے ان کی والدہ سے نکاح کر لیا تھا۔ حضرت علیؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم عثمانؓ کے قاتل ہو، انھوں نے انکار کیا اور حضرت عثمانؓ کی بیوی نائلہ بنت فرافصہ نے ان کی تصدیق کر دی لیکن جیسے ہی باغیوں کو بھنک لگی کہ حضرت علیؓ تحقیقات کر رہے ہیں انھوں نے اپنے اتحاد اور غصے کا اظہار کیا، جس کے بعد حضرت علیؓ نے وہ روش اختیار کی جس کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں اور موقع کا انتظار کرنے لگے آپ کے ساتھ مدینہ کے عام صحابہ بھی منتظر رہے۔

شاید ناظرین کو یاد ہو گا کہ تخت خلافت پر بیٹھتے ہی حضرت عثمانؓ کو جس قسم کا الجھاؤ پیش آیا تھا حضرت علیؓ کو بھی اپنی خلافت کے آغاز میں اسی قسم کی ایک پیچیدگی کا سامنا ہوا، حضرت عثمانؓ کو سب سے پہلی مشکل عبید اللہ ابن عمرؓ کی پیش آئی جنھوں نے ہرمزان کو اس تہمت پر قتل کر دیا تھا کہ اس نے ان کے باپ کے قتل پر آمادہ کیا تھا لیکن عبید اللہ نے یہ خون بلا ثبوت اور بلا دلیل کیا تھا ان کے پاس اس کے لئے قاضی کا کوئی فیصلہ نہ تھا۔

مسلمانوں کی ایک جماعت کا خیال تھا جس میں حضرت علیؓ بھی شامل ہیں کہ عبید اللہ

پر قتل کی حد جاری ہونی چاہیئے اور ایک دوسری جماعت پر یہ بات بڑی گراں تھی کہ حضرت عثمانؓ اپنی خلافت کا آغاز فاروق اعظمؓ کے صاحبزادے کے قتل سے کریں، حضرت عثمانؓ نے عبید اللہ کو معاف کر دیا اس لیئے کہ ہرمزان کا کوئی ولی نہ تھا جو خون کا دعویٰ کرتا البتہ اس صورت میں خلیفہ ولی ہوتا ہے جسے معاف کر دینے کا بھی حق ہے اس وقت حضرت علیؓ اور بہت سے مسلمانوں نے حضرت عثمانؓ کے اس فیصلے کو تسلیم نہیں کیا، اس کو ایک ظلم، ایک خونِ ناحق اور اللہ کے حدود میں ایک تجاوز خیال کیا، حضرت علیؓ عثمانؓ کی عہد کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں اس فاسق کو پا جاؤں گا تو ہرمزان کے قتل کے بدلے اس کو ختم کر دوں گا۔

حضرت عثمانؓ کے سامنے مسلمانوں کے ایک خلیفہ کا لڑکا ناحق خون کے الزام میں پیش ہوتا ہے حضرت عثمانؓ اس کو معاف کر دیتے ہیں اور اس معافی پر مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے

حضرت علیؓ کے سامنے مسلمانوں کے ایک دوسرے خلیفہ کا لڑکا قتل کے الزام میں پیش ہوتا ہے اور قتل بھی کس کا، رعایا میں سے کسی پناہ گزیں غیر ملکی کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے ایک امام کا لیکن علیؓ محمد ابن ابو بکر کو معاف نہیں کرتے اس کی تحقیقات کرتے ہیں جس میں واضح ہو جاتا ہے کہ وہ قاتل نہیں ہے اس کے بعد واقعات اور حالات مزید تحقیقات کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں اور قاتلوں کے حق میں دین کا حکم جاری نہیں ہوتے پاتا۔

اور واقعہ تو یہ ہے کہ محمد بن ابو بکر نے اپنے ہاتھ سے حضرت عثمانؓ کا خون نہیں کیا بلکہ وہ اوروں کی طرح دیوار پر چڑھ کر گھر میں اُترے اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے قتل سے محمد بن ابو بکر کا گہرا یا ہلکا تعلق ضرور تھا لیکن اس خونی حادثے سے جن لوگوں کا پورا پورا تعلق تھا وہ اتنے زیادہ اور اتنے قوی اور اتنے خوفناک تھے جن پر قابو نہیں پایا جا سکتا تھا یا جدید امام ان سے قصاص نہیں لے سکتا تھا، اس کے بعد تو جو واقعات پیش آئے آپ آگے پڑھیں گے کہ ان کی وجہ سے مقتول خلیفہ کا قضیہ مشکل و پیچیدہ ہی ہوتا گیا۔

حضرت علیؓ کی خلافت کا استقبال

جس خوشنودی، خوشدلی اور سکونِ قلب کے ساتھ بڑھتی ہوئی امنگوں اور شگفتہ امیدوں کے ماحول میں مسلمانوں نے حضرتِ عثمانؓ کی خلافت کا استقبال کیا تھا، وہ بات حضرت علیؓ کی خلافت کے استقبال میں نہ تھی، یہاں تو سکتے کا عالم تھا اور بے چینی، خوف و ہراس تھا اور اضطراب، لوگوں میں کشاکش تھی اور معاملات میں پیچیدگی، اس لئے نہیں کہ حضرت علیؓ میں کوئی ایسی بات تھی جو اس فضا کا باعث بنی بلکہ لوگوں کی زندگی کا ماحول ہی ایسا تھا جس نے ان میں یہ کیفیت اضطراری طور پر پیدا کر دی تھی، حضرت عثمانؓ خلافت کے تخت پر ایک ایسے خلیفہ کے بعد بیٹھے جو بڑا صاحب اقتدار اور سخت گیر تھا انصاف کی خاطر اس نے لوگوں کو جن پُرخار اور دشوار گذار راہوں پر چلایا اس کی تاب وہی لوگ لا سکتے تھے جو ارادے کے بڑے پکے اور جن میں صبر اور برداشت کا غیر معمولی حوصلہ ہو، اُس نے لوگوں کے معاملے میں بڑی شدت برتی ہم نے اس کتاب کے پہلے حصے میں بتایا ہے کہ اللہ کے معاملے میں حضرت عمرؓ عموماً مسلمانوں کے لئے اور خاص طور پر قریش کے لئے کتنے سخت تھے اور کس طرح ان کو خطرہ تھا کہ قریش کہیں اپنے لئے یا دوسروں کے لئے فتنے کا باعث نہ بن جائیں، لیکن حضرت عثمانؓ جب خلیفہ ہوئے تو انھوں نے سختی کی جگہ نرمی، گرفت کی جگہ چشم پوشی، تنگی کی جگہ فراخی سے کام لیا، مشقت کے بدلے راحت پہنچائی، وظیفوں میں اضافہ کر دیا، دشواریوں کی جگہ آسانیاں فراہم کر دیں، لوگوں نے ان کی خلافت کے ابتدائی برسوں میں اُن کو حضرت عمرؓ سے بڑھ کر جانا۔

حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کا دور آیا انھوں نے مقررہ وظیفوں میں کچھ اضافہ نہیں کیا، نہ مالِ غنیمت میں سے کچھ دیا، نہ لوگوں کے کاموں میں کوئی آسانی پیدا کی اور کرنا چاہا تو یہ کہ حضرت عمرؓ کا راستہ جہاں سے چھوٹ گیا ہے وہاں سے پھر چلنا شروع کیا جائے۔

حضرت عمرؓ کے بعد لوگ امن اطمینان سے تھے ہاں اُن کے امن و اطمینان میں ایک

ہلکے رنج کی آمیزش ضرور ہو گئی تھی اور وہ مغموم سے تھے کہ یہ نیک اور متقی امام دھوکہ دے کر اُن سے اُچک لیا گیا، یہ حادثہ مہاجر اور انصار کی موجودگی میں نہیں ہوا اور نہ یہ شہروں اور سرحدوں کے باشندوں اور فوجیوں کی سازش کا نتیجہ تھا، پس یہ سانحہ بیک وقت شدید تھا اور آسان بھی، جس کی بلیغ ترین تعبیر حضرت عمرؓ نے خنجر کا مہلک زخم لگ جانے پر فرمائی، آپ نے مرتے ہوئے قرآن مجید کی آیت پڑھی۔ وکان امر اللّٰہ قدراً مقدوراً۔ یعنی، اللہ کا حکم پہلے سے تجویز کیا ہوا ہوتا ہے۔

پس حضرت عمرؓ کی وفات مقدرات میں سے ایک بات تھی نہ کوئی ٹولی حملہ آور ہو کر آپ پر ٹوٹ پڑی اور نہ مسلمانوں کی کسی جماعت نے آپ کے خلاف کوئی سازش کی بلکہ ایک معمولی مکار نے دھوکا دیا جس میں موت کے سوا چارۂ کار نہ تھا۔

مگر حضرت عثمانؓ کا خون، تو ایک بے لگام بغاوت اور ایک ایسے فتنے کا نتیجہ تھا جس میں لوگ اپنی تمیز کھو چکے تھے انھیں یہ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ آگے بڑھ رہے ہیں یا پیچھے ہٹ رہے ہیں۔

حضرت عثمانؓ کا خون اس خوف و ہراس کا نتیجہ تھا جو ایک عرصہ تک پورے مدینہ پر چھایا رہا اور بعد میں دور دور تک پہنچا، جس سے لوگ گھبرا اُٹھے، والیانِ ریاست یعنے صوبے کے حاکموں نے فوجیں تیار کیں سرحدوں پر بھیجنے کے لئے نہیں جہاں بھیجنے کی ضرورت تھی بلکہ دارالحکومت مدینہ منورہ کے لئے تاکہ وہاں امن بحال کیا جائے اور خوف و ہراس کا خاتمہ ہو اور خلیفہ کو محاصرے سے نکالا جائے لیکن ابھی یہ فوجیں دارالحکومت تک پہنچنے بھی نہ پائی تھیں کہ خلیفہ کو قتل کر دیا گیا، فوجیں اپنے اپنے مقامات پر واپس ہو گئیں اور مدینہ میں بدستور خوف و دہشت اور بے چینی کا دور دورہ رہا۔

حج کے زمانے میں بغاوت کی خبریں حاجیوں تک پہنچ چکی تھیں عبداللہ بن عباسؓ نے اُن کو حضرت عثمانؓ کا وہ اعلان سنایا تھا جس میں آپ نے ظلم و زیادتی سے اپنے کو بری بتایا تھا اور باغیوں پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے خلیفہ سے بغاوت کر رہے ہیں، لوگوں نے خوف و ہراس کی حالت میں حج کے احکام ادا کئے اور اضطراب و پریشانی کے

کے عالم میں واپس آکر ہم وطنوں سے مدینہ کے پُرخطر حالات کا بیان کیا۔

ان حالات میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ حضرت علیؓ کی خلافت کا استقبال مسلمانوں نے اُداس چہروں اور بے چینی بھرے دلوں سے کیا، جب ان کی پریشانی اور بے اطمینانی یہ دیکھ کر بڑھتی جارہی تھی کہ قاتل باغی ابھی مدینے ہی میں ہیں اور قبضہ جمائے بیٹھے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جدید خلیفہ اور اس کی بیعت کرنے والے مہاجر اور انصار، باغیوں کے ہاتھوں میں قیدی ہیں، چنانچہ حضرت علیؓ نے جب معلوم کرنا چاہا کہ خلیفۂ وقت پر شورش کے سبب کیا گذری اور کس طرح گذری تو وہ اس کی تحقیقات کرنے پر قدرت نہ پا سکے، علاوہ ازیں مدینہ کے لوگ حضرت عثمانؓ کے گورنروں کو خوب جانتے تھے، اُن کا اندازہ تھا کہ سب نہیں تو بعض گورنر ضرور اس نئی خلافت سے اپنی ناگواری کا اظہار کر کے خلیفہ سے جھگڑا کریں گے، خاص طور پر ان کو معاویہؓ بن ابی سفیان سے ڈر تھا کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ مقتول خلیفہ سے معاویہؓ کی رشتہ داری ہے ان کو اس بات کا بھی علم تھا کہ شامی معاویہؓ کے فرماں بردار ہیں کیوں کہ وہ ایک عرصۂ دراز فاروقِ اعظمؓ کے زمانے سے ان کے حاکم ہیں، مدینہ والے جانتے تھے کہ بنی اُمیّہ میں معاویہؓ کا پوزیشن کتنا اونچا ہے اور یہ کہ بنی اُمیّہ اور بنی ہاشم میں ظہورِ اسلام سے بھی پہلے کی قدیم عداوت ہے، نبیؐ اور ان کے صحابہ جب اپنا نیا دین لے کر مدینہ کی طرف نکلے تو قریش کی قیادت ابوسفیان نے کی، جب بدر کے معرکے میں قریشی سرداروں کا خاتمہ ہو چکا تھا تو اُحد کے معرکے میں قریش کے ساتھ ابوسفیان ہی آئے اور بدر کے مشرک مقتولوں کا بدلہ لیا، ابوسفیان کی بیوی ہند نے جو معاویہؓ کی ماں ہے وحشیؒ کو اس خوشی میں آزاد کر دیا کہ اس نے حمزہؓ کو قتل کر دیا، ہند حمزہؓ کے قتل کے بعد میدان میں جاتی ہے، پڑی ہوئی لاشوں میں حمزہؓ کو تلاش کرتی ہے جب ان کی لاش پا جاتی ہے تو پیٹ چاک کر کے ان کا کلیجہ نکالتی ہے اور اس کو چباتی ہے۔ خندق کے معرکے میں ابوسفیان ہی قریش کے قائد تھے، انھوں نے ہی عربوں کو نبیؐ اور صحابہ کی مخالفت میں یکجا کیا، یہودیوں کو اس طرح

لہ ایک حبشی غلام کا نام جس سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر حمزہؓ کو قتل کر دے گا تو آزاد کر دیا جائے گا۔

اکسایا کہ انھوں نے وہ معاہدہ توڑ دیا جو نبیؐ اور صحابہ کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ابو سفیان ہی تھے جو قریش کو نبیؐ کے مدِ مقابل بنائے رکھنے کی تدبیریں اور آنحضرتؐ کے خلاف مکاریاں اور چالبازیاں کرتے رہے یہاں تک کہ فتح مکہ کے دن آ گئے اور اس وقت اسلام قبول کیا جب مسلمان ہوئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

لوگ معاویہؓ کے متعلق جو کچھ چاہیں کہیں کہ وہ اسلام لانے کے بعد نبیؐ کے مقرب بن چکے تھے اُن کا شمار وحی کے کاتبوں میں ہے[1]، وہ مسلمان اور مخلص مسلمان تھے۔ وہ نبیؐ کے اور تینوں خلفاء کے ہمدرد اور خیر خواہ تھے ان تمام باتوں کے باوجود معاویہؓ بہرحال اُحد اور خندق کے معرکوں میں مشرکین کے قائد ابو سفیان کے بیٹے تھے وہ ہند کے لڑکے تھے جس کی حمزہؓ سے دشمنی کا یہ عالم کہ قتل کے بعد ان کی لاش کی تلاش کرے ان کا پیٹ چاک کر کے ان کا کلیجہ چبائے اور نبیؐ کو اپنے معزز چچا کے غم میں تقریباً بے ضبط کر دے۔

مسلمان، معاویہؓ اور ان کے جیسے آخر میں اسلام لانے والوں کو "امان یافتہ" کے خطاب سے یاد کیا کرتے تھے، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا تھا۔ جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو، تم سے کوئی بازپرس نہیں۔

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن جریر طبری لکھتے ہیں کہ۔ آنحضرت صلعم کی وحی علیؓ ابن ابی طالب اور عثمانؓ ابن عفان لکھا کرتے تھے اگر یہ غیر حاضر ہوتے تو وحی کی کتابت ابی ابن کعب اور زید بن ثابت کیا کرتے تھے، اور خالد بن سعید بن عاص اور معاویہ بن ابی سفیان آپ کی ذاتی ضروریات کے معاملات تحریر کرتے اور عبداللہ بن ارقم بن عبد یغوث اور علا بن عقبہ لوگوں کی ضروریات کے لئے کتابت کیا کرتے تھے اور زیادہ تر عبداللہ بن ارقم نے آنحضرت صلعم کی طرف سے بادشاہوں کو خطوط لکھے۔

اسی طرح ابن ابی حدید نہج البلاغہ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ معاویہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں میں سے ایک تھے لیکن ان کی کتابت کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کیا تھی؟ ارباب سیر محققین کا مسلک یہ ہے کہ۔ وحی کی کتابت تو علیؓ اور زیدؓ بن ثابت اور زید بن ارقمؓ کیا کرتے تھے اور حنظلہ بن ربیع تیمی اور معاویہؓ بن ابی سفیان بادشاہوں اور قبائل کے سرداروں کے نام آنحضرتؐ کی طرف سے خطوط لکھتے تھے اسی طرح یہ دونوں آپ کی ضروریات اور صدقات کے بارے میں آمد اور تقسیم بھی لکھا کرتے تھے۔ (الحسین مصنفہ علی جلال حسینی ص ٦١ مطبوعہ قاہرہ)۔

لوگ ان تمام باتوں کو جانتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ ہاشمی خلیفہ اور اموی امیر کے درمیان معاملات کا تصفیہ آسانی اور نرمی سے نہیں طے پا سکتا۔ لوگ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ نبیؐ کی وفات کے بعد قریش نے خلافت کا رخ بنی ہاشم کی طرف سے اس لئے پھیر دیا کہ نبوت اور خلافت قریش کے اس خاندان میں جمع کرنا امن و عافیت کے خلاف ہے اور نامناسب بھی، لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ اللہ نے بنی ہاشم کو نبوت سے نواز کر بہت کچھ خیر و برکت کا مالک بنا دیا ہے، اب ان کو اسی فضل و کرم پر قناعت کرنی چاہیئے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو صرف یہی خطرہ نہ تھا کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ میں جھگڑا ہوگا بلکہ وہ ڈرتے تھے کہ ایک طرف تو علیؓ اور بنی ہاشم کے تعلقات میں خرابی پیدا ہوگی دوسری طرف کل خاندانِ قریش باہم دست و گریباں ہوگا، اِن حالات میں وہ اپنے سامنے ایک ایسی زندگی دیکھ رہے تھے جس کی صبح و شام میں نہ امن و عافیت ہے اور نہ فراخی و خوش حالی، البتہ خوف ہے اور بے چینی، ان کو خطرہ تھا کہ کہیں یہ زندگی آگے چل کر انھیں مصیبت کے کسی بڑے دلدل میں نہ پھنسا دے، وہ جب غور کرتے انھیں نظر آتا کہ بڑے بڑے مہاجر اور انصار صحابہ کی ایک جماعت معاملات سے دور دور رہنا پسند کرتی ہے اور لوگوں کا ساتھ دینا نہیں چاہتی، چنانچہ وہ حضرت عثمانؓ کے معاملات سے الگ رہی، حضرت علیؓ کی بیعت میں حصہ نہیں لیا اور انتظار میں وقت گذارتی رہی، اس جماعت میں اچھی خاصی تعداد ایسے افراد کی تھی جو خوبی اور نیکی میں انتخاب تھے اور اس قابل کہ سب سے زیادہ ان کا احترام کیا جائے جیسے سعد ابن ابی وقاصؓ اللہ کی راہ میں سب سے پہلے تیر چلانے والے، فارس کے فاتح، نبیؐ جن لوگوں سے خوش ہو کر دنیا سے گئے ان میں کے ایک، فاروق اعظم کی مقرر کردہ مجلس شوریٰ کے رکن، اور جیسے عبداللہ ابن عمرؓ وہ مرد نیک جو مسلمانوں میں اختلافِ خیال کے باوجود اپنے دینی تقویٰ کی وجہ سے مقبول ہیں، محاسن کے دلدادہ، حرص و طمع سے دور اور مسلمانوں کے بلا رو رعایت خیر خواہ۔

(باقی)

عربی کی ایک قلمی کتاب سے
تاریخِ ہند پر نئی روشنی

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب استاد ادبیاتِ عربی دہلی یونیورسٹی)

(۵)

ہندی رِطل کو سیر کہتے ہیں، سیر ستّر مثقال[۱] کا ہوتا ہے اور ستّر مثقال مصر میں ایک سو دو اور دو تہائی درہم کے برابر ہیں. چالیس سیر کا ایک من ہوتا ہے، ہند کے لوگ (ناپنے کے) پیمانوں سے نا آشنا ہیں. نرخوں میں درمیانی نرخ گیہوں کا ہے، یعنی بارہ آنے کے ایک من، (یعنی لگ بھگ بیس سیر) جو آٹھ آنے کے ایک من، چاول چودہ آنے کے ایک من، چاول کی اعلیٰ قسموں کا نرخ اور زیادہ ہے، چنے آٹھ آنے کے دو[۲] من، گائے اور بھیڑ کے گوشت کا نرخ ایک ہے، دو[۲] آنے کا چھ[۶] سیر، بکری کا گوشت دو[۲] آنے کا چار سیر. بطخ یا مرغابی بارہ[۱۲] آنے کی ایک (فوٹو نسخہ - روپیہ کی ایک)، مرغی چھ آنے کی چار (فوٹو نسخہ - آٹھ آنے کی چار)، شکر آٹھ آنے کی پانچ سیر، مصری آٹھ آنے کی چار سیر، موٹی بکری کی عمدہ سری آٹھ آنے یا تنکہ میں، (۵/۲۴) گائے یا بھینس کی اچھی سری، روپیہ میں اور کبھی اس سے بھی سستی. ہند میں

---

[۱] اس حساب سے سیر لگ بھگ موجودہ آدھ سیر کے بقدر ہوا، رِطل کا وزن بھی اسی قدر ہوتا ہے.

لوگ گائے اور بھیڑ کا گوشت زیادہ کھاتے ہیں.

میں نے شیخ مبارک سے پوچھا کیا اس کی وجہ بکریوں کی کمی ہے؟ بولے : نہیں، بس عادت ہی ان دو جانوروں کا گوشت کھانے کی پڑ گئی ہے، بکریاں تو ہر گاؤں میں ہزاروں کے حساب سے ہیں. اعلیٰ قسم کی چار مرغیاں آٹھ آنے میں آتی ہیں. کبوتر، چڑیاں، اور مختلف قسم کے پرند کوڑیوں کے مول ہیں. ہر قسم کے چرند پرند کے شکار کی بہتات ہے. فنک نامی لومڑی (جس کا فر بہت عمدہ ہوتا ہے) اور گینڈا پایا جاتا ہے، گو افریقی ہاتھی گینڈے سے زیادہ بڑا اور شاندار ہوتا ہے۔

اہلِ ہند عادۃً سفید کپڑے پہنتے ہیں. پوری آستینوں کے ڈھیلے لمبے اونی کوٹ (جُوخ) اور اونی کپڑے جب باہر سے آتے ہیں تو خوب نفع سے بکتے ہیں. صرف عالم اور فقیر اون پوش ہوتے ہیں. سلطان، خان، ملک اور سارے فوجی افسر تاتاری ٹوپی (تشریات) پہنتے ہیں اور تکلا وات (؟) اور خُوارزمی قبائیں جو کمر پر چست ہوتی ہیں. بڑھیا لاس ریشم کے چھوٹے عمامے جن کی لمبائی دس بارہ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی سر پر باندھے جاتے ہیں.

شریف ناصر الدین محمد حسین کارمی المعروف بہ زُمُردِیؒ نے جنہوں نے دو بار ہند کا سفر کیا اور سلطان قُطبُ الدین کے مہمان رہے، مجھ سے بیان کیا کہ ہند کے لوگ زیادہ تر سفید کپڑے پہنتے ہیں، جمعہ کے دن اکثر لوگ ٹھاٹ دار لباس میں ملبوس ہوتے ہیں جن پر سونے کا کام ہوتا ہے. کچھ لوگوں کی آستینوں پر سونے کے تاروں سے نقش و نگار بنے ہوتے ہیں اور کچھ لوگوں کے مونڈھوں پر جیسا کہ مغلوں کی رسم ہے. قبائیں

مُرَلّبَۃُ الانباط (؟) ہوتی ہیں، اور ان پر جواہرات ٹکے ہوتے ہیں، ٹانکنے کے لئے زیادہ تر یاقوت و الماس استعمال کئے جاتے ہیں۔ لوگ لمبے بال رکھتے ہیں جیسا کہ مصر و شام میں فوج کا دستور ہے، لٹوں میں ریشمی مباف ڈالے جاتے ہیں۔ کمر میں سونے چاندی کے پٹکے، چرمی موزے اور ہمیزیں باندھی جاتی ہیں، تلوار صرف سفر کے دوران کمر سے باندھی جاتی ہے۔

وزیروں اور سکریٹریوں کا لباس فوجی افسروں کی طرح ہے، لیکن وہ پٹکے نہیں باندھتے، کچھ وزیر اور سکریٹری پگڑی کا پلّہ صوفیوں کی طرح آگے لٹکاتے ہیں۔ قاضیوں اور عالموں کا لباس ڈھیلی اچکن یا کوٹ ہوتا ہے عام لوگ قمیص (فرجیّات مقندرہ ؟) اور ڈھیلا کوٹ (دراریع) پہنتے ہیں۔

شبلی نے مجھ سے بیان کیا کہ دہلی کے باشندے ذہین اور خوش فکر ہوتے ہیں، فارسی و ہندی بے تکان بولتے ہیں، بعض اہلِ علم عربی میں بھی اچھے شعر کہتے ہیں، ان میں بہت سے درباری شاعر نہیں ہوتے لیکن سلطان کی شان میں قصیدے لکھتے ہیں اور سلطان ان کی آؤ بھگت کرتا ہے اور انعام دیتا ہے۔ شبلی نے کہا:- سلطان کے ایک سکریٹری کا دستور ہے کہ فتح یا دوسرے اہم موقع پر وہ قصیدہ لکھتا ہے سلطان کے حکم سے اس کے شعر گنے جاتے ہیں اور ہر شعر پر سکریٹری کو دس ہزار تنکے دئے جاتے ہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سلطان کو قصیدے کا کوئی حصہ یا شعر پسند آتا ہے اور وہ یہ سمجھ کر کہ اگر اس نے سکریٹری کے انعام میں کوئی خاص رقم متعین کردی تو اس کا حق پورا پورا ادا نہ ہوگا، وہ سکریٹری کو حکم دیتا ہے کہ خزانہ میں جائے اور جو چاہے لے لے۔ شبلی نے سلطان کی غیر معمولی داد و دہش اور فیاضی پر میری حیرانی دیکھی تو کہنے لگے کہ اس

کے باوجود سلطان حکومت کی آمدنی کا نصف بھی خرچ نہیں کرتا۔

یکتائے روزگار شیخ شمس اصفہانی نے مجھ سے بیان کیا: قطب الدین شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کیمیا سازی کو برحق سمجھتے تھے، میں نے ان سے بحث کی اور کیمیا سازی کو غلط قرار دیا۔ انھوں نے کہا: تمھیں معلوم ہے کہ سونے کی کتنی بڑی مقدار عمارتوں کو سجانے اور زیور بنانے میں ضائع ہو جاتی ہے، اور جتنا سونا ضائع ہوتا ہے اتنا کانوں سے نکلتا نہیں، مجھے تحقیق سے معلوم ہے کہ گذشتہ تین ہزار سال میں سونا ہندوستان سے باہر نہیں گیا، اور نہ وہ سونا جو باہر سے یہاں آیا پھر کبھی باہر گیا، سوداگر ساری دنیا سے خالص سونا لے کر یہاں آتے ہیں اور اُس سے عود، طبی جڑی بوٹیاں، اور قسم قسم کے گوند خریدتے ہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ سونا اگر بنایا نہ جاتا تو بالکل ختم ہو چکا ہوتا۔ ہمارے شیخ شہاب الدین نے کہا: قُطب الدین شیرازی کا یہ قول تو درست ہے کہ جو سونا باہر سے ہند آتا ہے وہ پھر لوٹ کر نہیں جاتا، لیکن ان کا یہ کہنا کہ کیمیا برحق ہے، صحیح نہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ محمدؐ بن تغلق کے کسی پیش رو سلطان نے کوئی علاقہ فتح کیا اور وہاں اتنا سونا ملا کہ تیرہ ہزار بیلوں پر لادا گیا۔ اہلِ ہند کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دولت جمع کرتے ہیں، کسی سے اگر پوچھا جاتا ہے کہ تمھارے پاس کتنی دولت ہے تو وہ کہتا ہے: یہ تو مجھے نہیں معلوم، ہاں میں دوسرا یا تیسرا پوتا ہوں جو اپنے دادا کی دولت جمع اس گولک میں کر رہا ہوں، مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کتنی ہے!"

اہلِ ہند روپیہ جمع کرنے کے لئے زمین میں کنوئیں یا غار کھودتے ہیں اور کچھ لوگ تالاب میں گولک بناتے ہیں جس میں صرف اشرفی ڈالنے کے لئے

سوراخ ہوتا ہے۔ ملاوٹ کے ڈر سے نہ تو وہ ڈھلا ہوا سونا لیتے ہیں، نہ سونے کے ٹکڑے اور نہ سونے کی چھڑیں بلکہ صرف دینار لیتے ہیں۔ ہند کے بعض جزیروں کے باشندوں کے پاس جب گھڑا بھر دینار ہو جاتے ہیں تو چھت پر ایک جھنڈا گاڑ دیتے ہیں، کسی کسی کی چھت پر دس اور اس سے بھی زیادہ جھنڈے لگے ہوتے ہیں۔

شیخ بُرہان الدین أبوبکر بن خَلّال محمد بَزّی نے مجھ سے بیان کیا: اس سلطان (محمدؒ بن تغلق) نے ایک علاقہ میں فوجیں بھیجیں جو حدودِ دیوگیر کے بالکل آخر میں واقع تھا، یہاں کے باشندے ہندو تھے اور ان کا ہر راجہ رائے (مسالک: را) کہلاتا تھا۔ شاہی فوج جب رائے سے نبرد آزما ہوئی تو اس نے سفیر بھیجے کہ بادشاہ سے کہہ دو کہ ہم سے جنگ نہ کرے اور بار برداری کے جتنے جانور چاہے بھیج دے میں سب کو سونے چاندی سے لاد دوں گا۔ کمانڈر ان چیف نے سلطان کو رائے کی عرضداشت سے مطلع کیا۔ سلطان نے جواب میں لکھا کہ رائے سے جنگ بند کر دو، اور اس کو امان دے کر اپنے ساتھ میرے پاس لے آؤ۔ رائے جب حاضر ہوا تو سلطان نے اس کی بے انتہا آؤ بھگت، اور عزت کی اور کہا: (دولت کے بارے میں) جو بات تم نے کی میں نے آج تک نہیں سنی، تمھارے پاس کتنی دولت ہے جو تم نے کہا کہ ہم جتنے جانور چاہیں بھیج دیں تم سب کو لاد دو گے؟ رائے: مجھ سے پہلے اس سلطنت میں سات رائے حکومت کر چکے ہیں اور ہر ایک نے ستّر ہزار باہین دولت جمع کی ہے اور یہ سب میرے پاس موجود ہے۔ راوی: باہین ایک خوب بڑا حوض ہوتا ہے جس میں چار طرف سے سیڑھیوں کے ذریعہ اُترتے ہیں؟ رائے کی یہ بات سن کر

سلطان حیران ہوا اور حکم دیا کہ اُس ساری دولت پر اُس کے نام
کی مُہر لگادی جائے۔ پھر سلطان نے رائے سے کہا کہ اپنی قلمرو میں
گورنر مقرر کر دے اور خود دہلی میں قیام کرے۔ سلطان نے اس کو
مسلمان ہونے کی بھی دعوت دی، لیکن اس نے انکار کر دیا، سلطان
نے اس کو اپنے مذہب پر رہنے دیا۔ رائے دہلی میں ٹھہر گیا اور اپنی
قلمرو میں گورنر مقرر کر دئے۔ سلطان نے اس کی شایانِ شان وظیفہ
جاری کر دیا اور (۵/ ۲۶) بہت سا روپیہ اس کے عزیزوں میں تقسیم کرنے
بھیجا تاکہ وہ اس کی رعایا بن جائیں۔ تہ خانوں پر اپنی مہر لگا کر سلطان
نے ان کو جوں کی توں رہنے دیا۔ اس قصہ کے راوی بُزرگ ہیں جن کی
ثقاہت اور سچ گوئی مسلم ہے، تاہم اِس میں اگر کوئی بات صحیح نہ ہو
تو اس کی ذمہ داری اُن کے سر ہے۔

علی بن منصور عُقیلی نے جو بحرین کے ایک عرب رئیس ہیں مجھ سے
بیان کیا کہ ہمارے سفیر برابر ہند جاتے ہیں اور وہاں کے بہت سے
حالات ہمیں معلوم ہیں۔ یہ خبر پے در پے ہمیں موصول ہوئی کہ اس
سلطان نے بڑی بڑی فتوحات حاصل کی ہیں، ایک مفتوحہ شہر میں
پانی کا ایک تالاب تھا اور اس کے بیچوں بیچ ایک مندر جس کی تعظیم
کی جاتی تھی اور لوگ اس کی مورتی پر نذرانے چڑھاتے تھے، جتنے نذرانے
آتے وہ اس تالاب میں ڈال دئے جاتے۔ سلطان نے شہر فتح کیا تو اس
کی توجہ اس مندر کی دولت کی طرف دلائی گئی، چنانچہ تالاب سے ایک
بمبا کاٹا گیا جس سے ہو کر سارا پانی نکل گیا، اس کے نیچے جو سونا تھا وہ
سلطان نے لے لیا، (اور وہ اتنا زیادہ تھا) کہ دو سو ہاتھیوں اور کئی ہزار

بیلوں پر لادا گیا۔ عُقیلی نے کہا: سلطان بڑا فیاض آدمی ہے، اور پردیسیوں کے ساتھ خوب داد و دہش کرتا ہے، ہمارے دو عرب اس سے ملنے کے ارادے سے گئے اور اُن کو سلطان کے حضور میں باریاب ہونے کی سعادت حاصل ہوئی، سلطان بڑی مہربانی سے پیش آیا، خلعت سے ان کی عزت افزائی کی، اور ان پر خوب روپیہ صرف کیا حالاں کہ وہ یہاں کے معمولی عرب تھے۔ پھر سلطان نے ان کو اختیار دیا کہ چاہے ہند میں قیام کرلیں، اور چاہے وطنِ مالوف واپس چلے جائیں، ایک نے ہند میں اقامت پسند کی، اس کو سلطان نے ایک بڑی جائداد دی، بہت سا روپیہ اور بہت سے مویشی، اس وقت ہند میں وہ خوب ٹھاٹ کر رہا ہے۔ دوسرے نے وطن جانے کی خواہش کی، اس کو سلطان نے تین ہزار سونے کے تنکے مرحمت فرمائے اور اُس کو خوش و خرم بحرین لوٹا دیا۔

ہند کے کچھ متفرق حالات

فوٹو نسخہ رقم ۵۵۹ (معارفِ عامّہ) دارالکتب المِصریّہ، قاہرہ ۲/۱۱

مجھ سے اَبو محمدؒ حسن بن عمرو نے بیان کیا کہ ہند کے ہر شہر میں کسبیاں ہوتی ہیں، لیکن ان کے مخصوص و معلوم گھرانے ہوتے ہیں، ان کے علاوہ باقی لوگ ضبطِ نفس اور عفت پر سختی سے عمل کرتے ہیں، اُس مرد کو سخت ترین سزا دی جاتی ہے جو غیر کسبی سے زنا کرے، اور اُس عورت کو بھی سخت سزا ملتی ہے جو اُن کسبیوں میں سے نہ ہو۔ جن کے نام سرکاری رجسٹروں میں درج ہوتے ہیں۔ غیر کسبی عورت اگر کسبی بننا چاہے تو اس کے گھر والے اس سے سارے ناتے توڑ لیتے ہیں اور اس سے اپنے قطع

تعلق کی تحریر لکھ دیتے ہیں، اور عورت کو گھر سے نکال دیتے ہیں اور کبھی اس کو سلام نہیں کرتے وہ عورت کسبی ہو جاتی ہے لیکن اس کا رتبہ پیشہ ور کسبیوں سے کم ہوتا ہے۔ ہندوستان کے ہر شہر میں گواہی وہ بوڑھی کسبیاں دیتی ہیں جن کی مائیں اور نانیاں کسبی تھیں، ان بوڑھیوں کی بات اور گواہی ہر معاملہ میں سنی اور مانی جاتی ہے۔ جب کوئی مرد کسی کسبی سے اپنے ساتھ رات گذارنے کا وعدہ لے لے اور اس کو بیعانہ دے دے تو اگر کسبی کو کوئی دوسرا آدمی اس رات کے لئے دگنے چوگنے روپئے بھی دے تو وہ اس کے ساتھ رات نہ گذارے گی اور پہلے کے ساتھ اپنا وعدہ پورا کرے گی۔

۱۲/۲ منصورہ (موجودہ حیدر آباد سندھ) کے ایک باشندہ نے کہا جو مانکیر[1] آیا جایا کرتا تھا۔ مانکیر اور ساحل بلاد اُر کے درمیان سینکڑوں فرسخ (۱ فرسخ = ۳ عرب میل) کا فاصلہ ہے اور یہاں بلّا رائے (مسالک: بلهور) کی حکومت ہے، کہ ہند کے بعض پہاڑوں میں ایسے زہریلے چنگبرے اور مٹیالے سانپ ہوتے ہیں کہ اگر کسی انسان کو دیکھ لیں اور انسان ان کو، تو موخر الذکر فوراً مر جاتا ہے، یہ سانپ سب سے زیادہ زہریلا ہوتا ہے۔ مؤلف کتاب: اس سانپ کو مُکَلّلہ (لسرفقتها؟) کہتے ہیں اور یہ اتنا زہریلا ہوتا ہے کہ اگر اس کی نظر کسی حیوان پر پڑے تو وہ مر جاتا ہے، لیکن اگر وہ فوراً بعد کسی دوسرے جانور کو دیکھ لے تو پہلا بچ جاتا ہے اور دوسرا مر جاتا ہے، کیوں کہ زہر کا اثر دوسرے میں سرایت کر جاتا ہے، اس کو مُکَلّلہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دوسری صنف کے ایک سانپ پر سوار ہوتا ہے جو اس کو لئے پھرتا ہے۔

---

[1] یا مانیا کھیٹا، بلّا رائے کا پایۂ تخت، نربدا دریا سے تین سو پچاس میل جنوب میں۔ حدود العالم ص ۲۴۶ تصحیح و توضیح دی منارسکی ۱۹۳۷ء۔

(باقی)

اسلام اِن موڈرن ہسٹری

ایک باب کا ترجمہ

از

پروفیسر ڈاکٹر ڈبلو، سی، اسمتھ

مترجم

(جناب ضیار الحسن صاحب فاروقی ایم۔ اے)

ڈاکٹر ڈبلو۔ سی۔ اسمتھ کی کتاب موڈرن اسلام اِن انڈیا (Modern Islam in India) پہلی بار ۱۹۴۳ء میں چھپی تھی، اس وقت سے ہند و پاکستان کا پڑھا لکھا طبقہ اُن کو جانتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان اور ہندی اسلام سے انھیں شروع سے دلچسپی رہی ہے، اس دل چسپی میں ہمدردی کا عنصر بھی شامل ہے۔ پچھلے چند برسوں سے اس دلچسپی کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے اور اس کا دامن اسلام اور دنیائے اسلام تک پھیل گیا ہے۔ اسلام اور مسلم تحریکوں کو سمجھنے کے لئے انھوں نے، جب کبھی موقعہ ملا ہے، مُسلم ممالک کا سفر کیا ہے، اسلامی زبانیں سیکھی ہیں اور ماضی اور حال کا گہرا مطالعہ کیا ہے، یہ اسلامیات کے مطالعہ ہی کا شوق ہے جس نے اُن کو یہ حوصلہ بخشا کہ وہ میکگل یونیورسٹی، مانٹریل (کنیڈا) میں اسلامی علوم اور زبانوں کے درس و تدریس اور ریسرچ کے لئے ایک انسٹیٹیوٹ قائم کریں۔ آج اس انسٹیٹیوٹ کے پاس دس ہزار سے زیادہ معیاری کتابوں پر مشتمل ایک اچھا کتب خانہ ہے۔ اس کے علاوہ تحقیقی علمی کاموں کے لئے دوسری سہولتیں بھی مہیا ہیں۔

اسلام اِن موڈرن ہسٹری (Islam in Modern history) جس کے ایک باب کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے، ۱۹۵۶ء کے وسط میں چھپ کر آگئی تھی۔ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب موصوف کی برسوں کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس موقع پر میں کتاب پر ریویو نہیں کرنا چاہتا، البتہ اتنا

ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ حال میں مستشرقین نے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کتابیں لکھی ہیں اُن میں یہ کتاب اور پروفیسر گب (ہارورڈ یونیورسٹی ۔ امریکہ) کی کتاب موڈرن ٹرینڈز اِن اسلام (Modern Trends in Islam) (شکاگو ۱۹۴۷ء) بڑی اہمیت رکھتی ہیں ان دونوں کتابوں میں اُن علمی، ذہنی اور نفسیاتی رجحانات سے بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو مسلم دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بڑے گہرے مسائل چھیڑے گئے ہیں۔ وہ رجحانات اور وہ مسائل جن سے خود تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ بڑی حد تک بے خبر ہے یا غیر شعوری طور پر بے تعلق ہے۔ ڈاکٹر اسمتھ کی اس نئی کتاب میں آج کے ہندوستان کے مسلمانوں کی ذہنی کیفیت، وہ نئی صورت حال جس سے وہ دوچار ہیں اور گوناگوں پیچیدہ مسائل کی طرف بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس کے اس باب کا ترجمہ کروں جس کا تعلق مسلمانانِ ہندوستان سے ہے تاکہ حساس اور سوچنے والے وہ مسلمان جو انگریزی زبان نہیں جانتے، اِسے پڑھیں اور سمجھیں اور اگر انھیں اس میں کوئی تعمیری پہلو نظر آئے تو اس کو ذمہ داری کے ساتھ قبول کریں۔ ایسے مضامین پر غور و فکر کرنے کے لئے میں جس چیز کو بہت ضروری سمجھتا ہوں وہ نیک نیتی، دیانت داری اور بے تعصبی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرے دیس کے مسلمان اس مضمون کو ہر طرح کے تعصباتِ ذہنی سے ماوراء ہو کر پڑھیں۔

(ضیاء الحسن فاروقی)

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان تقسیم ہوا تو اُس کے ساتھ ساتھ اس کا مسلمانوں کا فرقہ بھی تقسیم ہو گیا۔ اس واقعہ سے اس فرقہ کو بڑا صدمہ پہنچا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے پاکستان اس بنیاد پر بنایا تھا کہ اُن کی جماعت ایک (ناقابلِ تقسیم) واحدہ ہے۔ مسلم لیگ نے یکایک (مسلمانوں کے لئے) ایک الگ ریاست کا نعرہ جو لگایا وہ درحقیقت اس کے اس نظریہ کا ضمنی نتیجہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو متحد ہو جانا چاہیئے۔ بڑی شدت کے ساتھ اور پُرزور لفظوں میں اس نے اعلان کیا کہ ہند کے مسلمان ایک علاحدہ قوم ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک قوم محسوس کرنے میں کامیاب رہے۔ لیکن مسلم لیگ کی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب ہندوستان

(قبل از تقسیم) کے مسلمان دو الگ قومیں ہیں [1]۔

تقسیم سے پہلے کے ہندوستانی مسلمان اب دو [2] علاحدہ قومیں ہیں، نہ صرف اس لحاظ سے کہ ان دونوں کے درمیان ایک سیاسی حد کھینچ دی گئی ہے (حالات نے اس حد بندی کو اور پختہ کردیا ہے اور آمد و رفت، خبروں کا گذر، ایک دوسرے کو سمجھنے کے امکانات اور تجارتی تعلق۔ یہ سب معاملات اکثر مشکل ثابت ہوئے ہیں اور بسا اوقات تو ختم ہو گئے ہیں۔) بلکہ بنیادی طور پر بھی یہ دو الگ الگ قومیں بن گئی ہیں۔ اب ان کے سامنے جو مسائل ہیں وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور وہ جس پالیسی پر عمل پیرا ہیں وہ نہ صرف مختلف بلکہ متضاد بھی ہے۔ ایک کا مفاد دوسرے کے لئے مضر ہو سکتا ہے یا اس کے نتائج دوسرے کے حق میں تباہ کن ثابت ہو سکتے ہیں۔ دونوں کے دنیاوی مفادات میں، خواہ آخر میں وہ ایک دوسرے سے نہ ٹکرائیں، فی الحال کوئی مطابقت نہیں ہے۔ ان کے روحانی معاملات اور اخلاقی ذمہ داریاں بھی مختلف ہیں۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ ان کا تاریخی ارتقار متضاد اصولوں کی بنیادوں پر ہو، ممکن ہے ان کا مذہبی قافلہ واضح طور پر دو متخالف راستوں پر گامزن ہو۔ مسلمانوں کے یہ دونوں گروہ اب اپنی الگ الگ "تقدیر" رکھتے ہیں اور چونکہ ان کی ذمہ داریاں اور سرگرمیاں مختلف ہیں اس لئے ان کی رفتار ان کے اپنے وجود کی خصوصیات کے پیش نظر رکھنی چاہیئے۔

۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق برصغیر ہند و پاکستان میں ۹ کروڑ ۴۴ لاکھ ۵۰ ہزار مسلمان تھے [2] اور ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق اُن کی تعداد تقریباً ۱۰ کروڑ ۴۰ لاکھ تھی [3]۔ اس

---

[1] ہندوستان کے بعض مسلمان یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی تقسیم نے مسلمانوں کو تین قوموں میں تقسیم کردیا ہے ہندوستان کے مسلمان اور پاکستان میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے مسلمان، اور یہ تینوں آگے چل کر اپنا الگ الگ پارٹ ادا کرنے والی ہیں۔ [2] ہندوستان کی مردم شماری: ۱۹۴۱ء، دہلی ۱۹۴۳ء۔

[3] یہ اعداد و شمار اس طرح ہیں: پاکستان ۶ کروڑ ۴۴ لاکھ ۶۰ ہزار (پاکستان کی مردم شماری، ۱۹۵۱ء: آبادی مذہب کے لحاظ سے ٹیبل نمبر ۶ مردم شماری بلیٹن نمبر ۲، صفحہ ۱)؛ ہندوستان ۳ کروڑ ۴۵ لاکھ (ٹائمز آف انڈیا ڈائرکٹری اینڈ ایئر بک ۵۶-۱۹۵۵ء بمبئی صفحہ ۹ تا ۱۰) کشمیر ۴۳ لاکھ (یہ اندازہ ۱۹۵۱ء میں مجموعی آبادی جیسا کہ ٹائمز آف انڈیا نے دی ہے اور جو ۴۴ لاکھ ۱۰ ہزار ہے اس کے ۷۷ فیصدی کو لے کر لگایا گیا ہے۔ ۱۹۴۱ء میں ۱۱ر۷۷ فیصدی کا اندازہ تھا۔ ڈبلو۔ نارمن براؤن، دی یونائیٹڈ اسٹیٹس اینڈ انڈیا اینڈ پاکستان، کیمبرج ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۵۹)

(۱) اس کی اتنی بڑی تعداد۔

(۲) اس کی تاریخ اور روایات۔

(۳) نئے ہندوستان کے رنگارنگ اور پیچیدہ حالات میں اس کی شرکت، اس کا حصہ اور اس کی اقلیتی حیثیت ــــــ اگرچہ اس احساس سے کہ مسلمان اقلیت میں ہیں انھیں اپنی اہمیت کا نہ صرف یہ کہ اندازہ نہیں ہوتا بلکہ یہ کہ وہ اپنے آپ کو غیر اہم تصور کرتے ہیں ــــــ اگر ایک طرف انھیں اپنی خودی سے آگاہ ہوتے، اپنی اہمیت اور اپنی حقیقت پہچاننے کی راہ میں پاکستان سے اُن کا جذباتی لگاؤ اور پاکستان سے باہر رہ جانے کا خیال حائل رہا ہے تو دوسری طرف یہ احساس ان کے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے کہ ہندوؤں سے ان کے تعلقات اچھے نہیں رہے ہیں اور یہ خوف ان سے دور نہیں ہوتا کہ ہندو انھیں مغلوب کرلیں گے۔ یہ بات کہ وہ خود کیا ہیں، یہ سوال کہ نئے ہندوستان میں اُن کی ماہیت کیا ہے، دب جاتا ہے اس تشویش سے کہ دوسروں کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا رہی ہے اور اب کیا ہے . . . . .
بہر حال، اس مسلم اقلیت کی فلاح و ترقی اور اس کی آیندہ نسلوں کا مستقبل ہی آزمائش میں نہیں مبتلا ہے بلکہ اس کے اپنے مسائل کے حل کرنے کی کامیابی اور ناکامی کا اثر ہندوستان اور اسلام کی تاریخ پر بھی پڑے گا، آج کے چیلنج کو یہ کس بُردباری اور دانش مندی سے قبول کرتی ہے اس سے بھی اس کے ملک اور مذہب کی تاریخ متاثر ہوگی۔

۱۹۴۷ء سے پہلے آج کے ہندوستان کی مسلم اقلیت کی اپنی کوئی ممتاز حیثیت نہیں تھی یہ ایک بڑی مسلم جمعیت کا حصہ تھی۔ لیکن واقعات نے اس کو ایک منفرد مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے، اس نئی منزل میں یہ ہے اور اس کی اس پوزیشن کو سنجیدگی سے قبول کرنا چاہئے۔ یہ ایک بالکل نئی پوزیشن ہے، خود اس اقلیت کو اس کا احساس نہیں ہے۔ تعمیری اور تخلیقی نقطۂ نظر تو خیر بڑی چیز ہے، ذہنی اور جذباتی طور پر بھی وہ اس حقیقت کو نہیں تسلیم کر پائی ہے کہ ۱۹۴۷ء میں ایک نئی صورتِ حال نے جنم لیا۔ اس کے تقاضے کچھ اور ہیں اور اس کے بعد ایک نئی

زندگی کی جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں وہ پہلے سے مختلف ہیں۔ اس گروپ نے ابھی یہ حقیقت پوری طرح نہیں سمجھی ہے کہ یہ ایک "نیا گروپ" ہے۔

یہ نئی صورت حال، اس کے مسائل اور اس کے تقاضے اتنے نئے اور اچھوتے ہیں کہ پہلے کبھی اس طرح کی کوئی صورتِ حال تاریخ اسلام میں نہیں ملتی۔ مسلمانانِ ہند کا یہ نیا گروہ اتنا ہی نیا ہے جتنا پاکستان، با ایک اور پہلو سے اگر دیکھا جائے اور جس سے آگے چل کر ہم بحث کریں گے، یہ گروہ زیادہ قدیم ہے اور اپنے پیچھے زیادہ تاریخی حقایق رکھتا ہے۔ بہرحال بعض معاملات میں، خاص طور سے جہاں تک مذہبی معاملات سے تعلق ہے اس کی حیثیت نئی ہے، یہ ایک "بدعت" ہے بالکل جدید، لیکن یہ ایک حقیقت بھی ہے۔

دنیائے اسلام کے تمام علاقے آج ایک نئی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ یہ بیسویں صدی میں رہنے کی برکت ہے۔ ہر علاقہ کا اپنا معاملہ الگ اور انوکھا ہے اس عہد میں تاریخ اسلام کا دھارا الگ الگ کئی حصّوں میں مختلف انداز سے بہہ رہا ہے ہندوستانی مسلمانوں کی جماعت اس حقیقت سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔ آج اسلامی تاریخ کی نشو و نما میں اس کا رول انوکھا ہے اور زیادہ تر اس کا اپنا ہے۔ ماضی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ حال میں اس کا سہیم و شریک کوئی نہیں اور اس لئے اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے اس نئی صورتِ حال کا مقابلہ حسن کردار اور خوش اسلوبی سے کر لیا تو ان کی جماعت عصرِ حاضر کے اسلام، میں نمایاں اور اہم حیثیت کی مالک ہوگی۔

تعداد بذاتِ خود زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ مصر، ترکی اور ایران کی آبادی پاکستان اور انڈونیشیا سے بہت کم ہے لیکن تاریخ اسلام میں ان کی اپنی اہم حیثیت مقدم ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد کم نہیں اور ماضی میں اگر اسلامی تاریخ میں مسلمانانِ ہند کا حصہ عربوں سے کم رہا ہے تو انڈونیشیا جیسے بڑے مسلم ملک کے مقابلہ میں کہیں زیادہ رہا ہے۔ اس لئے قطع نظر تعداد کے دیکھنا یہ چاہیئے کہ اسلامی تاریخ میں ہندی مسلمانوں کا پارٹ بڑا

اور اہم رہا ہے۔ اس طرف اشارہ کرنے سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ آج ہندوستانی مسلمانوں کے پیچھے ہزار سالہ تاریخی شاندار روایات ہیں، جو بڑی گراں بہا ہیں، بڑی رنگارنگ ہیں، خاص طور سے حکومت، فنونِ لطیفہ، مذہبی فکر و عمل کے مختلف گوشوں میں ان روایات کی اپنی خصوصیت ہے، اپنی اہمیت ہے۔ مذہبی خیالات اور اعمال میں صوفیوں کی روایات بڑی روشن ہیں، ان روایات کی گود میں ایک زندہ اور ممتاز تمدن نے جنم لیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس تمدن کی عظمت پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ یہ ایک ناقابلِ انکار سچائی ہے، اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی سوال اٹھا سکتا ہے تو یہ کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں کیا یہ صلاحیت ہے کہ وہ ان روایات کو زندہ اور جاری رکھ سکیں اور اس سلسلہ کو ٹوٹنے نہ دیں؟ بہر حال قبل اس کے کہ اس سلسلہ میں کوئی رائے قایم کی جائے ہمیں اس مسلم اقلیت کے حالات اور سرگرمیوں کا جائزہ لیتے رہنا چاہیئے۔ ہم نے خود صورتِ حال کے نئے ہونے پر زور دیا ہے، پھر بھی اگرچہ یہ نئی صورت حال ہے، لیکن ایک طویل سلسلہ ہی کی ایک کڑی ہے۔

ایک طرح سے پاکستانی اور ہندوستانی مسلمان دونوں ایک ہی ماضی کے وارث ہیں۔ دونوں کے پیچھے ایک ہی قسم کی روایات ہیں، تہذیبی اعتبار سے ہر ایک کے پاس وہی میراث ہے جسے ہم "ہندوستانی اسلام" کہتے ہیں اب یہ ان پر ہے کہ وہ اس کو کس طرح برتتے ہیں اور اسے کیا شکل دیتے ہیں۔ اسی بات کو اگر دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو برخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے اس پر لاپروائی سے غور کیا ہے، پاکستان اس تہذیبی ارتقار کے سلسلہ کو توڑ دیتا ہے۔ اور اس لحاظ سے پاکستان ایک نئی چیز ہے۔ برصغیر ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بھی یہ نیا ہندوستان ہی ہے جو اگرچہ اب چھوٹا رہ گیا ہے لیکن اس قدیم تہذیبی سلسلہ کو جوڑے ہوئے ہے۔ روایات ہجرت نہیں کرتیں اور تاریخ ایک ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں پناہ نہیں لیتی۔ نئے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے اجداد کی جو روایات اور تہذیبی دار

ملے ہیں وہ اُن کے ترکہ سے کہیں زیادہ ہے۔ نظام حیدر آباد سے لے کر تاج محل تک، دیوبند سے لے کر علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ تک ـــــــــ یہ سب ادارے اور ان کی روایات و خصوصیات ہندوستانی مسلمانوں کے حصہ میں آئی ہیں۔ اُردو زبان کے گہوارے ہندوستان ہی میں رہ گئے۔ اس طرح ہندوستانی مسلمانوں نے ۱۹۴۷ء میں جو نئی زندگی شروع کی وہ خلاء میں نہیں شروع کی۔ اس کے ساتھ روایات کا وہ پشتارہ ہے جو اسے ماضی سے ملا ہے اور جس کی "ہندوستانیت" آشکارا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی کہانی طویل ہے، اس میں بڑے نشیب و فراز ہیں۔ اس کے بعض مقامات بڑے اہم ہیں، اس کی ایک اپنی شان ہے، عظمت ہے، یہ بڑی ہنگامہ خیز رہی ہے، سوز اور ساز دونوں اس میں ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ کہانی ختم نہیں ہوئی ہے۔

اب ہم ہندی مسلمانوں کی پوزیشن کے سب سے زیادہ مخصوص پہلو سے بحث کریں گے۔ اگر تعداد اور ماضی کے روایات کے پیش نظر اس کو کسی دوسری اسلامی "کمیونٹی" کے دوش بدوش کھڑا کیا جاسکتا ہے تو سیاسی اعتبار سے اس کا معاملہ دوسروں سے نہ صرف مختلف بلکہ انوکھا ہے۔ ترکی، ایران، پاکستان اور انڈونیشیا آزاد قومی ریاستیں ہیں۔ عرب اور ہندوستانی مسلمان اپنے اپنے حالات کے پیش نظر مختلف ہیں۔ عرب اگرچہ زبان اور کلچر کے اعتبار سے شعوری طور پر اپنے آپ کو ایک سمجھتے ہیں لیکن سیاسی لحاظ سے وہ متحد نہیں ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان جن کی زبان ایک نہیں (نصف سے زیادہ اُردو بولتے ہیں اور تقریباً ایک تہائی بنگالی) لیکن جو تہذیبی اعتبار سے کسی قدر متحد ہیں اور جو بڑی حد تک اس کا احساس بھی رکھتے ہیں، ایک ہی ملک کے شہری ہیں۔ اور ایک ایسے ملک کے شہری جس کا شمار ہر لحاظ سے آج دنیا کے اہم ترین ملکوں میں ہے۔ اس لئے عہد حاضر کی اسلامی دنیا میں جس چیز نے انھیں ایک مختلف حیثیت دے دی ہے اور جو آج حقیقت میں اُن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسی ری پبلک کے شہری ہیں جس میں بھاری اکثریت غیر مسلموں کی ہے چین، سوویٹ

یوگینڈا اور نیگرو افریقہ کے مسلمانوں کو ان کی تعداد کی کمی اور مقابلۃً بہت کم تاریخی اہمیت کے پیش نظر، ہندی مسلمانوں کے مقابلہ میں نہیں لایا جا سکتا مزید برآں سب سے بڑا اختلافی پہلو یہ ہے کہ وہ آزاد نہیں ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی یہ انوکھی صورتِ حال پیچیدہ ہے اور ضرورت ہے کہ واضح طور پر اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن شروع میں بہت سے مسلمانوں کے نزدیک یہ بڑی سادہ اور آسان معلوم ہوئی یعنی یہ کہ انھوں نے اپنے خوابوں کی اچھی تعبیر اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جو امید قایم کی تھی اس میں انھیں مکمل طور پر ناکامی اور انتشار کا سامنا کرنا پڑا۔ اور انھوں نے ایسا محسوس کیا کہ ہر طرف سوائے ویرانی کے اور کچھ نہیں ہمارا خیال ہے کہ عصرِ حاضر کے مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اُن کے مذہب اور ان کی موجودہ تاریخ میں مطابقت اور ہم آہنگی نہیں۔ یہ عدمِ مطابقت پورے طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے جلوہ گر ہوئی۔ اگر دوسری اسلامی جمعیتوں کے سامنے صرف یہ حقیقت تھی کہ مسلمانوں کی دنیوی زندگی کا جلال و شکوہ زوال آمادہ منزلوں سے گذر رہا تھا اور ان کی تاریخ کا بڑھتا ہوا قافلہ رک گیا تھا یا اس کی رفتار سُست ہو گئی تھی، تو ہندوستان میں مسلم جمعیت یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ ماضی کی شان و عظمت اور زمینی زندگی کی ساری برکتیں نابود ہو گئی ہیں۔ اور جب کہ اسلامی تاریخ کے دوسرے گوشے اپنے آپ میں خدائی مقاصد سے کوئی مناسبت نہیں محسوس کرتے تھے تو اس جمعیت نے ایک پاکستان کے قیام کے لئے جدوجہد کی جہاں اسلامی تاریخ کا کم از کم ایک جزو ایک بار پھر سچی عظمت کی جلوہ سامانیوں سے جگمگا سکے۔

ہندوستان کی موجودہ مسلم جمعیت آگ اور خون، نفرت اور وحشت کی ایسی فضا میں اُبھری جہاں جنگی نعروں کی گونج تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوا اور خوفناک فسادات اور قتل و غارت گری کے جلو میں ہندوستان اور پاکستان کی دو نئی ریاستیں وجود میں آئیں۔

جب اِن دنوں کے تشدد اور زیادتیوں کا اثر دونوں ملکوں نے پوری طرح محسوس کیا تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان ملکوں کی اقلیتوں پر کیا گذری ہوگی جن کو بے بسی اور خوفزدگی نے نڈھال کر دیا تھا۔ اور یہ صورتِ حال آزادی کے بعد شروع کے چند مہینوں ہی میں ختم نہیں ہو گئی بلکہ دونوں ملکوں کے مابین بڑھتے ہوئے تناؤ کے ساتھ کئی سال تک جاری رہی۔ پُرجوش اندھی اور جذباتیت کی ماری ہوئی، فرقہ پرستی کا پس منظر لئے ہوئے اور ایک تباہ کن طوفان سے گزرتی ہوئی یہ مسلم جمعیت ایک ایسے ملک میں اقلیت بن کر ظاہر ہوئی جس کی عام آبادی اُس کو اور جسے وہ غیر اور اپنا سخت دشمن تصور کرتی تھی۔

جب جذبات سرد پڑے تو خوف کی فضا ختم ہوئی لیکن مشکلات قایم رہیں۔

نئے ہندوستان نے جلد ہی اپنے آپ کو شروع کے انتشار کی دلدل سے نکال لیا اور کسی قدر حوصلے اور ہوشیاری کے ساتھ خوراک کی کمی اور اس طرح کے دوسرے بحرانی مسائل کو قابو میں لانے کی کوشش کی، اس نے تعمیری، ذمہ دارانہ، مشکل اور حوصلہ بخش کام یعنی آج کی پیچیدہ اور ولولہ انگیز دنیا میں آزاد رہ کر جینے کے کام کی بنیاد ڈالنی شروع کی۔ کچھ مسلمانوں نے بھی، خاص طور سے گنتی کے وہ چند افراد جنھوں نے ہندوستانی نیشنلزم سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا تھا اور مسلم لیگ کی علاحدگی پسندی کی تحریک سے بے زاری ظاہر کی تھی، ہندوستان کے اس بڑے ترقی پسند اقدام میں شرکت کی۔ انھوں نے خلوصِ نیت اور اپنی تمام جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ اس میں حصہ لیا اور اُن کی خدمات کی قدر کی گئی۔ لیکن ان لوگوں کی جماعت کی اکثریت جو نہ تو دوسروں پر اعتماد کرتی تھی اور نہ خود اعتماد کے لایق تھی، الگ تھلگ رہی اور خوفزدہ، بے اعتمادی کی ماری ہوئی اور نظر انداز کی ہوئی یہ اکثریت نڈھال ہوتی رہی۔

اس مسلم اقلیت کے بیشتر افراد یہ محسوس کرتے تھے کہ ہندوستان کی یہ تعمیری سرگرمیاں ان کے لئے نہیں ہیں، وہ یہ خیال کرتے تھے کہ ہندوستان کی آزادی نے ان کے دشمنوں کو

یہ بے روک موقع دے دیا ہے کہ وہ انھیں مغلوب رکھیں اور ختم کر دیں۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ اس نئی ریاست کی سیکولرزم جس کا بار بار اقرار اور اعلان کیا جاتا ہے محض فریب اور منافقت پر مبنی ہے، اور جمہوریت (ڈیموکریسی) کا مقصد یہ ہے کہ اُن کو اُن کے ووٹوں کی مؤثر اہمیت سے محروم کر دیا جائے۔

ہم ان اہم مسائل سے پھر بحث کریں گے۔ یہاں ہمیں یہ دیکھنا اور سمجھنا ہے کہ جس طرح کے حالات میں مسلمان گھرے ہوئے تھے اُن میں وہ یا کوئی اور جماعت کیسے نہ انھیں نتائج تک پہنچتی اور یہ چیز بنیادی حیثیت رکھتی ہے، نہ صرف یہ اندازہ لگانے میں کہ اُن کے احساسات کیا تھے، اُن کی ہیجانی کیفیت کیا تھی بلکہ یہ بھی کہ اُن کے خارجی حالات کی نوعیت کیا تھی۔

یہ کلیہ بھی بے محل نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ دنیا میں کہیں بھی کوئی مذہبی اقلیت یہ محسوس نہیں کرتی کہ وہ محفوظ ہے اور اس کے وجود کو اکثریت نے تسلیم کر لیا ہے۔ کمیونسٹوں کے برسرِ اقتدار آنے سے قبل غالباً چین میں یہ حالت نہیں تھی۔ اس لئے اس وقت کے حالات میں ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں اقلیتوں کو اپنے غیر محفوظ ہونے کا احساس تھا۔ ابھی تک آدمی کوئی ایسا سماجی نظام نہیں بنا سکا ہے جس کی فضا ان گروہوں کے لئے بھی قابلِ اطمینان حد تک سازگار ہو جو پوری طرح اس نظام کو اپنا سکیں اور اس میں پوری طرح نہ شریک ہو سکیں، امریکہ میں حبشیوں کو، عیسائی دنیا میں یہودیوں کو، مصر میں قبطیوں کو اور کمیونسٹ بلاک میں کمیونزم کی آزاد تفسیر کرنے والوں کو خوفزدہ اور ہراساں رہنے کے وجوہ مختلف اور معقول ہیں۔ کسی بھی سوسائٹی میں اقلیت بن کر رہنا کوئی آسان اور خوش گوار بات نہیں ہے۔ حقوق اور آزادی، خواہ نامکمل ہی کیوں نہ ہوں، اپنی اہمیت رکھتی ہیں اور اس بات کو نظر انداز کر دینا حماقت ہے۔ (اقلیتوں کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خامیوں کو تو دیکھتی ہیں اور اُن کی شکایت کرتی ہیں مگر حقوق اور آزادی

کو خواہ وہ کسی درجہ کی ہوں تحسین کی نگاہوں سے نہیں دیکھتیں) لیکن اس حقیقت سے بھی آنکھ چرانا غلط ہے، خواہ اقلیتوں کو کتنی ہی آزادی ہو اور کتنے ہی حقوق ملے ہوں، انسانی معاشرہ کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ اس میں اقلیت کا کوئی فرد پورے اطمینان اور بھروسے سے نہیں رہ سکتا۔ اس کی زندگی مختلف قسم کے دباؤ سے دوچار رہتی ہے تاریخ انسانی کی تلخ حقیقتوں میں سے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی شخصیت اُس آزاد نشو ونما کی برکتوں سے محروم رہتی ہے جو ایک آزاد جماعت کے رکن کا حصہ ہوتا ہے۔

جہاں تک ہندوستان اور ہندوستان کی مسلم اقلیت کا تعلق ہے: یہ بات بڑی غیر ذمہ داری کی ہوگی اگر دستورِ ہند کی آئینی دفعات کا صحیح اندازہ نہ لگایا گیا اور حکومت اور سوسائٹی کی لبرل اسپرٹ (Liberal Spirit) کو جیسی کہ وہ اس وقت پائی جاتی ہے، پیش نظر نہ رکھا جائے[1]۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ناانصافی کی بات ہوگی اگر ماضی سے ورثہ کے طور پر ملے ہوئے مختلف عوامل اور حال کے واقعات کی رفتار سے جو بھائی چارہ کے احساس اور انسانیت کی فضا کی طرف نشاندہی کرتی ہے اعراض ہوتا جائے۔ سیکولرازم اور بغیر کسی امتیاز کے جمہوری انصاف کی منزل یقیناً ابھی دور ہے اور ابھی یہ محض نصب العین ہی ہے لیکن اس موقع پر اس سبق کو یاد رکھنا چاہیئے جو فسطائیت نے ہم کو پڑھایا ہے: یعنی یہ کہ جمہوریت کی منافقانہ نمائش اور جزوی انصاف کا نمائشی اعلان بھی اپنی اضافی قدر وقیمت رکھتا ہے، اس قسم کے کسی نمائشی نصب العین

---

[1] کابینہ کے مسلم ممبر نمایاں رہے نہ صرف مشہور ومعروف اور مدت العمر کی جانی پہچانی مولانا ابو الکلام آزاد کی شخصیت بلکہ لائق اور ہر دل عزیز رفیع احمد قدوائی جنہوں نے تن من سے ملک کی خدمت کی اور آزاد ہندستان کے شروع کے بحرانی سالوں میں مسئلہ خوراک کو حل کرنے میں کامیاب رہے۔ ان کے علاوہ دوسرے نمایاں مسلمانوں نے بھی سفیر، سول سروس کمشنر وغیرہ کی حیثیت سے اپنے ملک کی خدمت کی اور دہلی کے قریب جامعہ ملیہ نے جس نے پہلے سے ہی اپنا اعتبار قائم کر رکھا ہے، اپنے آپ کو ترقی وتوسیع کی راہ پر گامزن پایا۔ (کم اہمیت رکھنے والے مسلمانوں نے، بہر حال یہ بات ضرور کہی کہ اس قسم کا کام ان لوگوں کے لئے آسان تھا جو شہرت رکھتے اور چوٹی کے اشخاص شمار ہوتے تھے۔ گمنام اور دور دراز کے علاقوں کے مسلمانوں کے لئے یہ آسانی نہیں تھی۔)

کا نہ ہونا اور کسی دوسرے خواب کی تعبیر کو عملی جامہ پہنانا کتنا تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ ہندی مسلمانوں کی ایک بہت چھوٹی سی تعداد نے اس قوم کے (جس کے کہ وہ ممبر ہیں) اعلیٰ مقاصد کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور ان کے حصول کے لئے حکومت اور دوسرے رہنماؤں کی دیانتدارانہ جدوجہد کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ فرقہ وارانہ امتیاز سے بالاتر ہو کر اسٹیٹ نے خالص انسانی فلاح و بہبود کے متعلق جن مقاصد کا باضابطہ اعلان کیا ہے وہ حقیقتاً بڑے گراں بہا ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ، سوسائٹی میں وہ ہندو اور غیر ہندو رجحانات جو ان مقاصد کے حصول کے لئے کم از کم کچھ لوگوں کو حوصلہ بخشتے ہیں، اُن کی بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ یہ چھوٹی بات نہیں تھی کہ ہندوستانی قوم کے ہندو رہنماؤں نے سیکولرازم اور انسانیت کے نام پر ہندو اکثریت کے مسلمانوں سے انتقام لینے کے فطری اور بُنیادی طور پر خوفناک جذبہ کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے۔

دوسری طرف یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اقلیت اقلیت ہی ہے۔ اس کی کوتاہیاں اور مایوسیاں، اس کا خوف اور اس خوف کے اسباب بھی مسلّم ہیں۔ یہ لسانی، معاشی، سیاسی اور اس قسم کے دوسرے اسباب ہیں جو حقیقی اور بڑے ہیں۔

مُسلمان ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ اپنی زبان سے جسے وہ مذہب کے بعد دوسری اہم چیز سمجھتے ہیں، محروم نہ ہو جائیں۔ گذشتہ ۹ سالوں میں جب کہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں حالات بتدریج روبہ اصلاح رہے ہیں، زبان کا مسئلہ جوں کا توں ہے اور حالات کی بہتری کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ اور باوجود ہندوستان کے آئینی، جمہوری اور سیاسی نظام کے اور ہندو فلسفہ کے اس عنصر کے ہوتے ہوئے بھی کہ انسان کی اہمیت بحیثیت انسان کے پرکھنی چاہیئے، ہندو مذہب میں ذات پات کا نظام اپنی تمام تنظیمی خصوصیات کے ساتھ موجود ہے ذات پات کا یہ سسٹم اپنے پیچھے ایک فلسفہ بھی رکھتا ہے . . . . . اور اس کے حامیوں کو اس کے قیام پر اصرار ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ انسانی دنیا کو ایک اچھا نظام اُخوت پیش کرنے میں جو ناکامیاں ہوئی ہیں اُن کی طویل

تاریخ میں سماجی بے انصافی اور متشدد اور مغرورانہ عدم مساوات کی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ شروع میں ہم نے جو یہ کہا تھا اور جس کی وضاحت ابھی باقی ہے کہ ہندوستان کی مسلم جماعت ایک بڑی اہم اور تخلیقی کارنامے انجام دے سکنے کی پوزیشن میں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس کے سامنے اپنا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

انتشار جس کا سبب پاکستان ہے مسلمانانِ ہند کی مسلسل پریشانیوں اور احساسِ عدم تحفظ کا ہندو فرقہ پرستی کے بعد سب سے بڑا سبب پاکستان کا رویہ رہا ہے۔ ان کی زندگی کے انتشار میں پاکستان کے مسلمانوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ بعض حیثیت سے تو یہ محض پاکستان کا وجود ہے جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کی پوزیشن کو کمزور کر دیا ہے۔ اس کے قیام سے مسلم اقلیت بہت چھوٹی بن کر رہ گئی۔ غیر منقسم ہندوستان میں یہ صورتِ حال نہیں تھی۔

مزید براں، ہندوستان کے موجودہ مسلمانوں نے تمام دوسری پیشکشوں کے خلاف قیام پاکستان کے حق میں ووٹ دے کر نئے ہندوستان میں اپنی کسی خاص حیثیت کے استحقاق کو خود ہی رد کر دیا۔ (ان لوگوں نے ناقابلِ برداشت حد تک ایک بڑا مطالبہ کیا اور ہم نے اسے مان لیا۔ اب انھیں خاموش رہنا چاہیئے") ایک مسلم کسان جس کے سر میں کبھی کسی سیاسی تخیل کا سودا ہی نہیں سمایا تھا، اپنے گاؤں میں اس تنفر آمیز طنز کے ساتھ دھکے کھا سکتا ہے "تم کیوں نہیں نکل جاتے؟ تم کیوں نہیں اپنے پاکستان کا راستہ لیتے؟" اور اس بے چارے کی چیخ و پکار دور تک پہنچ بھی نہیں پاتی۔

بہرحال، پاکستان کے قیام کے باوجود مسلمانانِ ہند آسانی سے نئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکتے تھے اگر "اسلامی" مملکت قوم کی سرگرمیاں ان کی راہ میں حائل نہ ہوتیں۔ اس علاقہ میں مسلم مفادات کی فرقہ وارانہ تعبیرات کی بنیادوں پر جن طریقہ ہائے کار کو اپنایا گیا انھوں نے سرحد پار کے ہندوستانی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں مدد دی ہے۔

تقسیم کے بعد فوراً ہی یہ چیز شروع ہو گئی جب کہ پاکستانی مسلمانوں نے لاکھوں ہندوؤں

اور ہندوؤں کا قتلِ عام کیا اور انھیں جلا وطن کر دیا۔ مجموعی طور پر ہندوستان نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ یہ خوفناک صورتِ حال دونوں ملکوں کے لئے تباہ کن ہے۔ اس کے رہنماؤں اور مختلف شہریوں نے انسانیت کے اصولوں کے معیار پر اس طوفان و ہنگامہ کو جانچا اور "تاریخِ ہند کے اس تاریک ترین باب"[1] پر افسوس اور ندامت کا اظہار کیا۔ برخلاف اس کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ وہ تعصب کی تنگ نائیوں سے نکل کر اپنے اس تقریباً مساوی جرم کو تسلیم کرتا۔[2] اس ملک کے مسلمانوں کو عام طور پر اس کا احساس نہیں ہے کہ دوسری طرف بھی لاکھوں آدمی اس خوفناک مصیبت کا شکار ہوئے۔ اس وحشیانہ پاگل پن کو محسوس کرنے اور تسلیم کرنے کی ذمہ داری مسلمانانِ ہند پر ڈال دی گئی جنھوں نے اپنے درمیان غضبناک پناہ گزینوں کو خوف اور تلخی کا موڈ لئے ہوئے کارواں در کارواں آتے دیکھا۔ انھوں نے اس پاگل پن کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ جزوی طور پر اس کی قیمت بھی ادا کی۔ (باقی)

---

[1] سردار پٹیل نے بنگلور میں کانگریسیوں کے ایک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے (۲۵ فروری ۱۹۴۹ء) ان لوگوں پر سخت تنقید کی جو "ہندو راج" اور "ہندو کلچر" کا نعرہ لگاتے تھے۔ انھوں نے کہا، کہ "گاندھی جی اس پُر فریب تخیل کے مخالف تھے لیکن ہم نے ان کی نہیں سُنی اور جب ہم کو آزادی ملی تو ہم جانتے ہیں کہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کیا سلوک کیا، اب یہ تاریخ کا ایک واقعہ ہے اور ہمیشہ کے لئے ہندوستان کی تاریخ میں اس کے تاریک ترین باب کی حیثیت سے محفوظ ہو گیا ہے۔" ——— ہندوستان ٹائمز، نئی دہلی ۲۶ فروری ۱۹۴۹ء لیڈروں کے اس قسم کے بیانات کے علاوہ اس مصنف نے معمولی شہریوں کو بھی (کلکتہ میں سکھ ٹیکسی چلانے والے اور ہندو پناہ گزیں جن سے ٹرینوں میں ملاقات ہوتی ہے) اسی قسم کے خیالات ظاہر کرتے ہوئے پایا ہے یہ سب فرقہ وارانہ کشیدگی اور تنفر پر افسوس کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کے نتائج انسانیت کے لئے باعثِ شرم ہیں۔

[2] یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ کس طرح کتنی قتل و غارت گری ہوئی اور کہاں کہاں لوگوں کو کتنی کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر حال ۱۹۴۹ء میں اس مصنف نے بڑی توجہ سے اس کی تحقیق کی، خاص طور سے ان عیسائی رضا کاروں کی مدد سے جو شرنارتھیوں اور اغوا شدہ عورتوں کے کیمپوں میں کام کرتے تھے اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ پتہ لگانا دشوار ہے کہ کس طرف زیادہ ہنگامہ ہوا ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں دونوں طرف اتنا کچھ ہوا تھا کہ افسوس اور ندامت کا اظہار کیا جائے لیکن ۱۹۵۶ء میں بھی پاکستان میں حکومت اور شہریوں کی طرف سے جو لکھا اور شائع کیا جا رہا ہے اس میں ۱۹۴۷ء کے خون۔ خرابے کے متعلق اپنے آپ کو بھی متہم نہیں کیا جاتا۔ پاکستان میں بعض اردو ناول ایسے لکھے گئے ہیں جن میں ۱۹۴۷ء کے واقعات کو فرقہ وارانہ انداز میں پیش کرنے کے بجائے انسانی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام رجحان میں ابھی کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ [معیاری رجحان ایک مثال: حکومت کی طرف سے شائع کی ہوئی۔ پاکستان، دی

مصر سنہ اُنیس سو میں ـــــــ ایک ادھ معاصر دستاویز

از

(جناب عابد رضا صاحب بیدار)

پنجاب کے مشہور اخبار، پیسہ اخبار کے مالک اور ایڈیٹر منشی محبوب عالم[1] نے ۱۹۰۰ء میں تقریباً چھ مہینے یورپ اور ممالک اسلامیہ کی سیاحت میں گزارے۔ ۲۷ر مئی کو ہندوستان سے روانہ ہوئے اور ۱۹ر نومبر کو بمبئی واپس پہنچے۔ ستمبر ۱۹۰۸ء میں سفرنامۂ یورپ کے نام سے انھوں نے اپنے حالات سفر شائع کئے[2]۔ یہ سفرنامہ تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تقریباً ۷۰ صفحے مصر پر لکھے ہیں۔

غیر ضروری اور انشائیہ باتوں سے قطع نظر انھوں نے اپنے جو کچھ مشاہدات بیان کئے ہیں وہ دم توڑتی ہوئی انیسویں صدی کے مصر کے عینی شاہد کی حیثیت سے ایک معاصر دستاویز کی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ ان کے اصل الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے حافظ عبدالرحمٰن امرتسری کے سفرنامۂ مصر کے ضمیمہ کے طور پر یہ اقتباس بھی دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور خالی از افادہ نہ ہوگا: (امرتسری کے سفرنامہ مطبوعہ برہان، اکتوبر ۵۸ء کے سلسلہ میں ایک اہم غلطی کا اعتراف کرلوں۔ شبلی کا سفرنامہ روم و مصر و شام ۱۹۱۴ء میں نہیں ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا ہے لیکن اس میں مصر کے بارے میں کوئی نادر

---

[1] پیسہ اخبار ۱۸۸۷ء میں گوجرانوالہ سے شائع ہونا شروع ہوا۔ بعد میں یہ لاہور آگیا۔ قیمت کی ارزانی اور خاص کر اپنے نام کے سبب یہ چل نکلا۔ محبوب عالم میں ایڈیٹر کی ساری اچھی خصوصیات موجود تھیں۔ پیسہ اخبار سے پہلے بھی کئی اخباروں کے ایڈٹ کرنے کا انھیں تجربہ تھا۔ سفر کا شوق اس پر مستزاد تھا۔ جس سے چشم دید اطلاعات مل جاتی تھیں۔
مولانا آزاد کے الہلال، ۱۹۱۴ء کے جنوری۔ جون کے کسی شمارہ میں بھی ان کے ایک سفر کی اطلاع ہے۔ وہ اس وقت یورپ میں تھے۔ پہلے سفر کے موقع پر اقبال نے ایک طویل الوداعی نظم بھی لکھی تھی جو سفرنامہ میں شامل ہے اور اس لحاظ سے اقبال کے نوادر میں سے ہے کہ یہ ان کے کسی مرتب مجموعے میں نہیں ملتی۔ منشی محبوب عالم کا تذکرہ مختلف اخباروں کے ذیل میں، اُردو اخبار کی پہلی تاریخ اختر شاہنشاہی میں، جگہ جگہ ملتا ہے "پنجاب میں اردو صحافت کی تاریخ" (قومی زبان۔ کراچی۔ یکم و ۱۵ر اگست ۱۹۵۸ء) مصنفہ انور قریشی، میں بھی ان کے بارے میں کچھ تفصیلات دی گئی ہیں۔ [2] سفر کے ۸ سال بعد اشاعت

یا اہم اطلاع درج نہیں) :

"... پورٹ سعید اب خاصا بارونق شہر (۱۸۹۷ء آبادی ۲۰۹۵۰) یورپین طرز کا سمندر کے کنارے اور نہر کے دہانے پر واقع ہے ...، شہر سے الگ ایک طرف تھوڑی سی آبادی ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ کسبیوں کی آبادی ہے جسے شہر سے الگ کر دیا گیا ہے ... (ص۹۰۶)

مصر میں ہر چیز گراں ہے، بلکہ قاہرہ میں تو بعض چیزیں اور مکانات یورپ سے بھی گراں ہیں ... (ص۹۰۷)

اجنبی کو پورٹ سعید میں جو بات سب سے نرالی معلوم ہوتی ہے، وہ عورتوں کا ایک برقعہ یا پردے کا سامان ہے اور یہی اسکندریہ، قاہرہ اور سوئز میں عورتوں کے چہروں پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ ایک لکڑی یا پیتل وغیرہ کی ریل کی صورت کی چیز ہوتی ہے، جس پر تاگا پرو کر اس کو (ص۹۰۸) سر سے ایسے طور سے باندھا جاتا ہے کہ یہ سیدھا ناک کے طول پر قایم رہتا ہے، اور ناک کے نیچے سے ایک سیدھا رومال ناف تک لٹکتا ہے۔ پیشانی پر سیاہ یا سفید پٹی باندھی جاتی ہے جس سے صرف عورتوں کی آنکھیں ننگی رہ جاتی ہیں اور باقی جسم سیاہ چادر سے خوب ڈھکا ہوا ہوتا ہے ..... (ص۹۰۹)

اسکندریہ میں ... البصیر، الاہرام روزانہ اخبار اور انیس الجلیس، ماہوار رسالہ کے علاوہ ایک فرانسیسی اخبار "الیگزینڈری، اور یونانی ایمونیا ..... کے علاوہ یورپین اخبار بہت بکتے ہیں ... یہاں میوہ جات کثرت سے ہیں، جن سے دکانیں لبریز نظر آتی ہیں۔ ان میں سے اکثر یورپ سے آئے ہوئے میوے بھی ہیں ... (ص۹۱۳)

رات دن میں تین مرتبہ ریل گاڑی اسکندریہ اور قاہرہ کے مابین آتی جاتی ہے۔ فاصلہ ۱۳۱ میل ہے۔ میں ۷ بجے صبح کو سوار ہو کر ۱۱ بجے قاہرہ پہنچ گیا ... (ص۹۱۳) راستہ میں آٹھ دس اسٹیشن پڑتے ہیں جن میں طنطا سب میں بڑا ہے اور بوجہ سید احمد بدوی علیہ الرحمۃ کا مدفن ہونے کے مصریوں کی نظر میں ویسا ہی قابلِ احترام مقام ہے جیسا کہ ملک شرق کے مسلمانوں میں شیخ عبد القادر جیلانی علیہ الرحمۃ کا مزار ہے۔ مصری یوں بھی بڑے قبر پرست معلوم ہوتے ہیں ..... (ص۹۱۴)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی وجہ سے سفرنامہ میں ذاتی مشاہدات کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں بعد کے واقعات بھی شامل کر دئے ہیں لیکن سب مستند ذرائع سے۔

ہر چند کہ یہاں برقی ٹریوے بہت دور تک چلتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہاں کے تنگ بازاروں میں چھوٹی چھوٹی بس گاڑیاں اور وکٹوریا گاڑیاں گھوڑوں سے چلتی ہیں لیکن سب سے بڑی سواری یہاں کے گدھے ہیں جو گو بہت چھوٹے قد کے ہوتے ہیں مگر بڑے تیز گام سبک رفتار اور مضبوط ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ ان کا کرایہ بھی سستا پڑتا ہے ۔ ۔ ۔ اس لئے بہت لوگ اس سواری کو پسند کرتے ہیں اس واسطے جابجا بازاروں میں کسے کسائے گدھے مع خربانوں کے نظر آتے ہیں، یہ گدھے والے اکثر لڑکے ہوتے ہیں جو تیز رفتاری میں اپنے گدھوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتے ۔ ۔ ۔ (ص ۹۱)

اہل مصر ج کو گ کی طرح تلفظ کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ (ص ۹۱) ث کو ت کی طرح ۔ ۔ ۔ جیسے کثیر کو کتیر اور د کو جب کہ وہ آخر کلمہ میں ہو ڈ کہتے ہیں مثلاً علی طریق الرشاد کو رشاڈ پڑھیں گے اسی طرح ق کو الف جیسے قدیم کو ادیم ۔ ۔ ۔ (ص ۹۱)

بخلاف ترکی کے مصر میں ابھی ہر مصری یورپین لباس نہیں پہنتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (ص ۹۲)

سب لوگ سوائے ترکوں کے جو ۔ ۔ ۔ آفندی کہلاتے ہیں، مصری کہلاتے ہیں ۔ ۔ ۔

مصر کی تمام آبادی مع ترکی اور عربی جزو کے ترکوں اور شامیوں سے شائستگی اور قابلیت میں بہت پیچھے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ (ص ۹۲)

۱۸۹۲ء میں خدیو توفیق نے انتقال کیا جب کہ موجودہ خدیو مع اپنے چھوٹے بھائی کے ویانا میں تعلیم پاتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ خدیو عباس بڑے روشن ضمیر اور لایق حکمراں ہیں اور بالکل اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ حکمرانوں کی طرح حکومت کرتے ہیں ۔ سوائے عربی اور ترکی کے، فرانسیسی، جرمنی اور انگریزی بخوبی جانتے ہیں مگر چوں کہ ایک طرف مصر پر ترکی کی ماتحتی اور دوسری طرف انگریزی کی نگرانی کا بار ہے، اس لئے ان کی حکومت عجیب بے اختیاری حکومت ہے ؎

غم صیاد و فکر باغباں ہے دو عملی میں ہمارا آشیاں ہے

گو گزشتہ چھبیس ۲۶ سال سے مصر پر انگریزی فوج کا قبضہ ہے لیکن چوں کہ فرانس نے اس قبضہ کو تسلیم نہیں کیا تھا اس لئے انگریز مصر پر اپنی من مانی حکومت نہیں کر سکتے تھے لیکن ۱۹۰۴ء

سے انگلستان نے فرانس سے مصر کے متعلق یہ معاہدہ کرلیا ہے کہ فرانس انگلستان کے قبضۂ مصر کی راہ میں حائل نہ ہو اور اس کے عوض میں انگلستان نے فرانس کو مراکش کی مداخلت کا پورا اختیار دے دیا ہے ... (صفحہ ۹۲۶)

اس طرح سے جو کبھی انگلستان کے مصر خالی کردینے کی امید تھی وہ بھی جاتی رہی ہے۔ گو پہلے پہل انگلستان و فرانس نے قرضۂ مصر کے انتظام کے لئے مصر میں مداخلت کی تھی مگر اب نہر سوئز جو ہندوستان کا شاہراہ ہے انگلستان کو ہرگز مصر چھوڑنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ جب تک کہ ملک ہندوستان انگریزوں کے ہاتھ میں ہے وہ ضرور مصر کو اپنے ہاتھ میں رکھیں گے۔ اس لئے مصر میں جو 'سلف گورنمنٹ' اور 'مصر مصریوں کے لئے' کی خواہش سے قومی فریق قایم ہوا ہے، سردست کوئی امید نہیں کہ انگریز اس کی پکار کی طرف توجہ کریں... (صفحہ ۹۲۶) فرانس اب ۱۸۸۷ء کی طرح تخلیۂ مصر کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ ٹرکی اپنی حالت میں خود حیران ہے ... ان حالات میں سوائے اس کے کہ مصر مدتِ مدید تک انگریزی نگرانی میں رہے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ گو ظاہراً انگریزی ایجنٹ صرف نگرانی کرتا ہے لیکن درحقیقت حکومت کی زمامِ کار اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے ... (صفحہ ۹۲۷)

لیکن یہ صریح بے انصافی ہوگی اگر ہم انگریزی قبضۂ مصر کی برکتوں کو صرف اس وجہ سے نظرانداز کردیں کہ انگریزوں نے بے انصافی سے اور اپنے ابتدائی وعدوں کے خلاف مصر پر اپنے قبضہ کو طول دے رکھا ہے۔ اگر صرف ایک بات، آزادیٔ پریس ہی کو لے لیا جائے تو اس کی بدولت اہلِ مصر کو اس قدر فوائد حاصل ہوئے ہیں کہ جن کا حصر میں آسکنا مشکل ہے۔ اس وقت مصر بلحاظ اشاعتِ اخبارات، پولیٹیکل مضامین پر آزادی سے بحث کرنے اور ہر قسم کی علمی کتابیں چھاپنے میں یورپ کے اچھے اچھے ملکوں کے برابر ہے۔ افسوس ہے کہ میرے پاس اس وقت صرف ۱۸۹۷ء تک کے اعداد ہیں۔ انگریزی قبضہ، بغاوت عربی پاشا فرو کرنے کے بعد ۱۸۸۲ء سے شروع ہوا اور اس پندرہ سال کے عرصہ میں مصر میں حسب ذیل مادی ترقی ہوئی:

۱۸۸۲ء میں مصر کی کل آبادی ۶۸ لاکھ ۱۳ ہزار تھی جو ۱۸۹۶ء میں ۹۷ لاکھ ۳۴ ہزار ہوگئی...،
شہروں اور موضعوں کی تعداد ۲۴۷ ۱۳ تھی جو ۱۸۹۷ء میں ۱۴۲۸۱ ہوگئی، محاصل ۹۰ لاکھ پونڈ
تھے جو ۹۷ء میں ایک کرور ۱۱ لاکھ پونڈ تک پہنچ گئے (بحالیکہ بعض محصول اور ٹیکس کاشتکاروں کے
معاف کئے گئے)، تجارت درآمد ۱۰ لاکھ ۸ ہزار ٹن تھی جو ۲۲ لاکھ ۶۲ ہزار ٹن ہوگئی، محصول
چونگی اڑھائی لاکھ پونڈ...... ۳۰ لاکھ ۹۳ ہزار پونڈ تک پہنچ گیا، کل ملک میں ۴۴ ڈاکخانے
تھے جو ۲۸۷ ہوگئے، تقریباً پانچ ہزار لڑکے مدارس میں تھے جو دس ہزار ہوگئے اور معلموں کی
تعداد سہ چند ہوگئی، ۱۸۸۰ء میں خرچ فوج ۲۴ ہزار پونڈ تھا جو ۱۸۹۷ء میں ۸ لاکھ ۲۶ ہزار
پونڈ سے اوپر ہے... (ص ۹۲۸) ۱۸۸۰ء میں مصری قرضہ کی تعداد ۹ کروڑ ۸۷ لاکھ پونڈ تھی اور
سود وادائیگی ۴۰ لاکھ ۶۰ ہزار پونڈ تھا جو ۱۸۹۷ء میں ۹ کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ اور سود وغیرہ ۳۸ لاکھ
۶۳ ہزار پونڈ رہ گیا، اسی طرح آج تک بہت کچھ ترقی ہوچکی ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں کل محاصل
ایک کروڑ ۸۴ لاکھ پونڈ سے متجاوز تھے اور تعداد طلبار مدارس سرکاری میں ۱۹۰۵ء میں انیس ہزار
تک بڑھ گئی ہے۔ ۱۸۸۳ء میں لارڈ ڈفرن نے حالاتِ مصر کی جو رپورٹ لکھی تھی اس میں اس
ملک کی تعلیم کا یوں تذکرہ کیا تھا: (ص ۹۲۹)

"اس وقت مصر میں جتنے مدرسے موجود ہیں وہ تین قسم کے ہیں"

اول جامع الازہر: اس میں آٹھ ہزار طالب علم ہیں جن کو تین سو استاد تعلیم دیتے ہیں
اور اس میں علوم ذیل پڑھائے جاتے ہیں: علم کلام، فقہ، نحو، منطق اور عربی زباں دانی۔

دوم: وہ مدرسے جن کو مصر میں غیر ممالک کے لوگوں اور ان کی مشنری جماعتوں نے قائم
کیا ہے۔ ایسے مدارس کی تعداد ۱۵۲ ہے اور ان میں ۲۴۱۲ طالب علم پڑھتے ہیں۔ طلبہ کی
اس تعداد میں ۱۹۴۶ خاص مصری لڑکے ہیں یعنی ۵۲ فی صدی۔ اوران مدارس میں بعض مدرسوں
کو حکومتِ مصر کی طرف سے مالی مدد بھی ملتی ہے۔

سوم: خاص حکومت کے مدارس اور ان کے چار درجے ہیں... (ص ۳۲-۹۲۹)

۳۱ر دسمبر ۱۹۰۵ء کو سرکاری نگرانی میں آٹھ مختلف پیشوں کی تعلیم کے کالج، چار خاص ٹکنیکل اسکول، ۳ سکنڈری اور ۳۴ پرائمری اسکول تھے جن میں بتمامہ یا ایک حد تک فرانسیسی یا انگریزی میں تعلیم دی جاتی تھی۔ ان میں ۷۴۸ مدرسین اور ۱۰۳۱۲ شاگرد تھے جن میں ۸۰۷ لڑکیاں تھیں۔ ان کے علاوہ سات خاص اور ٹکنیکل اور ۱۰۹ پرائمری تھے جن میں صرف عربی زبان میں تعلیم ہوتی تھی۔ ان میں ۲۵۲ استاد اور ۸۳۵۰ استاد تھے (جن میں ۱۹۰۲ لڑکیاں تھیں) اور ۱۳ پرائیویٹ پرائمری اسکول اور ۳۲۲۴ کتاب جنہیں سرکاری افسران تعلیم معائنہ کرتے ہیں ان کے علاوہ ہیں ....

جامع الازہر میں ۹۷۵۸ طلباء جو علوم دین کی تعلیم ۳۱۷ استادوں سے حاصل کرتے ہیں اور جامع الاحمدی طنطا میں ۵۱۶۱ طلباء ۷۰ استادوں سے علم دین پڑھتے ہیں۔

مصر کے ان سرکاری، ابتدائی (مڈل) اور تجہیزی یا ثانوی (ہائی) اسکولوں میں نصاب تعلیم حسب ذیل مضامین پر مشتمل ہے: (ص ۹۴۳)

مدارس ابتدائی: القرآن والاسلام، اللغۃ العربیہ، الترجمہ، الخط، الحساب، الهندسہ (مبادی قلیلہ)، انگلیزیہ (او الفرانسیہ)، دروس الاشیاء، الجغرافیہ و الرسم (مصوری) التاریخ (مبادی)۔

مدارس ثانوی: الترجمہ، اللغۃ العربیہ، الانگلیزیہ (او الفرانسیہ)، الریاضیات، الجغرافیہ، التاریخ، الطبیعات، الکیمیا، الرسم (مصوری) التمرین العضلی (ورزش) ص ۹۴۳-۳۵

... اگرچہ مرحوم شیخ محمد عبدہ کی جدوجہد ترقی الازہر میں ناکام رہی تاہم انھوں نے طلباء کے دلوں میں تاریخ اور طبیعات وغیرہ علوم جدیدہ کے مطالعہ کا شوق ضرور پیدا کردیا جس کی وجہ سے اب بعض طلباء کسی قدر ان علوم کی کتابیں دیکھنے اور آزادی بحث اور خواہش وسعت معلومات اور مفید علوم میں تمیز کرنے کی صفات سے بہرہ در ہوگئے ہیں۔ اس وقت ازہر میں دس ہزار سے زائد طالب علم باعتبار سکونت مختلف گروہوں میں منقسم ہیں اور ہر فرقہ مسجد

کی چھت یا ڈروس کے ایک مکان میں رہتا ہے جس کے اندر بہت سے حجرے ہیں اور یہ مکان رواق کہلاتے ہیں۔ الازہر میں ایسے ۲۷ رواق ہیں منجملہ ان کے ۱۱ خاص سرزمینِ مصر کے باشندوں کے لئے ہیں جن کی تقسیم شہروں یا مذاہب کے لحاظ سے ہے ... (ص ۹۴۰) معلوم ہوا کہ نہ طلبا کی کوئی مستقل جماعت بندی ہے نہ وقت کی پابندی نہ رجسٹر حاضری، نہ سالانہ امتحان کی قید۔ اس لئے بعض لوگ ساری ساری عمریں ازہر میں خرچ کر دیتے ہیں اور کسی منزل تک نہیں پہنچتے ... (ص ۹۴۳) ... ۱۹۰۲،۰۰۰ ء میں ... (ص ۹۰۳) ہندی طلبا ۳ (تھے) ... (ص ۹۴۴)

قاہرہ میں بہت سے روزانہ ہفتہ وار اخبار اور ماہوار رسالے عربی زبان میں شائع ہوتے ہیں جن میں بعض مسلمانوں اور بعض عیسائیوں کے ہیں۔ روزانہ اخبارات میں المؤید سب سے بڑا اخبار ہے اور اب اللواء بھی ترقی کر رہا ہے اور برقی طاقت سے شائع ہوتا ہے۔ گو المؤید کے ہوشیار مالک شیخ علی یوسف صاحب کی لیاقت اور رسوخ سے ان کا سکہ ایسا بیٹھ چکا ہے کہ مصر کے اچھے اچھے لوگ المؤید سے ڈرتے ہیں۔ المؤید دولتِ عثمانیہ کا طرفدار ہے مگر انگریزی قبضۂ مصر سے بھی اظہارِ مخالفت نہیں کرتا، اور شاید دنیا میں مسلمانوں کا سب سے بڑا اخبار ہے، مجھ سے شیخ ... بڑی مہربانی اور محبت سے پیش آئے اور ان سے دو تین ملاقاتیں ہوئیں۔ آخری روز جب میں ان سے رخصت ہوا، تو افسوس کرتے تھے کہ میں نے اتنی جلدی رخصت ہونے کا ارادہ کر دیا۔ اس پر انھوں نے میری کچھ کیفیت حسنِ ظن کے ساتھ اس روز کے المؤید میں شائع کی اور مجھے اپنا فوٹوگراف بھی دیا۔ یہ دبلے پتلے چھوٹے قد کے آدمی ہیں اور وطنی لباس پہنتے ہیں۔ سوائے عربی زبان کے کوئی مغربی زبان نہیں جانتے مگر عربی لکھنے اور معاملات کے سمجھنے میں بڑے لائق ہیں۔ ان کے نائب ایڈیٹر انگریزی اور فرانسیسی زبانیں جانتے ہیں۔ دورانِ گفتگو میں میں نے ان سے ذکر کیا کہ ہندوستان میں انگریزی زبان کے اخبارات دیسی (ص ۹۵۵) زبان کے اخبارات سے زیادہ معزز اور بڑے ہوتے ہیں انھوں نے کہا مصر میں صورت اس کے برعکس ہے۔ وہاں عربی زبان کے اخبارات سب سے بڑے ہیں ... میں نے پوچھا المؤید کی اشاعت کس قدر

ہے، آپ نے کہا آٹھ ہزار روزانہ ہے۔ یہ اشاعت ہندوستان کے شاید ہی کسی انگریزی اخبار کی بمشکل ہو۔ مصر میں بازاروں میں اخبارات بکنے کا رواج بہت ہے اور عام لوگوں میں اخبار خرید کر پڑھنے کا مذاق بھی خوب پیدا ہوگیا ہے۔

میں مصطفےٰ کامل صاحب ایڈیٹر و مالک اللواء سے بھی ملا جنہوں نے ابھی سال گذشتہ میں روزانہ اخبار جاری کیا تھا۔ لیکن ان کی ذات کی شہرت ان کے اخبار سے بھی زیادہ ہے۔ یہ ایک چھریرے بدن کے خوبصورت نوجوان ہیں، یورپین لباس پہنتے ہیں۔ پہلے انھوں نے قانونی پیشہ کے لئے تعلیم حاصل کی تھی لیکن حب الوطنی نے جوش مارا انھوں نے اس بات کی تائید میں لکچر دینے شروع کئے کہ انگلستان نے مصر میں عربی پاشا کی بغاوت کے وقت فوج بھیجتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ جب امن ہو جائے گا تو مصر خالی کر دیا جائے گا۔ لیکن اب اس بات کو مدت طویل گزر چکی ہے اور مصر میں ہر طرح سے امن بھی ہے۔ اب انگلینڈ اپنے وعدے کو ایفا کرے۔ یہ عربی زبان کے علاوہ فرانسیسی میں بھی اچھی تقریر کر سکتے ہیں .... انھوں نے خیر و عافیت کے بعد مجھ سے پوچھا کہ ہندستان میں تم لوگوں کا کیا حال ہے، تو میں نے کہا اچھا ہے۔ ہم لوگ تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور انگریزی حکومت کے زیر سایہ ہمیں ہر طرح کی اصلاح اور ترقی کی آزادی حاصل ہے ... (ص ۹۵۹) میں نے جوانانِ مصر کی تعلیم، قومی خیالات اور خلوص اور کیریکٹر کی نسبت ان کی رائے دریافت کی تو انھوں نے جواب دیا کہ بے شک وہ بہت ہوشیار اور معقول اور اہلِ خلوص ہیں .... خاتمہ یہ کہا کہ مصر میں کئی شیر غاروں میں سوتے ہیں جو بوقت ضرورت نکل آئیں گے۔ لیکن میرے ہمراہوں محمد لشکری اور عابدین آفندی نے مجھے راستہ میں یقین دلایا کہ مصر کے نوجوان اکثر نالایق ہیں ... بہر حال مصطفیٰ کامل صاحب ہونہار اور پرجوش آدمی معلوم ہوتے ہیں اور ان کا اخبار ترقی کر رہا ہے میرے واپس آنے کے بعد مصطفیٰ کامل پاشا کو بہت کامیابی ہوئی ہے۔ ان کے ہم خیال لوگ بہت بڑھ گئے ہیں اور ۱۹۰۷ء سے انھوں نے مصریوں کے قومی گروہ کے اغراض کی اشاعت کے لئے روزانہ اللواء کے ایک فرانسیسی اور ایک روزانہ اخبار

نے تا نذر ر ایجنیاں" اور " دی ایجپشین سٹینڈرڈ" جاری کئے ہیں۔ مصر کی آزادی کے لئے کوشش کرنا اور بابِ عالی کی حمایت مصطفیٰ کامل پاشا کی پالیسی کا خلاصہ ہے۔

"المقطم" یہ مسیحی روزانہ اخبار انگریزی قبضۂ مصر کا اکیلا آرگن ہے۔ فارس نمر... اس کا ایڈیٹر ہے۔ یہ اخبار خبروں میں متانت کا لحاظ رکھ کر اندرونی معاملات پر خوب لکھتا ہے۔ مگر عثمانی حکومت کی پالیسی پر ضرور منہ آتا ہے۔ وہ ترکوں پر بعض اوقات معقول اعتراض کرتا ہے۔ سب سے مقدم پالیسی اس اخبار کی، انگریزوں کی رضا جوئی ہے... (صلا۹۶)

"الاہرام" یہ بھی عیسائی روزانہ اخبار ہے جو عام مصری پبلک اور عثمانی پالیسی کو راضی رکھنا چاہتا ہے۔ بعض اوقات یہ فریخ حقوق کا بھی پاس کرتا ہے اور عموماً بے رو و رعایت لکھتا ہے۔ ان کے علاوہ "المنیر و الظاہر وغیرہ" اور کئی ایک روزانہ اور ہفتہ وار پولیٹیکل اخبار بھی قاہرہ سے شائع ہوتے ہیں۔ ماہوار رسالے الہلال، المنار، الحیات، المقتطف، انوار الاسلام وغیرہ کئی نکلتے ہیں کہ جن کی فہرست بہت لمبی ہے۔ ان میں سے میں رشید آفندی صاحب ایڈیٹر المنار سے ملا۔ یہ بڑے لائق اور فاضل نوجوان ہیں۔ السید محمد عبدہ صاحب مفتی دیار مصر آپ کے اعزہ سے ہیں۔ آپ نے ان سے میری ملاقات کرائی۔ مفتی صاحب علوم دینیات میں فاضل اجل ہیں اور زمانہ حال کے حالات سے بھی بے خبر نہیں۔ آپ اپنے اعلیٰ عہدے کی بہت سی ذمہ داریوں کے علاوہ اکثر سرکاری اور غیر سرکاری مجلسوں کے رکن رکین ہیں اور رفاہِ عام کے کاموں میں مدد کرنے کے دل سے ساعی رہتے ہیں۔ مفتی صاحب نے ایک روز مجھ سے مسلمانانِ ہندوستان کی تعلیمی کیفیت دریافت کرکے کہا کہ کیا ایسی دنیاوی تعلیم سے طلبا، مذہب کو تو نہیں بھول جاتے۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ کیا سوائے اسلام کے دیگر ادیان کے نیک لوگ بھی مستحق مغفرت ہیں یا نہیں فرمایا کہ جو نیک بندے خدا کو مانتے ہیں وہ بخشے جائیں گے..... آپ نے اپنی تصنیف سے رسالہ التوحید اور تقریر مفتی دیار مصر کے کئی نسخے دئے۔ ایک روز میں ازہر میں ان کے درسِ تفسیر میں بھی شامل ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ ۱۹۰۵ء میں ایسے علامہ کا انتقال ہو گیا ہے ... (صلا۹۶۹)

مفتی صاحب فرانسیسی بول سکتے تھے، اور کہتے تھے کہ قصد ہے کہ چھ ماہ انگلستان میں رہ آؤں تاکہ انگریزی بولنا سیکھ لوں اللہ! کیسے اولو العزم بزرگ تھے ... (ص ۹۶۲)

مصر میں بیماریِ چشم کا عارضہ بہت ہے ... مصری اکثر شافعی اور مالکی مذہب کے پیرو ہیں اس لئے تمام پانی کے جانور ... کھا جاتے ہیں ... مصری شراب بھی عموماً پیتے ہیں اور بہت کم ہوں گے جو نہ پیتے ہوں ... (ص ۹۶۴) مصر میں سلام کا طریقہ مجھے بڑا عجیب معلوم ہوا۔ دو شخص ایک دوسرے سے مل کر آپس میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں، چلئے سلام ہو چکا۔ شام کی طرح یہاں بھی لوگ رخصت کے سلام کے وقت مع السلامہ کہتے ہیں ... عیسائی جب ملتے ہیں تو السلام علیکم کے بجائے 'سعیدی' کہتے ہیں۔ 'سیدی'، 'مولای' کہنے کا تکلف کی گفتگو میں رواج ہے۔ سر آنکھوں پر کہنے کے لئے 'بالراس والعیون' یا 'عیونی' بھی کہتے ہیں ... (ص ۹۶۵)

۹ ر نومبر کی شام کو میں جہاز پر سوار ہو گیا ..... اس جہاز کا دوم درجہ کا کرایہ سوئز سے ۱۹ پونڈ ۱۰ شلنگ اور سوم درجہ کا ۹ پونڈ بمبئی تک تھا ... (ص ۹۶۶) ۱۲ ر نومبر کو عدن سے چل کر ۱۹ ر کی شب کو ۱۲ بجے جہاز بندر بمبئی میں پہنچ گیا ... (ص ۹۶۷)

فارسی و اُردو کی چند کمیاب کتابیں

کتاب خانۂ دانش گاہ دہلی میں

از

(جناب نثار احمد صاحب فاروقی)

(۳)

مقدمہ : سفرنامہ حکیم ناصر خسرو علوی بلخی

['برہان' کی گذشتہ اشاعت میں سفر نامہ ناصر خسرو کے اس مطبوعہ نسخے کا تفصیلی تعارف کرایا گیا تھا، جسے ۱۸۸۲ء میں مولانا الطاف حسین حالی مرحوم نے مرتب کر کے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس قسط میں ان کے مقدمے کا اُردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو اُردو داں حلقے کے سامنے پہلی بار آرہا ہے۔ مولانا حالی کی تعلیم اگرچہ باضابطہ نہیں ہوئی تھی لیکن وہ اُردو، فارسی اور عربی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ اُن کی اُردو نثر میں سادگی اور تاثیر کی خصوصیت ایسی تھی جسے اُن کے ہم عصروں میں کوئی نہیں پہنچا۔ اُن کے مقلدوں میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی بھی سادہ نثر لکھنے میں کمال رکھتے ہیں۔ عربی میں اُن کے دو ایک خطوط، مجموعۂ مکاتیب میں شامل ہیں اُنھیں دیکھ کر مولانا کی عربی دانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ فارسی عبارت میں بھی سادگی اور بے ساختگی موجود ہے اُن کی عبارت "منشیانہ" نہیں ہے نہ اس میں "محمد شاہی روش" ملتی ہے، ایسی فارسی ہے جسے اگرچہ اہلِ ایران کی تحریروں کے سامنے تو پیش نہیں کیا جاسکتا، لیکن ہندستانی فارسی دانوں میں شاید ہی کوئی حالی کا ہم عصر اتنی پاکیزہ فارسی لکھنے پر قادر رہا ہو۔ یہاں اُن کی فارسی عبارت کا تھوڑا سا اقتباس دیا جاتا ہے اس کے بعد پورے "مقدمہ" کا اُردو ترجمہ۔ ترجمے میں کوشش کی گئی ہے کہ ترالفظی نہ ہو، اصل کا مطلب

پوری طرح ادا ہو جائے اور بس۔

پہلے فارسی عبارت کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے:

"راس ورئیس مدعیانِ حکیم یکے مفتیٔ خراسان بود حنفی المذہب و دیگر حاکم بلخ کہ در اکثرے از اشعار دے روی شکایت با ایشان است و قصائد بسیار کہ دریں خصوص گفتہ است دلالت دارد بر اینکہ تا آخر عمر از دوریٔ وطن و جورِ اہالیِ وطن می نالید و شب و روز فریاد و زاری می کرد۔"

ترجمے میں ایک التزام یہ کیا گیا ہے کہ جہاں کسی فارسی عبارت کا اقتباس ہے وہ محولہ کتاب کے اصل الفاظ میں نقل کر دیا جائے۔ اُس کا ترجمہ ساتھ دے دیا گیا ہے۔ نثار احمد فاروقی]

سیرتِ حکیم ناصر خسرو۔ صاحبِ سفرنامہ رقم زدہ کلکِ گہر سلک جنابِ مولوی خواجہ محمد الطاف حسین صاحب انصاری پانی پتی مقیم دہلی متخلص بہ حالی سلّمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - نحمدہ و نصلّی علی نبیہ الکریم

اس سفرنامے کا مصنّف حکیم ابو المعین ناصر بن خسرو علوی خطۂ خراسان کے قدیم شاعروں میں سے ہے جو شاعری کے علاوہ علم و حکمت اور فضل و دانش میں شہرۂ روزگار تھا۔ مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے اس کا حال لکھنے میں تحقیق و تلاش سے کام نہیں لیا۔ صحیح اور غلط روایتوں میں تمیز نہ کر کے انھوں نے اس کے حالات پر اور پردے گرا دیئے ہیں۔ چناں چہ اگر اُس کا یہ سفرنامہ اور دیوان کے بعض اجزا ہاتھ نہ لگتے تو اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ ہم بھی اُن تذکرہ نگاروں کا اتباع کریں اور صحیح راستے سے دور جا پڑیں۔

اس معاملے میں جتنا غور کیا جائے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم کے معاصروں میں سے کسی نے اُس کا حال لکھنے کی تکلیف نہیں کی اور بہت برسوں تک اُس کے حالات ضبطِ تحریر میں نہ آسکے۔ بظاہر ان بے اعتنائیوں کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں شیعوں اور سنیوں کے علماء و فقہا، جن کا آگے تذکرہ کیا جائے گا، اُسے فرقۂ اسماعیلیہ[1] کا پیرو سمجھتے تھے۔ اِن اسماعیلیوں کا لقب ملاحدہ

[1] اسماعیلیہ ایک امامیہ گروہ ہے جو اسماعیل بن جعفر صادق کو ان کے بعد امام برحق جانتا اور مانتا ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے

اور باطنیہ تھا۔

اس لئے غالب امکان ہے کہ زمانۂ دراز تک دونوں فریقوں میں سے کسی نے اُس نفرت کی بنا پر جو اختلافِ مسلک کے تعصب سے پیدا ہوتی ہے۔ حکیم موصوف کا ترجمہ لکھنے کی طرف توجہ نہیں کی لیکن جب بعد کے زمانے میں حکیم کا دیوان اشعار اور دوسری تصانیف تمام ممالک میں پھیل گئیں اور اس کے معتقدوں کا گروہ کوہستان بدخشاں کے اطراف سے، جہاں حکیم موصوف کا مرقد ہے، جوق در جوق نکلنے لگا تو سب تذکرہ نگار اُس کے حالات کی تحقیق اور اُس کی تصانیف کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہوئے، لیکن ہوا یہ کہ جو کچھ رطب و یابس انھیں ملا، یا انھوں نے عام لوگوں سے جو افواہ سنی اسے بے تکلف اپنی کتابوں میں داخل کرلیا۔ اور وہ افسانے بھی جو حکیم کے معتقدوں نے اپنی طرف سے گھڑ کر حکیم سے منسوب کردئے تھے حکیم ہی کے اقوال سمجھ کر اُس کی تصانیف سے رجوع کرکے کھرے کھوٹے کی تمیز کئے بغیر نقل کردئے۔ اس طرح حکیم کے حالات پر گہرے پردے پڑتے چلے گئے اور صحیح واقعات کا کھنگالنا بہت مشکل ہوگیا۔ اگرچہ اب اس زمانے میں چارلس شیفر نامی ایک یورپی فاضل نے فرانسیسی زبان میں ناصر خسرو کے حالات شرح وبسط سے لکھے ہیں لیکن فرنچ زبان سے واقف نہ ہونے کے باعث ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس تحقیق سے کہاں تک عہدہ برآ ہوسکا ہے اور کہاں تک اس نے دادِ تنقید[1] دی ہے۔ لہٰذا اس کے حالات لکھتے وقت ہم صرف انھیں اقوال ورِوایات سے استفادہ کریں گے جو معقول اور قابلِ یقین ہیں اور باقی اس کے اپنے کلام سے استنباط کرکے لکھا جائے گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کہ امام جعفر صادق نے منصب امامت انھیں تفویض کیا تھا اور اسماعیل کی ماں کے ساتھ کسی دوسری عورت یا لونڈی کو جمع نہیں کیا تھا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کے ہوتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں دوسرا نکاح نہ کیا۔ نیز یہ لوگ اسماعیل کو خاتم الائمہ کہتے ہیں اور ان کے بعد ہونے والے چھ اماموں کو نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ امامت کا مدار سات ائمہ پر ہے جس طرح سات دن، سات آسمان اور سات ستارے ہیں۔ حالی

[1] اصل جملہ ہے: "و تا کجا دادِ تنقید دادہ است" اس پر نشان لگا کر حاشیے میں مولانا حالی نے لکھا ہے "تنقید یعنی نقادی" اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۸۲ء تک یہ لفظ نقد و انتقاد کے معنوں میں استعمال ہونے لگا تھا۔ لیکن اُردو کی کسی . . . . . اتنی قدیم عبارت میں اس کی سند ہماری نظر سے نہیں گذری۔ (فاروقی)

سالِ ولادت | سب سے پہلا اختلاف اس کے سالِ ولادت کے تعین میں ہے۔ حمداللہ مستوفی قزوینی نے تاریخ گزیدہ میں ۳۸۵ھ ہجری نبوی لکھا ہے اور مصنف دبستان المذاہب نے ۳۵۹ھ۔ صاحب حبیب السیر ۳۵۸ھ بتاتا ہے لیکن یہ تینوں اقوال غلط ہیں۔ صحیح ترین قول وہ ہے جو رضا قلی خاں نے مجمع الفصحا[1] میں نقل کیا ہے یعنی ۳۹۴ھ۔ چارلس شیفر نے اپنے نوشتہ حالات میں یہی قول آخر اختیار کیا ہے اور خود حکیم کے قول سے استناد کیا ہے وہ اپنے بعض قصائد میں لکھتا ہے۔

بگذشت زہجرت پس سی صد نود وچار بنہاد مرا مادرِ بر مرکز اغبر

مولد | نیز بعض تذکرہ نویسوں نے حکیم کی اصل اصفہان سے بتائی ہے لیکن کوئی قرینِ اعتبار دلیل نہیں دی لیکن چند قرائن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اسے اصفہان یا عراق عجم[2] اور پارس کے دوسرے شہروں سے کوئی پشتینی تعلق نہیں رہا اس کے اسلاف اور بزرگ مامون الرشید کے عہد حکومت سے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ امام علی ابن موسی الرضا کے زمانے سے جو ناصر خسرو کے آٹھ پشت اوپر دادا ہوتے تھے، ہمیشہ خراسان میں رہے اور بلخ شہر جو ایک زمانہ دراز تک ولایتِ خراسان کا دار السلطنت رہا ہے، یہی حکیم ناصر خسرو کا مولد ہوگا۔ جیسا کہ خود حکیم نے کہا ہے ؎

اے بادِ عصر گر گذری بر دیار بلخ بگذر بخانۂ من و آں جا بجوی حال

اور اسی طرح اپنے بہت سے اشعار میں خراسان اور اہلِ خراسان سے جدائی پر افسوس کا اظہار کیا ہے جیسا کہ ہر شخص کو وطن سے دور ہوتے اور غربت کے عالم میں ملال ہوتا ہے۔ سفر نامے میں بھی ایسی متعدد عبارتیں ہیں جو اس امر پر وضاحت کی روشنی ڈالتی ہیں۔

تعلیم | بہر حال حکیم کا سلسلۂ نسب سات واسطوں سے امام ہمام علی بن موسی الرضا علیہ التحیۃ والثنا پر منتہی ہوتا ہے جو مشہدِ مقدس میں مدفون اور شاہِ خراسان کے لقب سے معروف ہیں۔ کہا جاتا ہے

---

[1] یہ تذکرہ امیر الشعراء رضا قلی خاں متخلص بہ ہدایت کی تالیف ہے جو ۱۲۹۵ھ میں دار السلطنت تہران میں شائع ہوا اور اب ہندوستان میں پہنچا ہے۔ حالی

[2] عراق عجم اور پارس ممالک ایران کی دو ولایتوں (صوبوں) کے نام ہیں۔ مجازاً تمام مملکتِ ایران کو پارس کہا جاتا ہے۔ حالی۔

کہ حکیم نو سال کی عمر میں حفظ قرآن مجید سے مشرف ہوا اس کے بعد سالہا سال تک معقول و منقول کے علومِ مروجہ و متعارفہ کی تحصیل میں مشغول رہا اور علومِ غریبہ و فنونِ متنوعہ مثل نجوم و رمل اور دوسرے تمام فنون جو اس عہد میں کمال کی سند سمجھے جاتے تھے اور ان کی تحصیل کے بغیر کسی کو فرزانہ و دانش مند نہ سمجھا جاتا تھا، حاصل کرتا رہا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ علوم دین اور فلسفہ و دانش کے علاوہ، جو اس زمانے کے اہلِ اسلام میں رائج تھے، حکیم نے توریت و انجیل اور تمام مقدس مذہبی کتابوں کا بھی گہرا مطالعہ کیا اور اتنا کمال بہم پہنچایا کہ فضلائے یہود و مسیحی اپنی مذہبی کتابوں کا درس حکیم سے لیا کرتے تھے جو کچھ خود حکیم کے کلام اور اس کے سفرنامے سے مستفاد ہوتا ہے اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ عبرانی زبان اور رسم الخط سے واقف تھا کیوں کہ فلسطین کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے بعض ایسے کتبوں کی تشریح کی ہے جو عبرانی زبان میں لکھے ہوئے تھے۔

دربار میں توسل | القصہ، کمالاتِ علمی میں پوری دستگاہ حاصل کر لینے کے بعد وہ لوگوں کو درس دیتا رہا۔ اپنے درس میں وہ دقیق فلسفیانہ مسئلوں اور نکات مغلقات کی توضیح و تفسیر کرتا تھا۔ یہاں تک کہ کسی تقریب سے بلخ سے نکل کر مرو شاہجان میں آیا جو ان دنوں روسی حکومت کے زیرِ نگیں ہے۔ آج کل مرو اگرچہ تاتار کی مطلق العنان حکومت میں سمجھا جاتا ہے لیکن اگلے زمانے میں یہ ممالک خراسان کے شہروں میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا اور سلجوقیوں کا پائے تخت تھا سلاطینِ عجم اور اسلامی سلطنت کے زمانے میں بہت سے علما و فضلا اس شہر میں پیدا ہوئے۔ بہرحال ناصر خسرو، مرو میں بہت مشہور ہوا۔ اس عہد میں طغرل بک سلجوقی نشاپور میں اور اس کا چھوٹا بھائی چغر بک مرو میں مسندِ حکومت پر متمکن تھے۔ امیر ناصر کو چغر بک کی خدمت میں قربت اور اختصاص حاصل ہو گیا اور وہ حکومت کے دبیروں میں شامل کر لیا گیا۔ جیسا کہ خود اپنے سفرنامے میں اس نے لکھا ہے کہ وہ سلطنت کے اعمال اور اموال نیز مہماتِ دیوانی میں دخیل تھا۔

تاریخ تمدنِ اہلِ اسلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے زمانے میں جو لوگ "فلاسفۂ اسلام" کے لقب سے مشہور ہوتے سب کے سب ترک و تجرید کے عالم میں زندگی بسر کرتے تھے اور سلاطین و ملوک

کی خدمت میں ہرگز مصروف نہ ہوتے تھے۔ ان فلاسفہ میں جس شخص نے سب سے پہلے سلاطین وملوک کی خدمت کو اپنا شعار بنایا وہ شیخ الرئیس بوعلی ابن سینا تھا جس کی زندگی کا بڑا حصہ آل بویہ کی وزارت میں گزرا۔ صاحب روضۃ الصفا لکھتا ہے:

"بعد از شیخ الرئیس اکثرے از حکمائی اسلام کہ ملازمت حکام وارباب فرمان اختیار کردند ہمہ اقتدا بہ شیخ کردہ اند"

شیخ الرئیس کے بعد فلاسفۂ اسلام کی اکثریت میں جس نے بھی کسی حاکم یا فرماں روا کی ملازمت کی، انھوں نے شیخ ہی کی پیروی کی۔

چوں کہ شیخ ابوعلی[1] اور ناصر خسرو کی اصل بلخ ہی سے تھی اور شیخ کو آل بویہ کی وزارت کے زمانے میں جو عروجِ جاہ وحشمت نصیب ہوا، اس کا شہرہ ناصر نے[2] اپنے دورۂ شباب میں سُنا ہوگا اور ناصر خسرو نے یقین کے ساتھ یہ جانا ہوگا کہ شیخ کو جو شہرت اور جاہ وحشمت نصیب ہوئی یہ صرف قربِ سلاطین کے سبب ہوئی ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ان اسباب نے خسرو کو بھی آل سلجوق کی خدمت کرنے کی ترغیب دلائی اور گوشۂ عزلت سے نکال کر دارالسلطنت مرو میں کھینچ بلایا۔

ترک خدمت | اگرچہ ناصر خسرو کو چغری بک کی ملازمت سے علیحدہ ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا جیسا کہ ہم آیندہ بیان کریں گے۔ اور پھر کبھی اس نے ملازمت کی سوچی بھی نہیں لیکن اس کا بھائی خواجہ ابوالفتح عبدالجلیل طغرل بک کے عہد میں اور اس کا لڑکا خواجہ معین الدین ملک شاہ سلجوقی کے زمانے میں مدتِ دراز تک دیوان کے ملازم اور "معتمدِ درگاہ" رہے۔

اسی طرح ۴۳۷ھ تک کہ اس وقت ناصر خسرو کی عمر ۴۲ سال ہوئی تھی، وہ چغری بک کی ملازمت میں رہا یہاں تک کہ سفر حجاز کے ارادے نے اُسے ملازمت چھوڑنے پر اُبھارا جس کا ذکر اپنے سفرنامے میں حکیم نے کیا ہے۔ اب اس نے سرکاری کاموں کے اشغال سے پوری طرح کنارہ کشی کرلی اور جاہ

۱؎ بوعلی کا باپ بلخ کے حاکموں میں سے تھا اور نوح سامانی سلطنت کے زمانے میں بخارا کی طرف چلا گیا تھا، وہیں ۳۷۰ھ میں بوعلی کی پیدائش ہوئی۔ ۲؎ ناصر خسرو کی ولادت، شیخ کی پیدائش سے اکیس سال بعد ہوئی اور جب شیخ کا وصال ہوا ہے تو ناصر خسرو ۳۳ سال کا تھا۔ حالی

وحشمت کے تمام سازو سامان تیاگ دیئے۔ اپنے چھوٹے بھائی ابو سعید اور ایک غلام کو ساتھ لے کر سفر کے لئے نکلا، اس سفر کی روداد اس نے سفرنامے میں لکھی ہے۔ وہ خراسان، عراق عجم، اور آذر بائیجان کے شہروں میں ہوتا ہوا، آرمینیہ پہنچا۔ وہاں سے شام و فلسطین اور عراق وعرب کو عبور کرتا ہوا حج کے زمانے میں مکہ محترمہ میں وارد ہوا۔ حج سے فارغ ہو کر مصر گیا۔ تقریباً تین سال تک وہاں قیام کیا۔ مصر میں اقامت کے زمانے میں دو مرتبہ حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ منورہ جناب رسالت مآب (شرفہما اللہ تشریفاً) کے لئے حجاز آیا اور یہاں سے پھر مصر کو مراجعت کی۔ روضۃ الصفا، حبیب السیر اور دبستان المذاہب میں لکھا ہے کہ سات سال تک مصر میں مقیم رہا اور ہر سال حج کو جاتا تھا لیکن سفرنامے کی تصریح اس بیان کی تکذیب کرتی ہے۔

اُن دنوں مستنصر باللہ فاطمی عبیدی جو خلفائے فاطمیہ میں مشہور ترین خلیفہ ہوا ہے اور ساٹھ سال تک مسندِ خلافت پر متمکن رہا، مصر میں حکومت کرتا تھا۔ سفرنامہ سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حکیم کی دوستی سلطنتِ مصر کے ارکان میں کسی سے ہو گئی تھی اُسی کی وساطت سے وہ قصرِ خلافت میں پہنچا، وہاں کی عمارتیں، دربار اور ایوان کا مشاہدہ کیا۔ لیکن یہ تذکرہ حکیم نے کہیں نہیں کیا کہ وہ امیر المؤمنین مستنصر باللہ کے دربار میں بھی باریاب ہوا کہ نہیں لیکن قرائنِ صادقہ کی شہادتوں سے منکشوف ہوتا ہے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مستنصر نے اس کے ساتھ بہت مراعات کیں اور اپنی محبت و عقیدت اس کے دل میں پیدا کر دی تھی۔ (باقی)

ادبیات

غزل

از

(جناب آلم مظفر نگری)

خود یہ آواز بھی ہے صاحبِ آواز بھی ہے نغمۂ دل کی صدا سوز بھی ہے ساز بھی ہے

جس جگہ سوز ہے بے پردہ وہیں ساز بھی ہے شمع کے ساتھ ہی پروانۂ جاں باز بھی ہے

دیکھنا تھا یہ تجھے قبل رہائی صیاد کچھ مرے بازوؤں میں طاقتِ پرواز بھی ہے

اے مغنیٔ سرِ بزم مجھے پھونک دیا تیری آواز میں تو سوز بھی ہے ساز بھی ہے

خاک سے دل کی ہوا پھر نیا اک دل پیدا جو ہے انجامِ محبت وہی آغاز بھی ہے

چاک دامن نظر آتی ہیں بہاریں مجھ کو پردۂ گل میں نہاں کوئی جنوں ساز بھی ہے

کیا اڑوں شاخِ نشیمن ہی پہ میں بیٹھا ہوں اس چمن میں کہیں گنجائشِ پرواز بھی ہے

رفعتِ منزلِ غم تک مجھے لے جائے گی ہر تڑپ دل کی مرے گرمیٔ پرواز بھی ہے

ہمت افزائے سرِ راہِ جنوں میں بھی ہوں پردۂ بانگِ جرس میں مری آواز بھی ہے

دیکھ اے مرغِ سحر صحنِ چمن میں ہر گل ہے تو خاموش مگر گوش بر آواز بھی ہے

معتبر باغِ جہاں میں نہیں کوئی کہ یہاں راز دانندۂ گل جو ہے وہ غماز بھی ہے

چارہ سازوں کو خبر ہی نہیں اس کی اب تک زخمِ دل زخم بھی ہے اور یک راز بھی ہے

ہر رگ دل میں کھٹکتے ہیں آلم دو پیکاں

درد کے ساتھ نگاہِ غلط انداز بھی ہے

تبصرے

درس الاسلام پہلا حصہ از جناب مولوی حفیظ الرحمن صاحب واصف۔ تقطیع متوسط۔ ضخامت ۳۲ صفحات طباعت کتابت بہتر۔ قیمت ۴۰ نئے پیسے پتہ: کتب خانہ رحیمیہ دوبازار جامع مسجد دہلی ۶۔

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی نے تعلیم الاسلام کے نام سے دینی رسالوں کا جو ایک سلسلہ شائع کیا تھا وہ ایک زمانہ میں اتنا مقبول ہوا تھا کہ برصغیر ہندو پاک کے علاوہ برما میں بھی مسلمانوں کے گھر گھر پڑھایا جاتا تھا۔ اور اب بھی سیکڑوں مکاتب اسلامیہ میں داخل نصاب ہے اس سلسلہ کو منظوم کرنے کا عزم مولانا مرحوم کے فرزند ارجمند جناب واصف نے کیا ہے چنانچہ زیر تبصرہ رسالہ تعلیم الاسلام کے پہلے نمبر کا منظوم ترجمہ ہے ترجمہ نہایت کامیاب ہے موصوف نے تعلیم الاسلام ہی کے الفاظ میں معمولی سی تقدیم وتاخیر کر کے اس کو شعر کا جامہ پہنا دیا ہے۔

اس بنا پر اب بچوں اور بچیوں کے لئے اس کا زبانی یاد کر لینا بھی آسان ہوگیا۔ آخر میں مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ ہے جس سے رسالہ کی افادیت دوچند ہوگئی ہے امید ہے کہ یہ منظوم تعلیم الاسلام مدارس اسلامیہ میں زیادہ سے زیادہ مقبول ہوگا اور مسلمان بچوں اور بچیوں کو اس سے مزید فائدہ پہنچے گا۔

تذکرہ حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادیؒ از مولانا ابوالحسن علی ندوی تقطیع کلاں ضخامت ۱۵۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے پتہ: مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ بادشاہ باغ لکھنؤ۔

حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ چودھویں صدی ہجری کی ابتداء کے مشہور صاحب معرفت وطریقت بزرگ تھے جو اپنے عہد میں تصوف اور طریقت کے ایک اہم مرکز تھے اور جن سے ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں نے بھی روحانی استفادہ کیا ہے۔

یہ کتاب حضرت مرحوم کے ہی حالات پر ہے مولانا ابوالحسن علی ندوی کا نام اس کتاب کے استناد کا ضامن ہے عام طور پر صوفیاء اسلام کے تذکروں میں جن خارق العادات واقعات کا ذکر ہوتا ہے اس کتاب میں ان سے بہت کم اعتنار کیا گیا ہے اور مولانا کے علم وعمل سے متعلق جو اصل واقعات ہیں اُنھیں پر اکتفا کیا گیا ہے اس حیثیت سے یہ تذکرہ جہاں ارباب معرفت کے دلوں میں نور پیدا کرنے کا باعث ہوگا تاریخی اعتبار سے بھی علماء اور طلباء کے لئے بڑی قابلِ قدر چیز ہے، اس کتاب کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوگا۔

برگِ گل تقطیع متوسط۔ ضخامت ۳۰۹ صفحات۔ طباعت وکتابت دیدہ زیب (ٹائپ) قیمت ندارد۔ پتہ: اُردو کالج کراچی (پاکستان)

اُردو کالج کراچی کا مجلہ بابت ۵۶-۱۹۵۵ء برگِ گل کے نام سے ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ یہ مجلہ اسم بامسمیٰ اور ہر لحاظ سے مجلس ادارت کے حسنِ ذوق کا آئینہ دار نیز کالج کے اساتذہ طلبہ وطالبات کی علمی وادبی دلچسپیوں کا خوشنما مرقع ہے۔ سبد گل، زرگل، برگ سبز، آتش گل، رنگ بوستاں یہ عنوانات ہیں مجلہ کے مختلف حصّوں کے جن میں بلند پایہ علمی وادبی مقالات، غزلیات، منظومات اور افسانے الگ الگ ترتیب دیے گئے ہیں۔ "رنگ بوستاں" کالج کی مختلف انجمنوں کی روئدادوں پر مشتمل ہے اور اخیر میں "طائرانِ چمن" کی تصویریں ان کی علمی وعملی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو ظاہر کر رہی ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ مجلہ بڑا ہی وقیع ہے اور ارکینِ ادارہ لائقِ مبارک باد ہیں کہ نہ صرف معنوی بلکہ ظاہری خوبیوں کے لحاظ سے بھی انھوں نے مجلہ کو باغ وبہار بنا کر پیش کیا ہے۔

بُرہان

جلد ۴۱ شمارہ ۶

دسمبر ۱۹۵۸ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۷۸ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

ایک معمولی بات بھی خواہ کتنی ہی بدیہی ہو جب موضوع فکر و نظر بنتی ہے تو نظری بن جاتی ہے یہی حال آج کل لفظِ قومیت کا ہے۔ بعض اسلامی حلقوں میں اس لفظ کی تشریح و توضیح اور اس کی تعریف و تفصیل میں ابھی پچھلے دنوں اس درجہ اقدام کیا گیا ہے کہ ایک سادہ حقیقت بھی عقدۂ لاینحل نظر آنے لگی ہے ہندوستان کے پانچ مختلف المذہب لوگوں کو اگر ایک جگہ جمع کر کے پوچھا جائے کہ یہ کون ہیں؟ تو چونکہ پوچھنے والے کو یہ پہلے سے معلوم ہے کہ ان پانچوں میں سے ہر ایک کا مذہب الگ الگ ہے اس بنا پر اس کے سوال کا مطلب لازمی طور پر یہ ہوگا کہ جواب میں کوئی ایسی چیز کہی جائے جو اُن پانچوں میں مشترک ہو۔ اس صورت میں مذکورہ بالا سوال کا صحیح جواب ہوگا "ہندوستانی" اس جواب کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ پانچوں آدمی اختلافِ مذہب کے باوجود ایک ہی ملک کے باشندے اور ایک ہی حکومت میں آباد ہیں۔ اب ایک شخص کہتا ہے کہ وطن اور حکومت کا یہ اشتراک ہی قومیت ہے۔ جس کو انگریزی میں نیشنلٹی کہتے ہیں اور ان سب لوگوں کو نیشن اور قوم کہتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ کیونکر ہوا کہ لفظ نیشن یا قوم کا اطلاق جن لوگوں پر ہوتا ہے وہ تہذیب۔ کلچر۔ مذہب اور زبان ان سب وجوہ سے بھی ایک ہی ہوتے ہیں۔ دنیا میں کسی مقام پر دو آدمی بھی ایسے نہیں ہیں جو ہر حیثیت سے ایک دوسرے کے شریک اور اسی جیسے ہوں۔ لامحالہ ان میں کچھ باتیں مابہ الاشتراک ہوں گی اور کچھ باتیں مابہ الاختلاف۔ ہر دو انسانوں کی طرح دنیا کے سب انسانوں کو بھی ایسا ہی سمجھنا چاہیے۔ مابہ الاشتراک اور مابہ الاختلاف دونوں اپنی اپنی جگہ مستقل حقیقتیں ہیں ایک کے اثبات سے دوسرے کی نفی ہرگز لازم نہیں آتی۔ البتہ ہاں منطق کے مسلمہ اصول لا مشاحۃ فی الاصطلاح کے مطابق عنوان اور نام میں فرق ہو سکتا ہے۔

جہاں تک لفظِ قوم کے اطلاق کا تعلق ہے تو قرآن و حدیث سے اور تاریخ و ادب کی کتابوں میں عام استعمالات سے یہ بات ثابت ہے کہ اس لفظ کے معنی و مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ اس کا اطلاق کبھی

ایک ہی مذہب کے لوگوں پر ہوتا ہے اور کبھی ایک ہی ملک یا ایک ہی نسل یا ایک ہی زبان کے مختلف المذہب لوگوں پر ہوتا ہے۔ منطق کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ لفظ کبھی بہ طور جنس بولا جاتا ہے اور کبھی بہ طور فصل اور کبھی بہ طور نوع۔ لیکن بہر حال یہ یقینی ہے کہ جو لوگ ہندوستان کے مسلمانوں اور غیر مسلموں ان سب کو ایک قوم کہتے ہیں ان کی مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان میں باہم مذہب۔ زبان۔ اور کلچر کا کوئی فرق نہیں ہے۔ مسلم اور غیر مسلم تو الگ رہے خود مسلمان مسلمان اور غیر مسلم غیر مسلم تک میں باہم زبان اور کلچر کا فرق ہے۔ پنجاب کے ایک ہندو کو جنوبی ہند کے ایک ہندو کے ساتھ کھڑا کرکے دیکھیے۔ دونوں میں کتنا فرق نظر آئے گا۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ چونکہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہب اور اس کے عوامل و مقتضیات کا فرق ہے اس لیے وہ ایک قوم نہیں بن سکتے سرتاسر غلط اور ایک فریبِ محض ہے۔ اس کو آج کی دنیا کا نہ کوئی نظام تسلیم کرسکتا ہے اور نہ کوئی دستور۔ اور خود ہمارے ملک کے دستور کا باشندگانِ ملک کی مذہبی اور تہذیبی آزادی کو تسلیم کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ قومیت کے معنی اتحادِ کلچر اور اتحادِ تہذیب و تمدن کے ہرگز نہیں ہیں اور دستور ملکی خود تہذیب و تمدن اور کلچر کے اختلاف کو تسلیم کرتا ہے۔

اصل معاملہ کو اس حیثیت سے دیکھیے تو صاف نظر آئے گا کہ متحدہ قومیت کو جو لوگ تسلیم کرتے ہیں اور جو اس کے منکر ہیں ان میں کوئی حقیقی نزاع نہیں ہے۔ کیونکہ اول گروہ جس ما بہ الاشتراک کا قائل ہے یعنی وطنیت اور اس کے حقوق و واجبات۔ دوسرا گروہ اُس کا منکر نہیں اسی طرح دوسرا گروہ جس چیز کا منکر ہے یعنی اتحاد کلچر۔ اتحاد تہذیب و ثقافت تو پہلا گروہ اس کا قائل نہیں اب نزاع جو کچھ بھی ہے وہ صرف اس بات میں ہے کہ مشترکہ وطنیت کو قومیت کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ تو ظاہر ہے تنقیحِ مذکور کی روشنی میں یہ نزاع محض لفظی ہوگا نہ کہ حقیقی۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے بعض دوستوں کی سمجھ میں اتنی ذرا سی بات بھی نہیں آتی۔ چنانچہ معزز معاصر زندگی کے لائق مدیر لکھتے ہیں "یہ بات صحیح نہیں کہ چند چیزوں میں اشتراک قومیت کے لئے کافی ہے۔ اصل چیز اشتراک نہیں داخلی وحدت ہے۔ جب تک یہ موجود نہ ہو قومیت موجود نہیں ہوسکتی" سوال یہ ہے کہ یہ "داخلی وحدت" ہے کہاں؟ جماعت اسلامی کے ارکان اور علمائے دیوبند و بریلی میں ہے؟ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور شہید سہروردی صاحب میں ہے؟ اگر نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو قومیت کا وجود صرف

ذہنی ہوا نہ کہ خارجی اس میں شک نہیں کہ مذہب کا رشتہ وطن کے رشتہ سے قوی تر ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ داخلی اور خارجی کی تفریق سے قطع نظر وطن بھی مذہب کی طرح ایک مستقل وحدت ہے۔ اور اس لئے جس طرح وطن مذہب کے مقابلہ میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مذہب کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ وطن کی انفرادیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ مثلاً یوں سمجھیئے کہ بہن بھائی کا رشتہ۔ میاں بیوی کے رشتہ سے قوی تر ہے لیکن دونوں رشتوں کی اپنی اپنی جگہ مستقل حیثیت ہے اور اس بنا پر ایک کو دوسرے کے معاملات میں مداخلت بیجا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ چنانچہ اگر کسی ملک کے مسلمان ہندوستان پر حملہ آور ہوں تو از روئے قرآن و فقہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہو گا کہ وہ ہم وطنوں کے ساتھ مل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ حکم اُسی وقت ہے جبکہ ملک کی اکثریت کا معاملہ مسلمانوں کے ساتھ روادارانہ اور منصفانہ ہو جس کی وجہ سے مسلمان وطن کو سچ مچ اپنا وطن سمجھیں اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو اور مسلمانوں کا مذہب اور ان کی عزت محفوظ نہ ہو تو اب اس صورت میں مسلمانوں کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اسی ملک کو وطن ماننے اور اس کے حقوق شہریت کے قبول کرنے سے انکار کر دیں اس کے بعد وہ آزاد ہیں جو چاہیں کریں۔ لیکن جب تک وہ حقوق شہریت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اس وقت تک وطن کی حفاظت اُن کا فرض ہے۔ اس بنا پر صرف یہ کہہ دینا کہ ،، ہاں وطن اور اہل وطن کے بھی حقوق ہیں ،، کافی نہیں ہے۔ اسلام میں حقوق تو دشمنوں اور جانوروں کے بھی ہیں۔ وطن ایک مستقل وحدت ہے۔ حقوق کا نام لے کر اس کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ فاضل مدیر زندگی نے صفحہ گیارہ کے حاشیہ میں بزعم خود متحدہ قومیت کے مظاہر کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اُس کا جواب یہ ہے کہ ان چیزوں کا قومیت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس قسم کی باتیں اکثریت کا ذاتی فعل ہے جس سے مسلمانوں کو صاف لفظوں میں برارت ظاہر کرنی چاہیئے مزید براں گذارش یہ ہے کہ ہندوستان ہی کا کیا ذکر؟ رقص و سرود۔ اور مغربی تہذیب و تمدن کے معاملہ میں پاکستان۔ مصر۔ اور ایران کا کیا حال ہے؟ اور کس طرح ان ملکوں کی حکومتیں ان اسلام کش اعمال و افعال کی سرپرستی کرتی ہیں؟ تو کیا ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ان ملکوں کے مسلمان متحدہ قومیت سے محروم ہو جائیں؟

علیؓ

صرف تاریخ کی روشنی میں

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے قلم سے

مترجم
(مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی)

(۲)

پھر لوگوں نے دیکھا کہ طلحہؓ اور زبیرؓ نے رضا اور رغبت کے ساتھ بیعت نہیں کی ہے، ان تمام باتوں کو دیکھ کر اور جان کر اور ان کا اندازہ لگا کر کیوں نہ لوگ سراسیمہ اور خوف زدہ ہوں؟

تاہم نئے خلیفہ ایسی قابلیت کے مالک تھے کہ لوگوں کا دل اطمینان اور امیدوں سے بھر دیں وہ نبی کے چچازاد بھائی تھے، خدیجہؓ کے بعد سب سے پہلے اسلام لانے والے، مردوں میں سب سے پہلے رسول اللہؐ کے ساتھ نماز پڑھنے والے، اسلام کی دعوت اور اعلان کے پہلے نبیؐ کی تربیت میں رہنے والے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے احساس فرمایا کہ ابو طالب، زندگی کے دن تنگی میں گذار رہے ہیں آپ نے کوشش کی کہ بیٹوں کا بوجھ اٹھانے میں دوسرے چچا ابو طالب کی امداد کریں چنانچہ صرف عقیل ابو طالب کے پاس رہ گئے اور وہ یہ چاہتے بھی تھے، باقی دوسرے لڑکے اور بھائیوں کی پرورش میں چلے گئے، آں حضرتؐ نے علیؓ کو اپنی کفالت میں لے لیا اور اُن کی تربیت اور پرداخت فرمانے لگے، جب اللہ نے آپ کو نبوت کے لئے پسند فرمایا تو علیؓ آپ کی تربیت میں تھے اور ابھی دس سال سے کچھ ہی بڑے تھے پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علیؓ اسلام کے ساتھ ساتھ پلے اور بڑے ہوئے، نبیؐ کو آپ سے بے حد محبت تھی وہ آپ کو غیر معمولی درجے میں مقدم رکھتے تھے، ہجرت کے موقع پر

آپ کو لوگوں کی امانتیں سپرد کیں اور آپ نے ان کے مالکوں تک پہنچا دیا، پھر قریش نے جس رات اللہ کے رسول کو قتل کر دینے کی سازش کی تھی آپ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا اور آپ سوئے، اس کے بعد آپ نے ہجرت کی اور مدینہ میں نبی سے جا ملے اس کے بعد مواخات کی تقریب میں رسول خدا نے اپنے ساتھ حضرت علیؓ کا بھائی چارہ قائم کیا، پھر اپنی لڑکی فاطمہؓ سے بیاہ دیا، بعد میں تمام غزوات میں علیؓ نبی کے ساتھ رہے سخت معرکوں میں علم آپ ہی کے ہاتھوں میں رہا خیبر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کل میں جھنڈا ایسے شخص کے ہاتھ میں دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ محبت رکھتا ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کو بھی اس سے محبت ہے دوسرے دن جب صبح ہوئی تو جھنڈا حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دیا، مدینہ پر اپنا جانشین بنا کر جب آنحضرت غزوۂ تبوک جانے لگے تو فرمایا تم میرے لئے موسیٰ کے ہارون ہو لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، حجۃ الوداع جاتے ہوئے مسلمانوں کو خطاب کر کے آپ نے فرمایا۔ جس کا میں سردار ہوں علیؓ بھی اس کے سردار ہیں، اے خدا جو علیؓ کو دوست رکھے اس کو تو بھی دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی کرے تو بھی اس سے دشمنی کر۔

حضرت عمرؓ حضرت علیؓ کے علم و تفقہ سے خوب واقف تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ہم میں سب سے زیادہ فیصلہ کرنے کی طاقت علیؓ میں ہے حضرت عمرؓ کو جب کسی معاملے کے فیصلے میں پیچیدگی کا سامنا ہوتا تو وہ اس کو حضرت علیؓ کے سامنے پیش کرتے۔ حضرت عمرؓ نے جب شوریٰ کی ہدایت کی تھی اس وقت یہ بھی فرمایا تھا کہ اس چٹیل سر والے کو مسلمان اگر اپنا والی بنا لیں تو وہ ان کو بے راہ نہیں ہونے دے گا، حضرت علیؓ کے محامد اور محاسن بہت زیادہ ہیں نبی کے صحابہ اپنے اختلاف کے باوجود ان محاسن کا اعتراف کرتے ہیں تابعی بزرگ ان اوصاف کے قائل ہیں اہل سنت کا ان فضائل پر یقین ہے جس طرح شیعوں کا یقین ہے۔

آگے چل کر جب ہم حضرت علیؓ کی سیرت اور مشکلات اور مصائب میں ان کے طرز عمل کی تفصیل پیش کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ حضرت علیؓ مذکورہ بالا فضائل و محاسن بلکہ اس سے

بھی زیادہ کے اہل تھے اور بلاشبہ آپ میں سب سے زیادہ یہ صلاحیت تھی کہ مسلمانوں میں فاروقِ اعظمؓ جیسی روش اختیار کریں اور ان کو اسی راہ پر لے جائیں اور اگر حالات سازگار ہوتے تو حضرت علیؓ مسلمانوں کو بھلائی، کامیابی اور سعادت کی اس منزل پر پہنچا دیتے جہاں ان کو حضرت عمرؓ پہنچا چکے تھے۔

حضرت عمرؓ خدا کی ان پر رحمت ہو بڑی سچی فراست کے مالک تھے انھوں نے بالکل ٹھیک اندازہ کیا تھا جس میں کوئی غلطی نہ تھی کہ اگر علیؓ کو خلافت دے دی جاتی تو وہ لوگوں کو سیدھی راہ سے بھٹکنے نہ دیتے، حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ علیؓ ان سے بہت زیادہ مشابہ ہیں وہ بھی حق کے بارے میں سختی سے پیش آتے ہیں، حق کے سامنے گردن جھکا دیتے ہیں، حق کا انکار کرنے والوں یا حق کے معاملے میں تنگی برتنے والوں کے لئے بڑے سخت ہیں لیکن قوم نے ابن خطاب کی وفات کے بعد جب دنیا قدموں پر گر رہی تھی، جب سرگرمیوں میں قوت تھی، جب اقدام نتیجہ خیز تھا، جب معقولیت اور ذہانت کارفرما تھی اور معاملات مسلمانوں کی منشاء کے مطابق چل رہے تھے، حضرت علیؓ کو خلیفہ نہیں بنایا، اور بنایا تو حضرت عثمانؓ کو بنایا، پھر نتیجہ دونوں کے حق میں جو کچھ ہونا تھا ہوا اس کے بعد جب دنیا بگڑ گئی، معاملات میں انتشار ہو گیا اور اقتدار کی رسی ڈھیلی ہو گئی، بعضوں نے بعض کے ساتھ بدگمانی کی حد کر دی، کچھ لوگوں نے کچھ لوگوں کے خلاف کارروائیوں کی انتہا کر دی تب جا کر کہیں ایک اچھی خاصی تعداد نے حضرت علیؓ سے التجا کی اور آپ کی بیعت کی کچھ لوگ ضرور آپ سے دور رہے لیکن ان کا مقصد آپ کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا نہ تھا ہاں ایک جماعت نے آپ کی بیعت سے انکار کیا وہ نہ آپ کو پسند کرتی تھی اور نہ اسے آپ کی اطاعت منظور تھی، اب نئے خلیفہ اور اس کے ساتھیوں نے جو نظر اٹھائی تو انھیں معلوم ہوا کہ وہ غیر معمولی حالات اور معاملات سے دوچار ہیں وہ ایک ایسے مشتبہ فتنے کے گھیرے میں ہیں جس کی تاریکی بینائی کا خاتمہ کر چکی ہے آدمی اس میں اپنا ہاتھ نکالے تو اس کو اپنا ہاتھ نظر نہ آئے۔

بڑی بڑی مشکلات کے ان پہاڑوں اور فتنہ و فساد کی ان بے رحم تاریکیوں کے درمیان بھی ایک بالکل مطمئن آدمی کی طرح، حضرت علیؓ اپنے دل میں ایمان کی صداقت، دین کی سچی محبت، حق کی بقاء کا جذبہ اور سیدھی راہ پر ثابت قدمی کی تڑپ، بتمام و کمال پاتے تھے، اسلام کے معاملے میں انھوں نے نہ سرِ مو انحراف کیا اور نہ ذرا بھی رو رعایت کی، جدھر حق دیکھا اُدھر چل پڑے پھر کسی طرف نہیں جھکے نہ کسی کا انتظار کیا انجام کی بھی پروا نہ کی، اس کو اہمیت نہ دی کہ کامیاب ہوں گے یا ناکام، زندگی ملے گی یا موت، ہاں اہمیت تھی تو اس کی کہ راستے بھر اللہ راضی رہے اور دل مطمئن۔

خلافت اور بنی ہاشم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علیؓ اور ان کے چچا عباسؓ دونوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ منصبِ خلافت صرف بنی ہاشم کا حق ہے یہ نہ کسی اور خاندان میں منتقل ہونا چاہیئے اور نہ کسی غیر ہاشمی کو خلیفہ بنانا چاہیئے اور اگر عباسؓ اسلام لانے میں پیچھے نہ رہ گئے ہوتے تو بھتیجے کی جانشینی کے لئے یقیناً خود اپنی ذات کو پیش کر دیتے اور مسلمانوں پر حکومت کی وراثت حاصل کر لیتے لیکن انھوں نے معاملے پر غور کیا اور سمجھا کہ علیؓ اس اقتدار کے وارث بننے کے ان سے زیادہ حق دار ہیں، اس لئے کہ اسلام لانے میں انھوں نے پہل کی ہے وہ آں حضرتؐ کے پرورش کردہ ہیں، غزوات کی مصیبتوں میں پوری طرح ثابت قدم رہے اور اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بھائی کہا کرتے تھے جس پر ایک دن اُمِّ ایمن نے آں حضرتؐ سے مذاق کرتے ہوئے کہا تھا — "بھائی بھی کہتے ہیں اور انھیں سے اپنی لڑکی بھی بیاہ دی ہے" مزید برآں آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کے لئے فرمایا ہے کہ وہ میرے لئے موسیٰ کے ہارون ہیں اور یہ کہ جس کا میں سردار ہوں علیؓ بھی اس کے سردار ہیں۔

انھیں تمام باتوں کے پیشِ نظر عباسؓ وفاتِ نبوی کے بعد حضرت علیؓ کے پاس آئے

اور کہنے لگے ہاتھ بڑھائیے میں آپ کی بیعت کروں گا، لیکن حضرت علیؓ نے فتنے کا خطرہ محسوس کرکے اس سے انکار کر دیا، اس واقعے کا تذکرہ بہت دنوں بعد عباسؓ نے حضرت علیؓ سے کیا۔
قریش کے ایک اور آدمی نے چاہا تھا کہ حضرت علیؓ کی بیعت کرلے۔ اس کی یہ خواہش اس لئے نہیں تھی کہ اس کو حضرت علیؓ سے محبت تھی، اور وہ آپ سے خوش تھا یا وہ نبیؐ سے آپ کے خاص تعلق کا اعتراف کرنا چاہتا تھا بلکہ اس کا یہ ارادہ عبد مناف کی خاندانی عصبیت کی بنیاد پر تھا، یہ آدمی ابوسفیان ہے اسلام سے مقابلے اور نبیؐ سے جنگ کے دوران میں یہی آدمی قریش کا سردار تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کا لشکر مکہ پر چھا گیا ہے تو مجبوراً اسلام قبول کرلیا، عباسؓ اس کو نبیؐ کی خدمت میں لائے جہاں لا الٰہ الا اللہ کہہ دینے میں اس کو کچھ تردد نہیں ہوا اس لئے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہ ہونے کا اعتراف کر لینے میں اس کے نزدیک کوئی مضائقے کی بات نہ تھی لیکن جب اس سے یہ شہادت طلب کی گئی کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں تو اس نے کہا اس کے بارے میں میرا دل صاف نہیں ہے اور اگر عباسؓ اس کو آمادہ نہ کرتے اور قتل کی دھمکی نہ دیتے تو وہ ہرگز رسالت کا اقرار نہ کرتا۔ بہرحال وہ مسلمان ہوا اور نبیؐ نے قریش میں اس کی پوزیشن کی رعایت رکھ کر، جب اسلامی فوج مکہ میں فاتحانہ داخل ہو رہی تھی، اس کے گھر کو بھی امن کی جگہ قرار دی، پس ابوسفیانؓ ان امان یافتہ لوگوں میں سے ایک ہیں جس کو اللہ کے رسول نے مکہ کے فاتحانہ داخلے کے موقع پر معاف کر دیا تھا۔ ان واقعات کے پیش نظر اس کو اپنے خلیفۃ المسلمین ہونے کا تو خیال بھی نہیں آسکتا تھا البتہ اس نے دیکھا کہ نبیؐ اس کے باپ عبد مناف کی اولاد میں سے ہیں اور یہ کہ علیؓ اس اقتدار کی وراثت کے سب سے زیادہ حق دار ہیں لیکن خلافت قبیلہ تیم کے ایک آدمی ابوبکرؓ کو دی جا رہی ہے اور اندازہ ہے کہ اس کے بعد یہ منصب قبیلہ عدی کے ایک شخص عمرؓ تک پہنچے گا، تو اس نے باپ کی قریبی اولاد کو بیگانوں کے بیٹوں پر ترجیح دی اور حضرت علیؓ سے کہا ــــ ہاتھ بڑھائیے میں آپ کی بیعت کروں گا۔
لیکن حضرت علیؓ نے اپنے چچا عباسؓ کی طرح اس کی بات ماننے سے بھی انکار کر دیا، اگر آپ

ان دونوں بوڑھوں کی بات مان لیتے تو مسلمانوں میں خواہ مخواہ کا فتنہ پیدا کر دیتے، پھر اس فتنے کا مقابلہ کرنے اور اس پر غلبہ پانے کی بات تو درکنار اس کی برداشت ہی بس سے باہر ہوتی

اس لئے کہ آپ جانتے ہیں کہ نبیؐ کی وفات کے بعد بیعت کے معاملے میں انصار میں اختلاف تھا اب اگر قریش میں بھی پھوٹ پڑ جاتی تو انجام کیا ہوتا اسی طرح آپ جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں کچھ عرب دین سے پھرنے لگے تھے اب اگر قریش اور انصار ایک دوسرے کے مقابل ہو جاتے تو صورتِ حال کا نقشہ کیا ہوتا؟

پس حضرت علیؓ، عباسؓ اور ابوسفیان سے اپنی بیعت کا انکار کرنے میں بالکل حق بجانب تھے، ان کا طرزِ عمل سراپا خیر تھا وہ اللہ اور اسلام کے پوری طرح مخلص تھے، اپنی ذات کو خلافت کے لئے پیش نہیں کیا اور نہ اس سلسلے میں ابوبکرؓ سے جھگڑا کیا بلکہ لوگوں کی طرح ان کی بیعت کر لی طبیعت کو تقاضے کے خلاف دبایا اور مسلمانوں کی خاطر اپنی طبیعت کو اس بات پر راضی کر لیا کہ اپنے حق سے چشم پوشی کر لیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کا اندازہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد خلافت انھیں کو ملے گی، اور مسلمان اس بوڑھے کو خلیفہ بنا دینے میں معذور تھے جس کو اپنی بیماری کے دنوں میں آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ وہ نماز میں لوگوں کی امامت کرے تاہم حضرت علیؓ نے بیعت کرنے میں تیزی نہیں دکھائی بلکہ کچھ دیر لگائی شاید وہ حضرت ابوبکرؓ سے خفا تھے جس طرح فاطمہؓ خدا کی ان پر رحمت ہو حضرت ابوبکرؓ سے خفا تھیں اس لئے کہ جب انھوں نے اپنے باپ کی میراث کو اُن سے مانگا تو ابوبکرؓ نے انکار کرتے ہوئے حضرتؐ کی حدیث سنائی ــــ "ہم انبیاء کسی کو وارث نہیں بناتے ہمارا ترکہ سب کا سب صدقہ ہے"۔ لیکن بہرحال حضرت علیؓ آئے اور بیعت کرتے ہوئے اپنی تاخیر کا یہ عذر پیش کیا کہ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ قرآن جمع کر لینے کے بعد ہی گھر سے نکلوں گا، حضرت ابوبکرؓ نے آپ کا یہ عذر قبول کر لیا۔

حضرت ابوبکرؓ بوڑھے ہو چکے تھے ان کی عمر ساٹھ سے اوپر ہو چکی تھی اور حضرت علیؓ

ابھی جوان تھے تیس سال سے کچھ زیادہ کی عمر تھی، سوچتے تھے کہ اُن کے اور مسلمانوں کے سامنے مستقبل کا میدان بہت وسیع ہے، بہت جلد اُن کو اُن کا حق مل جائے گا جب اللہ اس بوڑھے کو اپنے جوارِ رحمت میں بلائے گا جس کو نبیؐ نے دین کے ایک کام کے لئے آگے کیا تھا پھر مسلمانوں نے دنیا کے کاموں کے لئے بھی اُسی کو آگے کر دیا۔

لیکن صدیق اکبرؓ نے خلافت کے لئے حضرت عمرؓ کو نامزد کیا اور مسلمانوں نے بالاتفاق اس نامزدگی کو منظور کیا، ایک نے بھی مخالفت نہیں کی یہ دیکھ کر حضرت علیؓ نے محسوس کر لیا کہ ان کے اور قریشی مہاجرین کے درمیان ایک کھلا ہوا اختلاف ہے، وہ خلافت کو اپنا حق خیال کرتے ہیں اور مہاجر اس کے لئے ان کا حق تسلیم نہیں کرتے، مہاجر ان کو اپنے ہی جیسا ایک آدمی خیال کرتے ہیں جو پابندی اوروں کے لئے ضروری ہے وہ ان کے لئے بھی ہے اب رہے انصار تو اُنہوں نے خلافت سے مایوس ہو کر اپنے آپ کو قریشی مہاجروں کے لئے رضامند بنا لیا تھا ان میں سے جس کو پیش کیا جاتا اس کی بیعت کر لیتے، حضرت علیؓ نے فتنے کو بُرا سمجھا، امن و عافیت کو مقدم جانا اور مسلمانوں کی خیر خواہی کی کہ حضرت ابوبکرؓ کی طرح حضرت عمرؓ کی بھی بیعت کر لی، اور جس بات کو اپنا حق خیال کرتے تھے اس کا اظہار تک نہیں کیا اور صبر سے کام لیتے رہے آپ نے خلیفۂ اول کی طرح حضرت عمرؓ کی بھی خیر خواہی کی پھر جب فاروق اعظمؓ کو خنجر مار دیا گیا اور خلافت کا منصب چھ ارکان کی مجلسِ شوریٰ کے حوالے کیا گیا، حضرت علیؓ کو یقین تھا کہ قریش ان کی ہم نوائی نہیں کریں گے اور نہ ان کا حق تسلیم کریں گے تو نہ اپنے لئے تحریک کی نہ لوگوں پر ان کی مرضی کے خلاف جبر کرنا چاہا اور اگر کرنا بھی چاہتے تو اس کی کوئی صورت نہ تھی اس لئے کہ آپ کی حمایت میں کوئی جماعت نہ تھی، اور نہ آپ کسی زبردست پناہ میں جا سکتے تھے، ہاں کچھ تھوڑے سے اچھے مسلمان آپ کے ہم خیال تھے جو دبی زبان سے آپ کے لئے تحریک کرتے تھے لیکن وہ کمزور تھے ان کے پاس جو کچھ قوت تھی وہ اسلام کی تھی، نہ وہ کوئی مادی طاقت رکھتے تھے اور نہ خاندانی عصبیت کا زور، جیسے عمار بن یاسر اور مقداد بن اسود وغیرہ، شیخینؓ کی طرح حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ

کی بھی بیعت کرلی جانتے تھے کہ آپ کو دبایا جارہا ہے لیکن پھر بھی آپ نے بیعت میں پس و پیش نہیں کیا اور نہ پہلے دونوں خلفاء کی طرح حضرت عثمانؓ کے ساتھ خیر خواہی میں کوئی کوتاہی کی، تاآنکہ مصائب کا دور آگیا جس کی تصویر ہم نے اس کتاب کے پہلے حصے عثمانؓ میں کھینچی ہے۔

یہ فطری بات تھی کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد حضرت علیؓ اپنے متعلق غور فرماتے اور جو زیادتی آپ کے ساتھ کی گئی ہے اس پر کچھ سوچتے لیکن پھر بھی آپ نے خلافت کی طلب نہیں کی اور جب تک آپ کو مجبور نہیں کر دیا گیا آپ نے بیعت کے لئے اپنے کو پیش نہیں کیا، حضرت عثمانؓ کے بعض باغیوں نے تو یہ دھمکی دی کہ اگر آپ آمادہ نہ ہوں گے تو آپ کو بھی انھیں کی جگہ پہنچا دیا جائے گا، علاوہ ازیں مدینہ کے مہاجر اور انصار آپ کی خدمت میں آئے اور آپ سے درخواست کی کہ مسلمانوں کے والی بن کر ان کو اس فتنے کی تاریکی سے نکالیں، پھر جب آپ نے ان کی درخواست منظور کرلی تو کسی صحابی کو مجبور نہیں کیا جس نے چاہا اس کی بیعت لی اور جس نے انکار کیا اسے چھوڑ دیا، سعد بن ابی وقاصؓ، عبداللہ بن عمرؓ، اسامہ ابن زیدؓ کو اور انصار کی ایک جماعت کو جس کے سردار محمد ابن مسلمہ تھے چھوڑ دیا، بقول اکثر مورخین کے حضرت علیؓ نے طلحہؓ اور زبیرؓ کو نہیں چھوڑا اس لئے باغیوں سے ان کے تعلق کی بنا پر فتنے کا خطرہ تھا لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ان دونوں کو بھی بیعت پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ یہ اپنی خوشی سے حضرت علیؓ کے پاس آئے اور بیعت کی بعد میں جب انھوں نے خلیفہ کا سلوک اپنی توقع کے خلاف دیکھا تو اپنا نقطۂ نظر بدل دیا غالباً یہ دونوں سمجھے ہوئے تھے کہ حضرت علیؓ کو ان کی سخت ضرورت ہے ان میں سے ایک کوفہ میں اور دوسرا بصرہ میں غیر معمولی اثر رکھتا ہے اور انھیں دونوں شہروں نے بغاوت میں غیر معمولی مشترک طور پر حصہ لیا تھا اور لوگوں کا خیال تھا کہ کوفہ اور بصرہ کے لوگوں نے طلحہؓ اور زبیر کے اشتعال دلانے سے یا کم از کم ان کی مرضی سے بغاوت میں سرگرمی دکھائی تھی۔

پس یہ دونوں اس توقع میں تھے کہ حضرت علیؓ بہت جلد محسوس کرلیں گے کہ کوفہ اور بصرہ میں ان کو اپنی اپنی جماعتوں میں غیر معمولی اثر و اقتدار حاصل ہے اور بلا تامل ان کو اپنی حکومت

میں شریک کریں گے اس طرح یہ خلافت ثلاثی یعنی سہ طاقتی ہوگی اور شوریٰ کے یہ تین ممبر حکومت باہم تقسیم کریں گے ، حجاز ، مصر اور شمالی افریقا کے مفتوحہ اور غیر مفتوحہ علاقے حضرت علیؓ کی حکومت میں ہوں ، بصرہ اور اس کے مضافات کا علاقہ زبیرؓ کے تابع رہے اور کوفہ اور اس کے آگے کے علاقہ پر طلحہؓ حکمراں ہوں طلحہؓ اور زبیرؓ خیال کرتے تھے کہ اگر ان کی یہ سہ طاقتی خلافت مستحکم ہوگئی تو شام کا مسئلہ نہایت آسان ہوگا ، لیکن حضرت علیؓ نے ان کو ان دونوں شہروں کی گورنری دینے سے انکار کر دیا اور چاہا کہ ان کے ساتھ حضرت عمرؓ جیسا سلوک کریں اور ان کو اپنے ساتھ مدینے میں روک رکھیں جس طرح حضرت عمرؓ نے اس سے پہلے ممتاز مہاجر صحابہ کو مدینے میں روک رکھا تھا لیکن حضرت علیؓ نے ان دونوں کے ساتھ وہ سختی نہیں برتی جو حضرت عمرؓ جہاد کی اجازت مانگنے والے صحابہ کے ساتھ کرتے تھے بلکہ ایک مہربان دوست کی طرح ان سے کہا ــــ میں چاہتا ہوں کہ آپ دونوں حضرات کو اپنے ساتھ رکھوں کہ آپ کی جدائی سے مجھے وحشت ہوگی ــــ

اب ان دونوں کو معلوم ہوا کہ ان کا خیال اور اندازہ غلط تھا اور یہ کہ حضرت علیؓ وہ دروازہ کھولنے والے ہیں جو حضرت عمرؓ پر خنجر سے وار کے بعد بند ہو چکا تھا اور ان کا انجام مدینے میں ان ممتاز مہاجر صحابہ کا انجام ہوگا جو حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے ، چنانچہ ان کو مدینہ میں قیام کرنا ہوگا ہر سال وہ اپنا مقررہ وظیفہ حاصل کر سکیں گے اور حضرت عثمانؓ کی نرمی رواداری اور چشم پوشی سے جو کچھ مل جایا کرتا تھا وہ حضرت علیؓ سے کسی صورت میں نہیں ملے گا ، پس انھوں نے نہ کوفہ مانگا نہ بصرہ بلکہ رنجیدہ ہو کر چپ چاپ بیٹھ رہے ، اور سنجیدگی اور غور کے ساتھ اپنا معاملہ ٹھیک کرنے میں مصروف ہو گئے ۔

علیؓ اور صوبوں کے گورنر

حضرت علیؓ کا نرم اور مدبرانہ جواب سُن لینے کے بعد بھی شاید طلحہؓ اور زبیرؓ کے دل

سے بصرہ اور کوفہ کا خیال نہیں نکلا، بلاذری کا بیان ہے کہ مغیرہ بن شعبہ نے حضرت علیؓ کو مشورہ دیا کہ۔ انتظامات میں مضبوطی کے پیش نظر آپ شام پر معاویہؓ کو برقرار رکھئے اور عراق کے دونوں شہروں پر طلحہؓ اور زبیرؓ کو مقرر کر دیجئے لیکن عبداللہ ابن عباسؓ نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا بصرہ اور کوفہ دولت اور خراج کے چشمے ہیں اگر ان پر ان دونوں کو حکمراں بنا دیا گیا تو یہ مدینہ میں مقیم خلیفہ کو تنگ کریں گے، اور شام پر معاویہؓ کا باقی رہنا حضرت علیؓ کے لئے مفید ہونے سے زیادہ نقصان پہنچانے والا ہوگا، حضرت علیؓ نے ابن عباسؓ کی رائے مان لی اور مغیرہ بن شعبہ کا مشورہ قبول نہیں کیا۔

دوسرے مورخوں نے اس کو ایک دوسری طرح بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہ نے حضرت علیؓ کی رائے معلوم کرنے کی غرض سے ان کو مشورہ دیا کہ ایک سال تک عثمانی گورنروں کو جن میں معاویہؓ بھی تھے ان کے عہدوں پر باقی رکھئے تاکہ لوگ آپ کے حق میں پکے ہو جائیں اور صوبوں سے وفاداری کی اطلاع بھی آپ تک آجائے، ایک سال گذرنے کے بعد جیسی تبدیلی مناسب سمجھنا کر لینا، حضرت علیؓ نے یہ مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اس لئے کہ چالبازی آپ کو طبعاً ناپسند تھی اس کے بعد مغیرہ دوسرے دن آئے اور حضرت علیؓ سے کہنے لگے میں نے اپنی پہلی رائے بدل دی اور اب مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے، مغیرہ واپس ہو رہے تھے کہ ابن عباسؓ نے ان کو دیکھ لیا اور حضرت علیؓ کے پاس آکر ان سے دریافت کیا کہ مغیرہ کیا کہہ رہے تھے، حضرت علیؓ نے ان کی دونوں باتیں بتا دیں ابن عباسؓ نے کہا کل اس نے جو کچھ کہا اس میں آپ کی خیر خواہی اور اخلاص تھا اور آج اس نے جو بات کہی وہ فریب اور دھوکا ہے اس کے بعد ابن عباسؓ نے اصرار کے ساتھ حضرت علیؓ پر زور ڈالا کہ معاویہؓ کو ان کی جگہ کم از کم ضرور برقرار رکھنا لیکن اپنے دامن پر مکر و فریب کے داغ سے ڈر کر حضرت علیؓ نے یہ منظور نہیں کیا اور شام کی حکومت ابن عباسؓ کو دینا چاہی لیکن انھوں نے قبول کرنے سے معذرت کی۔

مورخین میں چاہے جیسا اختلاف ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ کے گورنروں کو حضرت علیؓ برقرار نہیں رکھ سکتے تھے ایک تو یہ بات ان کی راستبازی کے خلاف تھی کہ انھوں نے بار بار حضرت عثمانؓ کو انھیں گورنروں کے تقرر پر ٹوکا تھا لوگوں کے ساتھ ان کے طرزِ عمل سے اپنی ناگواری کا اظہار کیا تھا، پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کل تک تو ان کے معزول کرنے کا مطالبہ کرتے رہے اور آج ان کے برقرار رکھنے پر رضامند ہو جاتے دوسرے سیاست کا تقاضا بھی اس کے خلاف تھا اس لئے کہ فتنہ کی آگ لگانے والے یہ باغی صرف خلیفہ کی تبدیلی نہیں چاہتے تھے وہ تو سیاست کا کل نقشہ بدل دینا چاہتے تھے جس میں گورنروں کا تبادلہ پہلا قدم تھا ہاں ابوموسیٰ اشعری کو یہ لوگ شاید معاف کر دیتے جن کو کوفہ والوں نے خود پسند کیا تھا اور حضرت عثمان نے بھی لوگوں کی اصلاح اور فتنے کی روک تھام کے خیال سے اس کو منظور کر لیا تھا۔

بہرحال مدینہ والوں کی بیعت سے فرصت پا کر پہلا کام جس کی طرف حضرت علی نے توجہ کی وہ صوبوں کے لئے گورنروں کا تقرر تھا چنانچہ آپ نے نہایت مناسب انتخاب کیا بصرہ کے لئے عثمان بن حنیف ایک مشہور اور ممتاز انصاری کا تقرر کیا اور شام کے لئے انھیں کے بھائی سہل ابن حنیف کو روانہ کیا اور قیس ابن سعد ابن عبادہ کو مصر کی طرف روانہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی انصار کو خوش کرنا چاہتے تھے اس لئے کہ بصرہ، کوفہ اور شام جیسے اہم مقامات کے لئے آپ نے انھیں میں سے تین افراد کو پسند کیا۔

اب رہ گیا کوفہ تو بعض مورخوں نے روایت کی ہے کہ اس کے لئے آپ نے عمارہ بن شہاب کو بھیجا تھا لیکن ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ ایک کوفی نے ان کو واپس ہو جانے کے لئے کہا اور دھمکی دی کہ اگر واپس نہ ہوں گے تو قتل کر دے گا، اس نے یہ بھی کہا کہ کوفہ کے لوگ اپنے امیر ابوموسیٰ کے سوا کسی کو پسند نہیں کریں گے چنانچہ عمارہ واپس آ گئے اور ابوموسیٰ نے اپنی اور کوفہ والوں کی بیعت حضرت علی کی خدمت میں بھیج دی۔

حضرت علیؓ نے یمن کا حاکم اپنے چچازاد بھائی عبداللہ بن عباسؓ کو مقرر کیا جب یہ یمن پہنچے تو حضرت عثمانؓ کے گورنر یعلی ابن اُمیہ مکہ روانہ ہو گئے اور اپنے ساتھ سارا مال بھی لیتے گیے۔

مکہ کی حکومت پر حضرت علیؓ نے شروع میں بنی مخزوم کے ایک آدمی خالد بن عاص ابن ہشام ابن مغیرہ کو مقرر کیا لیکن مکہ والوں نے حضرت علیؓ کے لئے اس کی بیعت سے انکار کر دیا کہا جاتا ہے کہ ایک نوجوان مکی نے حضرت علیؓ کا مکتوب چبا کر پھینک دیا جو زمزم کے حوض میں جا گرا اور مکہ سے متعلق ایک اور بات ہے جس کا ہم آگے چل کر تذکرہ کریں گے۔

حضرت علیؓ کے گورنر اپنے اپنے صوبوں کی طرف روانہ ہو گئے قیس ابن سعد تو آسانی سے مصر پہنچ گئے اور عام مصریوں سے حضرت علیؓ کے لئے بیعت لے لی، البتہ ایک جماعت مقام خربتا میں جمع ہو کر حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کرنے لگی، لیکن اس جماعت نے نہ کسی پر ہاتھ اُٹھایا، نہ کوئی حکم توڑا البتہ قصاص کا انتظار کرتی رہی۔

عثمان بن حُنیف جب بصرہ پہنچے تو لوگوں نے ان کے ساتھ کوئی بے ہودگی اور چالبازی نہیں کی حضرت عثمانؓ کے حاکم عبداللہ ابن عامر جو کچھ لے سکے سب لاد کر مکہ چلے آئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔

کوفہ میں اپنا حاکم بھیجنے کی روایت ہر چند کہ میں نے پہلے پیش کر دی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ حضرت علیؓ نے وہاں کسی کو حاکم بنا کر نہیں بھیجا بلکہ ابو موسیٰ ہی کو باقی رکھا اس لئے کہ وہ کوفہ والوں کی مرضی کے مطابق تھے۔

سہل بن حُنیف شام کی طرف روانہ ہوئے ابھی وہ شامی حدود تک پہنچے ہی تھے کہ معاویہ کے سواروں سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی سواروں کے پوچھنے پر سہل نے کہا وہ حاکم ہو کر آئے ہیں سواروں نے جواب دیا کہ اگر آپ حضرت عثمانؓ کی طرف سے آئے ہیں تو حکومت حاضر ہے لیکن اگر کسی اور نے بھیجا ہے تو جس نے بھیجا ہے اسی کے پاس واپس چلے جائیے، چنانچہ وہ حضرت علیؓ کے پاس چلے آئے جیسے ہی لوگوں کو یہ معلوم ہوا سخت رنجیدہ ہوئے اور یقین کر لیا کہ معاویہ لڑائی پر آمادہ ہیں اب لوگوں نے حضرت علیؓ کا خیال معلوم کرنا چاہا کہ وہ کیا چاہتے ہیں، لڑیں گے یا صلح کریں گے یا

دکان پر جاتا، بنیا اس کو دیکھ کر سب کام چھوڑ دیتا چاہے اس کے سر پر بڑے سے بڑا تاجر ہی کیوں نہ کھڑا ہوتا، وہ سارے گاہکوں کو ہٹا دیتا، برتن لیتا، کوڑیاں گنتا اور نمونے دیکھتا، پھر ہاتھی کو بے حد سستے داموں چیزیں دیتا، اور سب سے بڑھیا قسم - ہاتھی خریدتا اور چیز بڑھاتا جاتا (؟) کبھی بنیا کوڑیاں گنتا اور گننے میں غلطی کرتا تو ہاتھی سونڈ سے کوڑیوں کو اُلٹ پلٹ دیتا، تب بنیا دوبارہ گنتا۔ ہاتھی سودا لے کر لوٹ جاتا، کبھی اس کا مالک چیز کو کم سمجھ کر ہاتھی کو مارتا تو وہ پھر بنیئے کی دکان کو واپس جاتا اور اس کا سامان اُلٹ پلٹ اور گڈ مڈ کر دیتا، بنیا یا تو چیز بڑھا دیتا، یا کوڑیاں لوٹا دیتا۔ ایسا سدھا ہاتھی جھاڑو دیتا ہے، بستر کرتا ہے، اوکھلی کو سونڈ میں پکڑ کر دھان کوٹتا ہے اور ایک آدمی اس کے لئے دھان جمع کرتا جاتا ہے، اس کے علاوہ وہ چاول پیستا ہے، پانی پلاتا ہے، سودے کے برتن میں ایک رسی پڑی ہوتی ہے اس میں سونڈ ڈال کر اٹھا لے جاتا ہے اور سب کام کاج کر لیتا ہے، لمبے سفر کے موقع پر اس کا مالک اس پر سوار ہو کر جاتا ہے، بچہ اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر اس کو جنگل لے جاتا ہے، ہاتھی گھانس اور پتے اپنی سونڈ سے توڑتا ہے اور لڑکے کو دیتا جاتا ہے جو ایک کساء (؟) میں ان کو جمع کر لیتا ہے، یہ چارا ہاتھی اٹھا کر گھر لے آتا ہے اور کھاتا ہے۔ ایسا سدھا ہاتھی جھنگا ہوتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی قیمت دس ہزار درہم (پانچ ہزار روپئے) ہوتی ہے۔

۲/۸۹ عبدالواحد حسین قنسوی نے مجھ سے بیان کیا:- میں نے تربیتی (مسالک: رس) میں ایک خوش رُو اور خوش بدن مسلمان لڑکے کو

دیکھا جو ہند میں پیدا ہوا تھا اور جس کے اطوار ہندوانہ تھے، کہ وہ ہاتھ میں ڈنڈا لئے سارے شہر میں گھوما کرتا اور اس کے آگے آگے ڈھول اور بگل بجانے والے ہوتے۔ میں نے اس سے پوچھا کیا بات ہے تو اس نے کہا: میں نے ایک ہندو سے شرط بدی ہے کہ خودکشی کروں گا۔" میں اس کے ساتھ خیر اندیشی سے پیش آیا اور نرمی سے سمجھایا کہ اپنے ارادہ سے باز آئے، لیکن وہ نہ مانا اور بولا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں شرط پوری نہ کروں؟" میں نے کہا تم مسلمان ہو اور تمھارے اس فعل سے مسلمان بدنام ہوں گے؟" خدا سے ڈرو اور خود کو جہنم میں مت دھکیلو۔" میرا کہا کچھ کام نہ آیا۔ دوسرے دن راجہ کا خاندان اور شہر کے لوگ تربینی میں جمع ہوئے اور لڑکا اکڑتا پان چباتا آیا، اس کے جسم پر دو کپڑے تھے، ایک قمیص اور ایک دھوتی۔ اُس نے وہاں کی مسجد کا چکر لگا کر، اس کو سجدہ کیا پھر دونوں کپڑے اپنے دو ساتھیوں کو دے دئے اور لکڑی کی ایک کرسی پر چڑھا جو اس کے لئے بنائی گئی تھی، وقدّ علی خشبتین وبدیلہ بلین ثلاث خشبات (؟) اپنے بال ایک بانس کے سرے سے باندھے، اور دوسرے دو بانسوں کے سروں سے اپنے پیروں کے انگوٹھے۔ پھر اس کے پاس ایک شخص آیا جس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی، پانچ سیر پھل کی اور استرے سے زیادہ تیز، اس نے لڑکے کی پنڈلی پر کلہاڑی ماری اور پیر مع پنڈلی کے بانس کے سرے سے لٹک گیا، دوسرا پیر بھی اسی طرح اس نے کاٹ دیا۔ ثم وضع المنشار علی عاتقہ الآخر فالحق القطع الثانی بالاول، متعلق الرأس مع العنق مع الصدر وما مع ذلک فی رأس القناۃ (؟) لڑکے کے گھر والے آ گئے اور انھوں نے اس کے جسم

کے ٹکڑوں کو جمع کر کے دفن کر دیا۔

ایک ایسے شخص نے جو ہند کے حالات سے خوب واقف ہے بیان کیا کہ ہندر کا ایک بڑا بادشاہ کھانا کھا رہا تھا اور اس کے سامنے پنجرا لٹک رہا تھا جس میں ایک طوطا تھا۔ بادشاہ نے طوطے سے کہا: آ میرے ساتھ کھانا کھا، طوطا بولا: 'مجھے بلی کا ڈر ہے'۔ بادشاہ: "أنا بلا وجرك!" ہندی زبان (غالباً سنسکرت) میں اس کے معنی ہیں کہ اگر تجھ کو کوئی نقصان پہنچا تو ویسا ہی میں اپنے کو پہنچاؤں گا"۔ اس لفظ کی زیادہ واضح تفسیر یہ ہے کہ مثلاً ہند کے کسی بادشاہ کے پاس اس کی حیثیت اور مرتبہ کے مطابق، لوگ آتے ہیں اور کہتے ہیں: نحن بلا جروك! یہ سن کر بادشاہ ان کو اپنے دستِ خاص سے چاول اور پان دیتا ہے۔ اب آنے والوں کا ہر فرد اپنی چھنگلی کاٹ ڈالتا ہے اور بادشاہ کے سامنے (عہد جانسپاری کے طور پر) رکھ دیتا ہے۔ اس کے بعد جہاں کہیں بادشاہ جاتا ہے یہ لوگ اس کے ساتھ جاتے ہیں، جو وہ کھاتا پیتا ہے وہی یہ کھاتے پیتے ہیں، اس کے کھانے کی نگرانی کرتے ہیں، اس کے سارے معاملات کا انتظام کرتے ہیں، بادشاہ کی کوئی چہیتی عورت یا باندی یا غلام اگر اس سے ملنے آئے تو یہ اس کا جھاڑا لیتے ہیں، بادشاہ کا بستر دیکھتے ہیں، (کہ اس میں کسی نے زہر قاتل تو نہیں رکھ دیا) اس کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز آئے تو لانے والے سے کہتے ہیں کہ پہلے تم کھاؤ، غرض یہ کہ اسی طرح کی اور بہت سی باتوں کی جن سے بادشاہ کو خطرہ ہوتا ہے دیکھ بھال کرتے ہیں اور اگر بادشاہ مرتا ہے تو یہ بھی مر جاتے ہیں، اگر وہ جل کر جان دیتا ہے تو یہ بھی جل مرتے ہیں، اگر وہ بیمار ہوتا ہے تو یہ بھی اپنے جسم

کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتے ہیں، اگر وہ دشمن سے لڑنے جاتا ہے یا دشمن
اس سے لڑتا ہے تو یہ پروانہ کی طرح اس کے ساتھ رہتے ہیں، ضروری ہے
کہ 'بلا وجریہ' شہر کے معزز، بہادر اور وجیہ لوگ ہوں۔ یہ ہے 'بلا وجریہ'
کی حقیقت۔ جب بادشاہ نے طوطے سے کہا کہ 'میں بلا وجرک ہوں'، تو
طوطا پنجرے سے اُتر کر کھانا کھانے دستر خوان پر آیا، بلی نے اس کو آ دبوچا
اور گردن کاٹ لی۔ بادشاہ نے ایک تھال میں طوطے کا دھڑ اور اس کے
ساتھ کافور، الائچی دانے، پان، چونا، اور چھالیہ رکھا، پھر ہاتھ میں تھالی
لئے ڈھول پٹواتا ہوا نکلا اور شہر اور فوج کا گشت لگایا، اس کے بعد وہ
ہر دن گشت کرانے کے لئے تھال بھیج دیا کرتا۔ جب دو سال گذر گئے
تو 'بلا وجریہ' اور دوسرے اعیانِ حکومت بادشاہ کے پاس آئے اور کہا:
یہ بڑی نامناسب بات ہے، طوطے کو مرے اتنا عرصہ گذر گیا، آپ کب
تک ٹالیں گے؟ یا تو اپنی ذمہ داری پوری کیجئے اور اگر پوری کرنے کا ارادہ نہ ہو تو
ہمیں بتا دیجئے تاکہ ہم آپ کو گدی سے اُتار کر کسی دوسرے کو بادشاہ بنائیں، کیوں کہ
جو شخص 'انا بلا وجرك' کہہ کر اپنی ذمہ داری کو ٹالے یا اس سے گریز کرے وہ
بھندا ہو جاتا ہے۔" بھندا اس ہیچ ذات آدمی کو کہتے ہیں جس کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ
اس کے خلاف کوئی فیصلہ صادر کیا جائے، جیسے گانے والا، شہنائی بجانے والا اور
اسی طرح کے دوسرے لوگ، ایفائے شرط کے معاملہ میں بادشاہ اور پرجا سب برابر ہوتے
ہیں۔ بادشاہ نے یہ باتیں سُنیں تو عُود، صندل اور گھی جمع کیا، اور ایک گڈھا کھدوایا
جس میں یہ چیزیں جلائی گئیں پھر وہ گڈھے میں کودا اور جل کر مر گیا، اس کے ساتھ اس کے بلا وجریہ
اور بلا وجریہ کے بلا وجریہ (یعنی فدائیوں کے فدائی) بھی جل کر خاک ہو گئے، اس طرح کل ملا کر
دو ہزار آدمیوں نے جان دی اور اس کا سبب طوطے سے بادشاہ کا یہ کہنا تھا کہ: "انا بلا وجرك"!
(باقی)

اسلام اِن موڈرن ہسٹری

ایک باب کا ترجمہ

از
پروفیسر ڈاکٹر ڈبلو، سی، اسمتھ
مترجم
(جناب ضیاء الحسن صاحب فاروقی ایم۔ اے)

(۲)

بہر حال ۱۹۴۷ء کے خوفناک دن گذر گئے اور رفتہ رفتہ ہندوستان نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ان دنوں کی یاد کو بھلا دیا جائے۔ لیکن اُس وقت کے گہرے زخم یکایک بھر نہیں سکتے، اور کوئی تلخی باقی نہ رہے، اس میں وقت لگے گا۔ پھر بھی دس سال کے اندر اندر مسلمانانِ ہند نے دھیرے دھیرے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ بڑے خطرے اب نہیں رہے۔ یعنی یہ کہ ہندوستان میں مسلمان ہمیشہ کے لئے فنا نہیں ہو جائیں گے ("جیسا کہ اسپین میں ہو چکا ہے") یا یہ جیسا کہ بعض لوگوں کو اندیشہ تھا کہ وہ ذلیل و خوار ہو کر رہیں گے۔ اکثریت نے محض جزوی طور پر مسلمانوں کو معاف اور ماضی کو فراموش کیا تھا، لیکن حکومت نے انھیں انتقام لینے سے باز رکھا۔

اس اکثریت کا جذبۂ خیر سگالی جس پر بہت سی چیزوں کا مدار اور انحصار تھا، مختلف حالات سے متاثر ہو رہا تھا، خاص طور سے جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، پاکستان کا رویہ اثر انداز ہوتا رہا۔ پاکستان مشرقی بنگال میں ہندوؤں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتا ہے اور خارجی معاملات میں ہندوستان سے متعلق اس کا رویہ کیا رہتا ہے، ان سب کا اثر ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ اکثریت کے رویہ اور رجحان پر پڑتا رہا ہے۔ جہاں ذرا بھی دونوں ملکوں کے تعلقات میں تناؤ پیدا ہوا یا پاکستان

کے ہندوؤں کے حالات خراب ہوئے، اس کا اثر ہندوستانی مسلمانوں پر ضرور پڑا ہے۔ مشرقی بنگال میں ہندوؤں کی کوئی نئی بے اطمینانی، سرحدوں پر کوئی نیا واقعہ، نہری معاملات میں کھنچاؤ یا پناہ گزینوں کی جائداد کے متعلق کوئی نئی بات ——— ان سب کا اثر ہندوستان میں مسلمانوں کی زندگی پر ظاہر ہوا ہے۔ اس عمل اور رد عمل نے مسئلہ کشمیر کی پیچیدگیوں کو اور بھی الجھا دیا ہے۔ کشمیر اگر پاکستان کو مل جائے تو اس سے ہندی مسلمانوں کے مفاد کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ یہاں تک کہ اگر کشمیر کے لئے پاکستان کی طرف سے کوئی دباؤ ڈالا جاتا ہے تو بھی ہندوستان میں مسلمانوں کا مفاد خطرہ میں آجاتا ہے۔ ہندوستان کے مسلم قوم پرست رہنماؤں نے اس حقیقت کو جان لیا ہے[1] اور اس کو ظاہر بھی کر دیا ہے لیکن پاکستانی اس بات کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔[2]

بہر حال کشمیر سب سے زیادہ اہم مسئلہ نہیں ہے۔ ہاں اس کے اثرات گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں اور نتائج اہم ہو سکتے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر زیادہ اہم وہ نقطۂ نظر یا فلاسفی ہے جو اعمال کے پیچھے کارفرما رہتی ہے۔ پاکستان کے وجود اور اس کے بعد کی سرگرمیوں کی بنیاد مسلم مفاد اور ہندوستانی نیشنلزم کے فرقہ وارانہ تاویلات پر ہے۔ ویسے تو باضابطہ طور پر اس کی سرکاری پالیسی حقائق کے دباؤ سے اثر پذیر ہو کر جلد ہی یہ ہو گئی تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر پاکستان کا کوئی غیر علاقائی حق نہیں ہے[3] مگر غیر سرکاری اور جذباتی طور پر اس حق کا احساس با اصرار باقی رہا۔ ہندوستان سے متعلق پاکستان کے رویہ میں اب بھی مخالفت کا عنصر غالب تھا اور اسے اصرار تھا کہ ہندوستانی حکومت غیر فرقہ وارانہ نہیں ہے۔[4] اس کے شہری نئے ہندوستان کی سیکولرازم کو

---

[1] ڈاکٹر فرینک گراہم اقوام متحدہ کے نمائندہ کے سامنے پیش کی ہوئی ایک یادداشت (۱۴ اگست ۱۹۵۱ء) جو ہندوستان کے چودہ مسلمان لیڈروں کی طرف سے تھی۔ [2] اس یادداشت کا ردعمل عام طور پر پاکستان میں یہ ہوا کہ یہ ایک مثال ہے اس بات کی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندو حکومت ہند نے کس طرح مغلوب کر رکھا ہے یہ رجحان اور یہ ردعمل سیاسی اعتبار سے حقیقت پسندی کے خلاف تھا۔ [3] لیاقت نہرو پیکٹ یا دہلی پیکٹ، ۸ اپریل ۱۹۵۰ء۔ اس کی پوری عبارت مڈل ایسٹ جرنل، واشنگٹن، ۴، ۴ : ۳۴۴-۴۶، ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ خاص طور سے اس کا یہ پیراگراف ملاحظہ ہو: "دونوں حکومتوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ اس بات پر زور دیں کہ اقلیتوں کو اسی ریاست کا وفادار رہنا ہے جس کے کہ وہ شہری ہیں۔ اور انھیں چاہئے کہ اپنی شکایتوں اور تکلیفوں کے مداوا کے لئے وہ اپنی ہی ریاست کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ [4] اس ملک میں، خاص طور (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہ کرسکے[۱]، اس کی تعریف اور حوصلہ افزائی کرنا تو بڑی بات ہے۔ اس حقیقت کو محسوس کرنے کے بجائے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کا انحصار ان کے "ہندوستانیت" اور ہندوستان کے سیکولرازم کی طرف بڑھنے میں ہے، پاکستان کا رجحان یہ رہا ہے کہ وہ اُس سیکولرازم کا مذاق اُڑائے[۲] اور یہ فرض کرے اور اس کی ہمت افزائی کرے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی ریاست کے وفادار نہیں ہیں[۳]۔

جزوی طور پر یہ صحیح ہے کہ اس صورت حال میں مختلف قومی مفادات کے تصادم کو بھی دخل ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی اور کچھ ہے، جس کی جڑیں مسلم لیگ کے اس نظریے سے ملتی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سے مغربی پاکستان میں باہر سے جانے والے ہر شخص پر واضح طور پر یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے۔ شائع شدہ لٹریچر میں بھی یہ چیز دیکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً حکومت کے پندرہ روزہ پاکستان نیوز ڈائجسٹ، کراچی کا تقریباً ہر شمارہ اور خاص طور سے روزنامہ ڈان، کراچی کے اداریے۔ [۱] یہ وہی قبل از تقسیم مسلم لیگ کا رویہ اور رجحان ہے جو اس نے کانگریس کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا۔ یعنی اُسے اصرار تھا کہ نہ صرف مسلم لیگ ہی ایک مذہبی فرقہ ("قوم") کی نمائندہ ہے بلکہ کانگریس بھی محض ایک ہی فرقہ کی نمائندگی کرتی ہے اور اسے چاہیئے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرے۔ لیگ اپنے آپ کو کبھی یہ ماننے پر تیار نہ کرسکی کہ کانگریس کا اصولاً اس سے مختلف تھا یعنی یہ کہ ان دونوں جماعتوں کے اختلافات دراصل ایک فرقہ وارانہ جماعت اور ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت کے اختلافات تھے۔ یہی وہ حقیقی مسئلہ تھا جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان شروع سے مصالحت کی ہر کوشش ناکام ہوتی رہی۔ (ملاحظہ ہو:۔ ڈبلیو سی۔ اسمتھ کی کتاب، ماڈرن اسلام ان انڈیا، لاہور، ۱۹۴۳ء، صفحات ۲۹۲-۲۹۴، لندن، "۱۹۴۶ء" (یا غالباً ۱۹۴۷ء)، صفحات ۲۵۳-۲۵۴، [۲] مثلاً ڈان، کراچی کا اس سلسلہ میں طنز کا معیار یہ ہے کہ وہ "سیکولر انڈیا"، ہمیشہ comma کے ساتھ لکھے گا۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایسا ذمہ دار اور سوچنے والا شخص (جب وہ پاکستانی حکومت کے ایک رکن تھے) ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق اپنی مایوسی کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ تحریری طور پر ظاہر کرے۔ پرنسٹن (امریکہ) میں ۱۹۵۳ء میں اسلامک کلچر پر غور و فکر کے لئے جو اجتماع ہوا تھا اس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے فرمایا: "سو سال میں یا شاید اس سے کم مدت میں، ہوسکتا ہے کہ اُس ملک (ہندوستان) میں مسلمان کا وجود ہی باقی نہ رہے۔" مقالہ کا عنوان تھا "دی فاؤنڈیشنز آف پاکستانی کلچر" جو "دی مسلم ورلڈ" (ہارٹ فرڈ) ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ [۳] قطع نظر اس کے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی پوزیشن پر اس کا کتنا برا اثر پڑتا ہے، نہ صرف تقریروں میں یہ باتیں کہی جاتی ہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو جن میں بعض ذمہ دار جگہوں پر ہوتے ہیں، اپنا ملک چھوڑنے پر

(بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

ہیں کہ "ہندوستان کے مسلمان ایک قوم ہیں"۔ . . . . یہ نظریہ جب عمل میں آیا تو اپنے ساتھ تصادم اور تباہی بھی لایا۔ یہ نقطۂ نظر اب بھی باقی ہے اور جب تک یہ باقی رہے گا، دردناکی کے ساتھ انتشار بھی باقی رہے گا۔

یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ خیالات اگر ان پر پہلے ہی سے اچھی طرح غور و فکر نہ کر لیا جائے، جب عمل میں لائے جاتے ہیں تو ان کا تضاد واضح ہو جاتا ہے[1] دو قومی نظریے کی مشکل بھی یہی تھی۔ اس نظریے کے ساتھ ایک بڑا پروگرام تھا اور اس کے ساتھ جذبات کا ایک اتھاہ سمندر تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس "مسلم قوم" کے ایک طبقہ کے حق میں اس کے نتائج مضر ثابت ہوئے۔ یہ ہندوستانی مسلمان ہی ہیں جنہوں نے پاکستان کے مطالبہ کے بھاری قیمت ادا کی۔

اس طرح جذباتی تضادات کے ساتھ ساتھ جہاں پاکستان کی تجویز میں ایک مثبت تعمیری عنصر تھا وہاں شدید نفرت اور خوف کا منفی پہلو بھی شامل تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کے اس مثبت نصب العین کے سلسلہ میں کہ وہ آزاد ہو جائیں، ایک منفی جذباتیت کا اظہار کیا اور اُن کے آزاد ہونے کی خواہش کی مخالفت کرتے رہے۔ پاکستان بن گیا لیکن منفی رجحان باقی رہا، ہندوستان میں اس کے ردِ عمل کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ پاکستان کی خامیوں کی قیمت مسلمانانِ ہند ادا کر رہے ہیں نہ صرف موجودہ سرگرمیوں کے نتیجہ میں بلکہ نظریہ پاکستان کے بنیادی عوامل کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ابھارا جاتا ہے، جوش اور بریگیڈیر اندیس کی مثال پہلے دی جا چکی ہے۔ انھیں پاکستان اور حکومتِ پاکستان کی طرف سے طرح طرح کی پیش کش کی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں میں ہندوستانی یونیورسٹیوں کے وہ گریجویٹ بھی ہیں جو امتحان پاس کرنے کے بعد فوراً پاکستان چلے جاتے ہیں اور وہاں انھیں ملازمتیں مل جاتی ہیں۔

[1] کم سے کم پاکستانیوں کے نزدیک مسٹر جناح ایک بڑے چالاک اور ہوشیار رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایک اچھے "مجادلہ باز" اور وکیل تھے لیکن شاید یہ موقع مناسب نہیں ہے کہ اُن کی سیاست دانی اور تدبر کو معرضِ بحث میں لایا جائے۔ غالباً انھوں نے کبھی پنجاب اور بنگال کا نقشہ بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پنجاب کے نہری سسٹم کا سمجھنا تو بڑی بات ہے۔ کشمیر اور پاکستان کی سرحدوں کی موجودہ صورتِ حال کا تصور بھی وہ نہیں کر سکے تھے۔ اُن کے ذہن میں پاکستانی سرحدوں کا اور ہی نقشہ تھا۔ (ملاحظہ ہو: گاندھی جناح گفتگو ۱۹۴۴ء)

پھر انتظار کرنا پسند کریں گے۔

لیکن حضرت علیؓ حق پر رہنے کے بعد جھکنے کے قائل نہ تھے وہ چال کرنے اور ناک میں رہنے کا کام نہیں کرتے تھے اور نہ باتوں میں لگی لپٹی یا ڈھکی چھپی رکھتے تھے پھر بھی معاویہؓ کے معاملے میں انھوں نے کسی جلد بازی سے کام نہیں لیا بلکہ مسود ابن مخزمہ کو اپنا ایک خط دے کر بھیجا جس میں معاویہؓ کو لکھا کہ وہ بیعت کرلیں اور شام کے رؤسا اور معززین کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ آجائیں، خط میں یہ نہیں لکھا تھا کہ وہ اپنے علاقے کے حاکم باقی رہیں گے کہا جاتا ہے کہ یہ خط حضرت علیؓ نے سبرہ جہنی کے ہاتھ روانہ کیا تھا، معاویہؓ نے جب یہ خط پڑھا تو کچھ جواب نہیں دیا بلکہ انتظار میں رکھا اور حیلے کی فکر کرنے لگے، حضرت علیؓ کا نامہ بر جب جواب پر اصرار کرتا تو اس کو خوفناک جنگ کے مناظر پیش کرنے والے اشعار سناتے[1]

حضرت عثمانؓ کے حادثے کا تیسرا مہینہ تھا جب معاویہؓ نے ایک دن بنی عبس کے ایک آدمی کو بلایا اور اس کو اپنے دستخط کا ایک طومار دیا جس کی سرخی تھی — من جانب معاویہ ابن ابی سفیان بنام علی ابن ابی طالب — اور اس کو ہدایت کردی کہ جب مدینہ میں داخل ہو تو اس لپٹے ہوئے کاغذ کو اونچا کردے کہ لوگ سرخی پڑھ لیں اس کے بعد اس کو علیؓ کے حوالے کردینا اور اگر وہ تمھارے آنے کے بارے میں تم سے کچھ باتیں کریں تو تم ان سے یوں کہنا — اور یوں کہنا — یہ عبسی مدینہ پہنچا اور طومار کو اتنا بلند کیا کہ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ معاویہ کا جواب لے جارہا ہے اب لوگوں کی آتش شوق تیز ہونے لگی کہ دیکھیں معاویہ نے کیا لکھا ہے غالباً

---

[1]

ادم ادامة حصن اوخذا بیدی	حربا ضروسا تشب الجزل والضرما
فی جارکم واھلکم اذکان مقتلہ	شنعاء شیبت الاصداغ واللھما
اعیا المسود بھا والسید ون فلم	یوجد لھا غیر نا مولی ولاحکما

قلعہ کی طرح جمے رہو، یا پھر مجھے ایک ہولناک لڑائی کی دعوت دو۔
تمھارے پڑوسیوں اور لڑکوں کی ایسی سخت خوں ریزی ہوگی کہ کنپٹی اور سر کے بال سفید ہو جائیں گے۔
آقا اور غلام دونوں عاجز ہو جائیں گے اور ہمارے سوا کوئی والی اور حاکم نہ ہوگا۔

بہت سے لوگ عبسی کے پیچھے حضرت علیؓ کے مکان تک پہنچے ہوں گے، جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے وہ طومار آپ کو دیا آپ نے اس کو کھولا تو اس میں صرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا ہوا پایا اس کے سوا اس میں کچھ نہ تھا تب آپ نے عبسی سے پوچھا کیا خبر لائے ہو اس نے جان کی امان طلب کی حضرت علیؓ نے منظور کر لیا اس کے بعد اس نے بتایا کہ شامی حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلا لینے کا پکا ارادہ کر چکے ہیں انھوں نے حضرت عثمانؓ کا خون آلود پیرہن عوام کے لئے لٹکا دیا ہے جس کے گرد و پیش لوگ جمع ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں پھر اس نے کہا کہ شامی آپ کو حضرت عثمانؓ کے خون کا ملزم قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کے خون کے سوا ہمیں کوئی بات منظور نہیں، اس کے بعد عبسی باہر نکلا اور معاویہ کے خلاف مشتعل مجمع سے بڑی مشقت کے بعد چھٹکارا پا سکا۔

اس کے بعد حضرت علیؓ نے مدینہ کے بڑے بڑے لوگوں کو بلایا جن میں طلحہؓ اور زبیرؓ بھی تھے اور سب کے سامنے معاویہؓ کی پیش کش یعنے اعلانِ جنگ رکھا اور کہا بھلائی اسی میں ہے کہ فتنہ بڑھنے اور بڑے ہونے سے قبل ختم کر دیا جائے اور قبل اس کے کہ شامی ان پر حملہ آور ہوں۔ شامیوں پر حملہ کر دیا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی طرف سے حضرت علیؓ کو تسلی بخش جواب نہیں ملا اور لڑائی کے لئے جس جوش و خروش کی ضرورت تھی اس کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ پھر طلحہؓ اور زبیرؓ نے آپ سے مکہ جانے کی اجازت چاہی جس میں درخواست کی سی نرمی نہیں بلکہ مطالبہ اور اصرار کی سی شدت تھی اور عدم منظوری کی حالت میں خلاف ورزی کی دھمکی بھی، حضرت علیؓ نے کہا جہاں تک ہو سکے گا روکنے کی کوشش کی جائے گی۔

بہت سے مورخوں کا بیان ہے کہ طلحہؓ اور زبیرؓ نے عمرہ کی غرض سے مکہ جانے کی اجازت چاہی تھی اور حضرت علیؓ کو ان کی اس غرض پر شبہ تھا اس لئے ان دونوں نے آپ کو یقین دلایا کہ ان کا مقصد صرف عمرہ ہے، بات جو بھی رہی ہو یہ دونوں، حضرت علیؓ کی مرضی سے یا خلافِ مرضی، بہر حال مکہ روانہ ہو گئے اور حضرت علیؓ شامیوں سے جنگ کی تیاری کرنے لگے کہ ان کے اقدام سے پہلے

خود حملہ کر دیں۔

ابھی آپ لڑائی کی تیاریوں میں تھے کہ مکہ سے بے چین کر دینے والی خبریں آئیں جن سے آپ کی رائے میں تبدیلی پیدا ہو گئی، اور آپ نے اپنا منصوبہ اور منزل بدل دی۔

علیؓ کے مخالفین

آپ جانتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کا حادثہ حج کے دنوں میں ہوا، اس وقت مدینہ کے بہت سے لوگ حج سے فارغ ہو کر واپس ہو رہے تھے، ان کو واقعے کی اطلاع مدینے کے راستے ہی میں ملی، ان میں کچھ تو ایسے تھے جو یہ سن کر مدینہ پہنچے اور حضرت علیؓ کی بیعت کر لی اور کچھ ایسے تھے جو خبر پاتے ہی اُلٹے پاؤں مکہ واپس آ گئے اس لئے کہ فتنہ و فساد سے دور رہنا چاہتے تھے یا یہ کہ ان واقعات کا اُن پر بہت بُرا اثر پڑا اور ان کے دلوں میں نئے خلیفہ کے خلاف غصے اور مخالفت کے جذبات پنہاں تھے، خود مدینہ کے بعض لوگ جو حضرت علیؓ کی بیعت کے موقع پر حاضر تھے بیعت کر لینے یا بیعت سے انکار کر دینے کے بعد مدینہ چھوڑ رہے تھے اس لئے کہ ان کو حضرت علیؓ سے اختلاف تھا یا اس لئے کہ وہ مکہ میں گوشہ نشین ہو جانا چاہتے تھے کیوں کہ مکہ مکرمہ امن و عافیت کا حرم ہے جہاں خون خرابہ نہیں ہو سکتا جہاں پہنچ جانے والے کو ڈرایا دھمکایا نہیں جا سکتا، چنانچہ عبداللہ ابن عمرؓ اپنی جان اور اپنا دین فتنوں سے بچائے مکہ کے لئے نکل پڑے، حضرت علیؓ ان کو واپس بلانے کے لئے سوار دوڑانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ آپ کی صاحب زادی ام کلثوم جو حضرت عمرؓ کی زوجہ محترمہ تھیں آ گئیں اور حضرت علیؓ کو یقین دلایا کہ وہ شورش اور مخالفت پیدا کرنے کی غرض سے نہیں جا رہے ہیں، طلحہؓ اور زبیرؓ نے بھی مکہ کا رُخ کیا جانے کا مقصد عمرہ کرنا بتایا، یا اطمینان دلایا کہ وہ معاویہؓ اور شامیوں کی طرف سے جنگ میں حصہ نہیں لیں گے پھر حضرت عثمانؓ کے گورنروں میں سے جس کو بھی موقع مل سکا وہ مکہ آ گیا، عبداللہ ابن عامر آئے، یعلی ابن اُمیہ آئے اسی طرح بنی اُمیہ کے بہت سے آدمی آئے انھیں میں سے مروان

ابن الحکم اور سعید ابن العاص ہیں، ازواج مطہرات میں سے مکہ میں حفصہ بنت عمرؓ، ام سلمہؓ، اور عائشہؓ بنت ابو بکرؓ موجود تھیں حضرت عائشہؓ تو حج سے فراغت پاکر مدینہ روانہ ہو چکی تھیں راہ میں حضرت عثمانؓ کے قتل کی خبر ملی اور بتایا گیا کہ لوگوں نے طلحہؓ کی بیعت کرلی یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئیں اس لئے کہ ان کی طرح طلحہؓ بھی قبیلہ تیم کے تھے لیکن پھر ان کی ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جس نے ان کو حقیقت حال سے باخبر کر دیا اور بتایا کہ مدینہ میں حضرت علیؓ کی بیعت کی جا چکی ہے یہ سن کر حضرت عائشہؓ کو بڑی کوفت ہوئی اور کہا علیؓ کو خلیفہ دیکھنے سے پہلے اچھا ہوتا کہ آسمان زمین پر گر پڑتا پھر ساتھ والوں سے کہا کہ مجھے واپس لے چلو چنانچہ مکہ واپس آگئیں، لوگوں میں یہ بات عام ہو چکی تھی کہ حضرت عائشہؓ حضرت علیؓ سے خوش نہیں ہیں بلکہ افک والی بات کے بعد تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ حضرت علیؓ سے سخت ناراض ہیں جب آنحضرتؐ کو تسلی دیتے ہوئے حضرت علیؓ نے عائشہؓ کو طلاق دے دینے کا اشارہ کیا اور کہہ دیا کہ — اور بہت سی عورتیں ہیں۔ یہ واقعہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے جس میں اللہ نے حضرت عائشہؓ کی براءت کی ہے، پس حضرت عائشہؓ حضرت علیؓ کی یہ بات دل سے بھلا نہ سکیں، اس زمانے میں مسلمانوں کی تاریخ، جن زبردست اور مؤثر ترین شخصیتوں سے روشناس ہو سکی ان میں ایک شخصیت حضرت عائشہؓ کی بھی ہے، وہ اپنے والد ماجد کی طرح صرف نرم دل نہ تھیں بلکہ ان میں فاروق اعظمؓ کی طرح شدت بھی تھی، پھر وہ اس وراثت کی بھی خاص حصہ دار تھیں جو جاہلیت کے دور نے عربوں کو دیا تھا چنانچہ وہ بہت زیادہ اشعار یاد کرتی تھیں، پڑھتی تھیں اور برمحل پیش کیا کرتی تھیں اپنے والد کو حالت نزع میں دیکھ کر آپ نے جب شاعر کا یہ شعر پڑھا[1]۔

لعمرک ما یغنی الثراء عن الفتیٰ   اذا حشرجت یوماً وضاق بها الصدر

زندگی کی قسم نزع کی حالت میں دولت انسان کو ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

---

[1] یہ شعر عرب کے مشہور سخی حاتم طائی کا ہے۔

(باقی آئندہ)

عربی کی ایک قلمی کتاب سے
تاریخ ہند پر نئی روشنی

از
(جناب ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب استاد ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

(۶)

۲/ ۲۸-۲۹

ابوالحسن محمد بن حرب نے مجھ سے کہا کہ شہر رتن (؟) کے باہر اس سے کوئی ساڑھے چار میل دور ایک بڑا مندر ہے جس میں پتھر کی ایک بڑی مورتی رکھی ہے، مندر میں ساٹھ عورتیں ہیں جن کی جسم فروشی کی کمائی مندر کی ضروریات، مورتی کی دیکھ بھال اور مندر کے عملہ پر وقف ہے. اس مندر میں جو پردیسی سفر کو جاتے وقت یا سفر سے لوٹتے وقت آتے ہیں وہ ان عورتوں سے مفت اپنی جنسی ضرورت پوری کرتے ہیں (اور ہما یمر أحد منهم بغير أُجرة ولا عوض ولا شئ ؟) کوئی مسافر اگر کسی عورت کو کچھ دے تو وہ نہیں لیتی. اس منصوری نے کہا کہ میں نے بعض سادھوؤں (منزویلیلین ؟) کو کہتے سُنا کہ عورتوں کے وقف کا سبب یہ ہے کہ ایک راجہ کی رانی ٹہل کر آ رہی تھی، وهی الظهار بين الى برمن (؟) کہ اس کا گذر ایک ناریل کے درخت کے پاس سے ہوا، درخت کے نیچے ایک شخص بیٹھا إستمنی بالید کر رہا تھا، یہ دیکھ کر وہ ٹھہر گئی اور اس کے حاشیہ کے لوگ بھی رُک گئے، وہ ہاتھی پر سوار تھی.

رانی کے حکم سے وہ شخص اُس کے پاس لایا گیا، وہ آیا تو رانی نے اس سے کہا: بھلے آدمی تجھے خدا کا کچھ خوف نہیں، تجھے کوئی بیماری نہیں اور پھر تو یہ کام کرتا ہے!" اس شخص نے کہا: میں نے مجبور ہو کر ایسا کیا" رانی: تو ایسے شہر میں آیا جہاں کسبیوں کی کوئی کمی نہیں، پھر بھی تو یہ حرکت کرتے ہوئے لوٹ رہا ہے، اس شخص نے کہا: میں پردیسی ہوں، میرے پاس کچھ نہیں ہے" رانی نے نوکروں کو حکم دیا کہ اس کا جھاڑا لیں، اس کا جھاڑا لیا گیا تو اُس کے پاس کچھ نہ نکلا۔ اس شخص کی زبوں حالی دیکھ کر رانی کو بڑا قلق ہوا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے کہا: واقعی یہ پردیسی ہے اور مجبور، اس کے پاس پیسہ نہیں کہ کسبی کے پاس جائے، اس کی اور اس جیسے کنگلوں کی تکلیف کا گناہ ہمارے سر ہے" اس نے اپنے ایک سکریٹری سے کہا: میں یہاں سے اس وقت تک نہیں ہلوں گی جب تک تم انجنیروں اور ٹھیکہ داروں کو نہیں بلاؤ گے اور اس جگہ ایک مندر کا تخمینہ نہیں لگاؤ گے، مندر میں پردیسیوں اور مسافروں کے لئے کسبیاں رکھو جو رات کو ان کے ساتھ رہیں۔ اس طرح رانی نے مندر بنوایا اور اس میں مورتی رکھی اور مسافروں کے لئے ساٹھ کنیزیں وقف کیں، جب کوئی کنیز بوڑھی ہو جاتی تو اُس کی جگہ جوان رکھ دی جاتی۔ شہر کا کوئی آدمی یا مندر کا کوئی خدمت گار اگر ان سے جنسی ضرورت پوری کرتا تو اس کو فیس دینا ہوتی، لیکن پردیسیوں سے کچھ نہ لیا جاتا۔

۲/۲۹ شیخ بہاء الدین بن سلامہ نے ہند کے دوسرے حالات کے ضمن میں یہ واقعہ بیان کیا:-

ہم نے ایک بندر پر لنگر ڈالا جس کے ایک جانب کھیتی تھی. ہم کھیتی کے برابر فروکش ہوئے، ہمارا ایک ساتھی جو ایک ممتاز تاجر اور مال دار آدمی تھا پیٹ کے بل لیٹ گیا، اس کا پیر پھیلا ہوا تھا، کھیت کے آخر سے ایک سانپ نکلا اور اس کا پیر ڈس لیا، سانپ جہاں سے آیا تھا وہاں چلا گیا، تاجر بے ہوش ہو گیا، ہم نے اس کو پلانے کے لئے تریاق نکالنا چاہا کہ ایک مقامی آدمی نے کہا: تریاق سے کام نہیں چلے گا، اگر تم اپنے ساتھی کی زندگی چاہتے ہو تو سانپ کے منتر والے کو بلاؤ. ہماری درخواست پر وہ خود ایک شخص کو جو سانپ کاٹے کا منتر جانتا تھا بلا لایا. منتر والے نے ننلو دینار (اس وقت کے حساب سے تیرہ سو روپئے سے زیادہ) فیس مانگی، ہم نے کہا دیں گے. اُس نے ابھی منتر کے چند بول پوری طرح ادا بھی نہ کئے تھے کہ سانپ آگیا. منتر والا: اِس سے کوئی کچھ نہ بولے، وہ مار گزیدہ کے پاس آیا اور وہ جگہ چوسی جہاں ڈنک مارا تھا، اِس کے بعد وہ لوٹ گیا. مار گزیدہ کھڑا ہو گیا گویا اِس کے کچھ ہوا ہی نہ تھا. ہم نے ننلو دینار فیس ادا کی اور منتر کی کرامات پر حیران ہوئے اور وہ جگہ چھوڑ دی اور بندرگاہ لوٹ گئے.

مجھ سے ایک شخص نے جو ہند کا سفر کر چکا تھا بیان کیا: میں نے سنا کہ اعلیٰ قسم کا نادر اور قیمتی الماس کشمیر میں پایا جاتا ہے. وہاں دو پہاڑوں کے بیچ ایک وادی ہے جس میں گرمی ہو یا جاڑا چوبیس گھنٹے آگ جلتی ہے اور الماس اس وادی میں ہوتا ہے. اِس میں ہند کے ایک نیچ ذات لوگوں کے علاوہ اور کوئی نہیں جاتا. اِن کی ایک ٹولی جان کی بازی لگا کر وہاں جاتی ہے، یہ لوگ دبلی بکریاں ذبح کر کے ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے ہیں

اور غلیلوں میں رکھ کر ایک ایک ٹکڑا پھینکتے ہیں، وہ خود آگ کے پاس نہیں جا سکتے، ایک تو آگ کی لپیٹ بہت تیز ہوتی ہے اور دوسرے لاتعداد سانپ اور اژدھے آگ کے قریب ہوتے ہیں اور ان میں ایسے زہریلے ہوتے ہیں کہ منٹوں میں آدمی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ جب گوشت پھینکتے ہیں تو اس کو اٹھانے گِد جو کثرت سے وہاں ہیں، اترتے ہیں: اگر گوشت آگ سے دور گرتا ہے تو وہ اس کو اٹھا لیتے ہیں یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ گِد نے گوشت اٹھا لیا ہے تو اس کا پیچھا کرتے ہیں، کبھی گوشت کے ٹکڑوں سے الماس کا کوئی دانہ گر پڑتا ہے۔ کبھی گوشت کا ٹکڑا آگ میں گرتا ہے اور جل جاتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گِد گوشت کے ٹکڑے پر اترتا ہے اور وہ ٹکڑا آگ کے قریب ہوتا ہے تو وہ گوشت کے ساتھ خود بھی جل جاتا ہے، کبھی گِد ٹکڑا زمین پر گرنے سے پہلے ہی اچک لیتا ہے۔ جو صورت بھی پیش آئے الماس حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے۔ اکثر الماس کی مہم پر جانے والے سانپوں اور اژدھوں کا لقمہ بن جاتے ہیں۔ چوں کہ الماس بڑا شان دار اور قیمتی پتھر ہے اس علاقہ کے راجے اس کی ٹوہ میں رہتے ہیں، اور الماس کی مہم پر جانے والوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں اور ان کا بڑا سخت جھاڑا لیتے ہیں۔

۳۶/۲ ایک سے زیادہ لوگوں نے مجھے بتایا کہ انھوں نے ہند کے کسی شہر میں ہاتھی دیکھا جو اپنے مالکوں کے کام کاج کرتا تھا۔ ہاتھی کو سودے کا برتن دے دیا جاتا اور اس میں کوڑیاں جن کے ذریعہ خرید و فروخت ہوتی، رکھ دی جاتیں اور مطلوبہ چیز کا نمونہ، جیسے مرچ، چاول اور سقط (؟)، غرض کہ ہر مطلوبہ چیز کا نمونہ اس برتن میں ہوتا۔ برتن لے کر ہاتھی بنیئے کی

ردِ عمل کے طور پر بھی۔ پاکستان کی کامیابیوں میں اِن کا کوئی حصہ نہیں لیکن انھیں اس کی خرابیوں کی پاداش میں مصیبتیں جھیلنی ہیں[1]۔

پاکستان میں اس داخلی اور جذباتی ہیجان کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمان نفسیاتی طور پر اس کو برحق سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک ہو رہا ہے اور اُن کی حالت بہت خراب ہے، اس سلسلہ میں اُن کا یقین اتنا پختہ ہے کہ بسا اوقات آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ پاکستان والے ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق بُری خبر سُننا پسند کرتے ہیں[2] اور اُن کے بارے میں فلاح و بہبود کی کوئی واقفیت انھیں گوارا نہیں۔ مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں کا جذباتی تعلق اب بھی بہت قریبی اور گہرا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان بڑی عجیب و غریب پوزیشن میں ہیں، اُن کے مستقبل کا معاملہ دو باہری گروہوں پر منحصر ہے۔ ان کے حالات پر نہ صرف یہ کہ اُن کے ملک کے اُن شہریوں کے رویے کا

---

[1] اس موقع پر مسئلہ "قربانی" کو یاد رکھنا چاہیئے یعنی یہ کہ پاکستان میں اسلام کو پھولنے پھیلنے کا موقع ملے اس کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے قربانی دی ہے۔ انجام کار وہ کہتے ہیں کہ "ہمارے بھائی آزاد ہو جائیں، بلا سے ہمیں مصیبتیں جھیلنا پڑیں"۔ یہ نقطۂ نظر کافی معقول ہے اگر اس میں سنجیدگی اور خلوص ہو، اور محض ذہنی تشفی کے لئے نئی تاویل نہ ہو۔ بہر حال یہ معلوم ہونے پر کہ پاکستان میں اسلام ترقی پانے کے بجائے منافق اور بے بس سیاست دانوں کے ہاتھ میں بڑی حد تک کھلونا بن کر رہ گیا ہے، قربانی دینے والے مسلمانوں کو بڑی تلخ مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ [2] بظاہر اس قسم کا احساس خاص طور سے گفتگو کے دوران میں ہوتا ہے۔ لیکن ایسے بھی ہوتا ہے جب پاکستانی پریس میں ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ بُرے سلوک کی کہانیاں ایک خاص انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔ ہمدردی کے علاوہ پاکستانی سائیکلوجی میں ایک عنصر یہ بھی ملتا ہے، زیادہ گہرائی میں نہیں، جو ہندی مسلمانوں کے متعلق کسی اچھی خبر کو سُننا پسند نہیں کرتا۔ آج بھی (۱۹۵۶ء) پاکستانی نیوز ڈائجسٹ بڑے اہتمام سے ہندوستان میں عیسائیوں کے ساتھ ناروا سلوک کی کہانیاں شائع کرتا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ، ایک طرح کی نفسیاتی ضرورت ہی پوری کرنی مقصود ہے (مثلاً کوئی وجہ نہیں کہ پاکستانی حکومت مصر کے عیسائیوں کے ساتھ بُرے سلوک کی داستانیں شائع کرے یا ارجنٹائن میں یہودیوں کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اُس کو اشاعت دے۔)

اثر پڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے جو اُن کے ہم مذہب نہیں بلکہ ایک دوسری قوم کے مسلمانوں کی سرگرمیوں
کا بھی۔ وہ ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونے پر مجبور کردیئے گئے ہیں جہاں انھیں ایک دوسری
مسلم جمعیت کی حقیقی یا غیر حقیقی حماقتوں اور زیادتیوں کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ لاہور میں اگر غیر مُسلم مارے
جائیں تو مسلمانانِ ہند مجروح ہوتے ہیں، ڈھاکہ میں اگر کوئی ناانصافی ہو تو ان کے ساتھ ہندوستانی
میں انصاف کرنے کا کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے پاکستان جتنا "اسلامی"
بنتا ہے (خاص طور سے ابھی تک ہیئت ہی ہیئت ہے، معنی کا دور تک پتہ نہیں) اتنا ہی ہندی
مسلمان اپنے آپ کو غیر محفوظ پاتے ہیں۔ ایک خبطی بھونڈے طریقے سے یہ کہہ سکتا ہے کہ پاکستان
میں اسلام کو جتنا فروغ حاصل ہوگا اسی قدر ہندوستان میں اسے انتشار کا سامنا کرنا ہوگا۔

اس خط کشیدہ ریمارک میں اگر کچھ بھی حقیقت ہے تو اس کی نفی اسی طرح ہوسکتی ہے کہ
ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے مسلمان اسلام کو ایک بلند داخلی اور نازک متحرک فکر
کے طور پر برتیں۔ اُن لوگوں کے لئے جو اسلام کی اس تعبیر کو اپنانے میں ناکام رہتے ہیں داخلی اور خارجی
دونوں طرح کی اُلجھنیں ہیں۔

اپنی بلائی ہوئی مصیبت ہم کہہ چکے ہیں کہ پاکستان کا نظریہ اور وجود میں ہندوستانی مسلمانوں کی "خرابی"
کی ایک صورت "مضمر" رہی ہے۔ لیکن ان کی خرابی کا اس سے زیادہ اہم سبب خود اُن کا اپنا
ذہنی رجحان اور رویہ ہے۔ پاکستان کی حکمت عملیوں کا اثر مقابلتاً اُن پر کم پڑتا اگر وہ اپنے خیالات
اور رویے کو ٹھیک رکھتے۔ پاکستان کے وجود سے زیادہ نظریۂ پاکستان سے مسلمانانِ ہند کو وابستگی
رہی ہے۔ تقسیم کے بعد یہ وابستگی ختم نہیں ہوئی اور یہی ان کے جذباتی اور سماجی انتشار کی سب سے
بڑی وجہ ہے۔ جب تک ہندوستانی مسلمان اسی طرز پر سوچتے رہیں گے اور اپنے رجحان اور رویے
سے پاکستانی مسلمانوں اور ہندوستانی ہندوؤں کو اس کا موقع دیتے رہیں گے کہ وہ انھیں "ہندوستانی
مسلمان" نہ سمجھیں اس وقت تک اُن کی حیثیت غیر واضح، بے رنگ اور مبہم رہے گی۔ انجام کار
اُن کی ساری صلاحیتیں منتشر ہو جائیں گی اس موقف نے پچھلے دس سالوں میں اُن کے دلوں

میں خوف وہراس پیدا کیا ہے اور آیندہ بھی داخلی اور خارجی، جذباتی اور سماجی عدم تحفظ کے احساس اور پریشان کن خیالات کا منبع بنا رہے گا ۔ خوف وتذبذب داخلی انتشار اور خارجی عدم اعتماد کی فضا میں پروان چڑھتا ہے ــــ ہندوستان کی دوسری جماعتیں اس وقت تک اُن پر بھروسہ نہیں کر سکتیں جب تک کہ وہ "ففتھ کالمسٹ" Fifth Columnist ظاہر ہوتے رہیں گے ۔ اور وہ خود بھی اپنے آپ پر بھروسہ نہیں کر سکتے ۔ ان شرائط کے ساتھ وہ اس صورتِ حال کو جس میں کہ وہ ہیں قبول کرنا تو درکنار مشکل سے تسلیم بھی کر سکتے ہیں ۔ یہ محض تاریخی الجھن ہی نہیں ہے یہ ایک دینی مسئلہ ہے ۔ ان کا مذہب ــــ اسلام ــــ وہ چیز ہے جو حالات کی پیچیدگیوں میں ان کا سہارا ہے ۔ ایک ایسا حقیقی سہارا جو عالمِ کس مپرسی میں ان کو حوصلہ بخشتا ہے ۔ لیکن وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ اسلام ہی ہے جو انھیں پاکستان سے جوڑتا ہے اور اس ہندوستان سے الگ رکھتا ہے جہاں وہ رہتے ہیں اور اسلام کا نقشہ اس میں اتنا ہاتھ نہیں ہے بلکہ یہ اسلام کی ایک مخصوص تعبیر اور تشریح ہے جس سے ١٩٣٠ء کے بعد کے برسوں کی اہم و نازک مدت میں، ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ جماعت کے سمجھدار افراد نے اپنے آپ کو الگ رکھا لیکن مسلمانوں کی اکثریت نے جس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور جس کے اثر سے مسلمانوں کی یہ جماعت پوری طرح آزاد نہیں ہوئی ہے ۔ اب ضرورت ہے کہ نئے حالات کے مطابق اسلام کو نئے ڈھنگ سے پیش کیا جائے جس میں قبل از تقسیم کا جذباتی رنگ نہ ہو اور جس میں ایسی متحرک لچک ہو جو اس جماعت کو آج کے مسائل اور مواقع سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دے ۔

مسلمانانِ ہند کی اکثریت نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ مجبور ہیں، اجہرہ بن گئے ہیں اُن خارجی حالات ورجحانات کے ہاتھ میں جن پر انھیں قابو نہیں ہے ۔ انھیں یکایک یہ اندازہ ہوا کہ انھیں ایسی صورتِ حال نے سابقہ ہے جسے وہ پسند نہیں کرتے تھے اور جس سے نجات پانے کے لئے وہ اندھے جوش وجذبہ کے ساتھ ہاتھ پاؤں مار رہے تھے مگر جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ صورتِ حال زیادہ

آزمائشوں کے ساتھ ان کے سر پر مسلط ہے۔

بہرحال یہ احساس، خواہ کتنا ہی گہرا اور اہم ہو، بُنیادی طور پر غلط ہے۔ اُن کی تاریخ نے جو یہ نئی کروٹ بدلی ہے تو اس میں نہ تو کسی جابر تقدیر کا ہاتھ ہے اور نہ کسی بیرونی طاقت کا۔ برخلاف اس کے یہ سب کچھ انھیں کا کیا ہوا ہے۔ اسلامی تاریخ کے اس واقعہ کی ذمہ داری خود اُن مسلمانوں پر ہے جو اس سے متعلق تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ان حالات کی آرزو نہیں کی تھی جن میں کہ آج وہ اپنے آپ کو پاتے ہیں، لیکن وہ قدم انھیں کا اٹھایا ہوا تھا جس کے نتیجہ میں یہ آج کے حالات رونما ہوئے۔ ۱۹۴۰ء کے بعد، طویل عرصہ تک دبے رہنے کے بعد، یہ جماعت آزادی کی منزل کی طرف بڑھی اور پھر اس آزادی کو قیام پاکستان کی جدوجہد میں استعمال کیا۔ یعنی تقسیم ہند کا مطالبہ کیا۔ اس لئے بُنیادی طور پر پاکستان کے قیام کی ذمہ داری ہندوستانی مسلمانوں پر ہے اور اسی لئے اس کے بعد ہندوستان میں اُن کی جو پوزیشن ہے اس کے بھی وہ ہی ذمہ دار ہیں۔ پاکستانیوں نے اُن کی پیروی کی اور پاکستان کو قبول کر لیا لیکن ہندوستانی مسلمانوں نے راہ دکھلائی اور پاکستان بنایا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ واضح طور پر اُس سانحہ کو نہ دیکھ سکے جس میں کہ وہ خود اپنی تاریخ ڈھال رہے تھے۔ یہ تو ممکن ہے کہ دور اندیش اور دانش مند بنے بغیر آزادی مل جائے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس آزادی کی ذمہ داری سے بری الذمہ ہوا جا سکے

ہندوستانی مسلمان اپنی نئی صورتِ حال کے لئے محض اس لئے ذمہ دار نہیں ہے کہ انھوں نے قیام پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ یہ ضرور ہے کہ یہ بنیادی بات ہے لیکن اس کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں جن میں سے ایک ۱۹۴۷ء کے بحرانی وقت میں لیڈروں کا پاکستان چلا جانا ہے۔ پڑھے لکھے مسلمان، تاجر اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو با اثر مسلمان تھے ان کی اکثریت نے پاکستان کا راستہ لیا اور عام مسلمان بڑی حد تک "کاروانِ بے یوسف" بن کر رہ گئے۔ مسلم لیگ نے اس "ہجرت" کی ہمت افزائی کی بغیر اس کا خیال کئے ہوئے کہ جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کا کیا بنے گا۔ کُل ہند کا پورے پیمانہ پر یہ بوجھ اُن اہم مسلمان شخصیتوں کے

چھوٹے سے گروہ نے اُٹھایا جو شروع سے قوم پرست رہی تھیں اور ہندوستانی قومیت کی آئیڈیل کی وفادار تھیں لیکن مقامی اور علاقائی پیمانے پر یہ بوجھ بہت بڑا تھا اور فوری عملی نتائج اور اخلاقی ذمہ داری و جرأت کے دیوالیہ پن کے اثرات کے لحاظ سے مسلمانانِ ہند کو بڑا شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ اب اس میں وقت لگے گا کہ یہ جماعت اپنے خالی اور یاس زدہ کیمپ میں سے بڑے پیمانہ پر ایک نئی لیڈرشپ پیدا کر سکے۔

یہ معاملہ اتنا زیادہ انتشار کا سبب نہ بنتا اگر ہجرت کا یہ سلسلہ جاری نہ رہا ہوتا۔ ۱۹۴۷ء کا بحران آیا اور ختم ہوگیا۔ اس وقت جن لوگوں نے پاکستان کا انتخاب کیا، انھوں نے گویا ایک فیصلہ کیا، جس کا غلط یا صحیح، احترام کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اُن کا معاملہ بالکل مختلف ہے جنہوں نے پہلے ہندوستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا اور وفاداری کی قسم کھائی لیکن بعد میں بے وفائی کی۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور مسلمانوں کی بے چارگی، کس مپرسی اور اس تلخ احساس میں اضافہ ہوتا رہا کہ وہ بے رہنما کے رہ گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس مسلسل "ہجرت" کا یہ اثر ہوا کہ جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے تھے ان کی وفاداری بھی مشکوک ہوگئی۔ ہندوستان میں ایسے ہندو اور مسلمان تھے جنہوں نے عام مسلمانوں کی پُشت پناہی کی یا انفرادی طور پر مسلمانوں کی ترقی، وقار اور اعتماد کے مسئلہ کو سہارا دیا اور ایسے ہندوؤں کی فرقہ پرستی کا مقابلہ کیا جو ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو غیر وفادار کہتے تھے۔ لیکن ایسے لوگوں کا موقف کمزور ہوتا رہا بعض مسلمانوں کے اعمال اور مثالوں سے جو ثابت کرتی تھیں کہ مسلمان حقیقت میں اپنے ملک کے وفادار نہیں ہیں۔

ایسے نوجوان مسلمانوں کی تعداد خاص ہے جنہوں نے یونیورسٹیوں سے ڈگری لی اور ہندوستان میں ملازمت تلاش کرنے کے بجائے پاکستان چلے گئے۔ کئی مشہور مسلم رہنماؤں نے اور بعض مثالیں تو ایسی ہیں کہ انھوں نے اس ملک کی وفاداری کا حلف اٹھایا اور ذمہ دار پوزیشن حاصل کی، بعد میں ایسے مواقع کی تلاش کی یا انھیں ایسے مواقع پیش کئے گئے کہ وہ اچانک سرحد پار پاکستان چلے گئے۔ ادبی اور مذہبی دنیا سے تعلق رکھنے والے بعض اہم اشخاص نے بھی یہ کیا اور غالباً سب سے زیادہ

مضرت رساں واقعہ وہ تھا جب ہندوستانی فوج کے ایک بریگیڈیر جنرل، ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کرنے، ذمہ دار عہدہ تک ترقی کرنے اور فوج کے خفیہ معاملات تک رسائی حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں اپنی درخواست پر ریٹائر ہوئے اور پاکستان چلے گئے اور وہاں حکومت کے ملازم ہو گئے۔

اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے لوگ اپنے رویہ سے ان مسلمانوں کی پوزیشن کتنی خراب کر دیتے ہیں جو ہندوستان میں بستے ہیں اور جنھیں ہندوستان ہی میں رہنا ہے۔ بریگیڈیر انیس نے جو حرکت کی ہے اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اب کسی مسلمان کا بریگیڈیر ہونا مشکل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جنرل ہونا بھی مشکل ہے۔ اردو کے مشہور شاعر جوش کی "ہجرت" کا نتیجہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں ان کے جانے کے بعد اردو کا مستقبل تاریک ہو جائے۔ پاکستانی اس قسم کی مثالوں سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہندوستان میں نہ صرف عام مسلمانوں کے حالات خراب اور غیر اطمینان بخش ہیں بلکہ وہ مسلمان بھی مطمئن نہیں ہیں جن پر ہندوستان کی نظرِ کرم ہے اور جو ذمہ دار جگہوں پر ہیں۔ بعد میں ہم اس مسئلہ اور اس کی تفصیلات پر مزید بحث کریں گے۔ اس موقع پر ہم صرف اسی واضح حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ عام اور خواص مسلمانوں نے اپنی پوزیشن، خواہ وہ کچھ بھی ہو خود اپنی غیر وفاداریوں کی مثالوں سے خراب کر لی ہے۔ یہاں ہم اس اخلاقی پہلو کی چھان بین بھی نہیں کریں گے کہ کیوں ان لیڈروں نے، اگر واقعی ان کے نزدیک مسلمانانِ ہند کی حالت بدتر ہے، محض ذاتی مفاد اور نجی ترقی کا خیال رکھا اور اس کا لحاظ نہ کیا کہ وہ ذمہ دار جگہوں پر رہ کر اپنے ساتھیوں کی خدمت کریں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی جماعت اپنے ملک اور اپنی موجودہ صورتِ حال کی حقیقتوں سے جو اجنبیت محسوس کرتی ہے وہ درحقیقت پیدا ہوئی ہے اس جذباتی الجھاوے سے جس کا رشتہ نہ صرف پاکستان سے بندھا ہوا ہے بلکہ خود اس کے اپنے ماضی سے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کے اسباب، (اگر یہ مشکلیں اپنی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں۔) کا سراغ لگایا جا سکتا ہے ان عوامل میں جن کا تعلق اس صورتِ حال سے ہے جس میں کہ وہ ہیں۔ ان میں سے ایک معاشی معاملہ ہے، جو بہت الجھا ہوا اور پیچیدہ ہے اور جس کا پچھتر سالہ ارتقا اس جماعت کے حق میں ناخوش گوار اور ناموافق رہا ہے کیوں کہ اس پورے زمانے میں یہ جماعت اتنے افراد اور ایسے گروپ نہیں پیدا کر سکی جو اسے اپنی تعداد کے پیشِ نظر کرنا چاہیے تھا اور جو اس قابل ہوتے جو نئے مواقع اور نئی ضرورتوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکتے یا ان سے فائدہ اٹھانے

کے اہل ہو سکتے۔ یہ ناموافق صورتِ حال، ایک ایسے ماحول میں جس کی پہنائیاں مستقل بڑھتی اور پھیلتی رہی ہیں مسلمانوں کی یہ جماعتی پسماندگی سبب بنی ہے نہ صرف افراد اور مختلف گروہوں کی معاشی زبوں حالی کا بلکہ اُن کے نفسیاتی اور جذباتی ہیجان کا بھی۔ مزید براں ان کی تہذیبی اور مذہبی سرگرمیوں میں بھی اس کے دور رس نتایج کا دخل رہا ہے۔

ایک مثال لے لیجئے: ہندوستان میں اسلامی تمدن کے تخلیقی مرکزوں میں اکثر کی مالی کفالت خاص طور سے زمینداروں یا نوابوں کی فیاضی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) (جو نیم کلاسیکی ادارہ ہے) سے لے کر حیدر آباد کے اسلامک کلچر تک جو مغربی طرز کا ایک رسالہ ہے۔۔ یہ سب ادارے اس طبقہ کی مالی امداد کے سہارے چلتے ہیں جو پچھلے عہد کی "باقیات" تھیں۔ اس ملک میں عرصہ سے عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق نئے حالات رونما ہو رہے تھے اور یہ ملک تیزی سے عہدِ جدید کی "برکتوں" کی طرف بڑھ رہا تھا باوجود اس کے کہ برطانوی حکومت نے اس کی ظاہری آب وتاب کو دبا رکھا تھا۔ ١٩٤٧ء کے بعد سرعت کے ساتھ یہ آب وتاب ظاہر ہونی شروع ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی آشکارا ہوگئی کہ صنعتی اور تکنیکی دور میں مسلمانوں کے جاگیردارانہ ادارے غیر محفوظ ہیں۔ زمینداری اور ریاستوں کا خاتمہ نئے ہندوستان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اسے تعمیر و ترقی کی طرف بڑا اور اہم قدم کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس سے "ہندوستانی اسلام" کی مشکلیں بڑھ گئیں ہیں تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ جماعت کتنی پسماندہ رہی ہے جو چیز مسلمانوں کو جانبدارانہ اور متعصبانہ امتیاز کی شکل میں نظر آتی ہے وہی ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے اُن کی کمزوری اور پستی ظاہر کرتی ہے۔

حیدر آباد کا المیہ (١٩٤٨ء)، اور اس کے خلاف مسلمانوں کا جذباتی احتجاج، اس کی واضح مثال ہے۔ یہ واقعہ مسلمانانِ ہند کی اس کوشش کا ایک اور ثبوت ہے کہ وہ جمہوری ہندوستان میں اپنی نئی پوزیشن تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایک شاندار ماضی کی دھندلی جاہ وحشمت سے متعلق ان کے جذبۂ خودداری کی پوشیدہ اور گذرے ہوئے زمانہ کی اس یادگار کو برقرار رکھنے کے

لئے ان کی پُرجوش لیکن بے سود کوشش ـــــ غرض ان کی تمام جذباتی ہیجان انگیزی اس بے نتیجہ ہنگامہ میں خوفناک طور پر ظاہر ہوگئی۔ نظام اور اس کی حکومت، بہت سے مسلمانوں کو، اسلامی تاریخ کی زمینی عظمت کی یاد دلاتی تھی اور جب اس حکومت کے زوال اور خاتمہ کے امکانات قوی ہوگئے تو انھیں اس افسوس ناک صورتِ حال کا احساس ہوا کہ اس "زمینی عظمت" کا زوال کہاں تک پہنچ چکا ہے۔

یہ سارا معاملہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اس سیاسی حماقت کی المناک اور واضح شرح ہے جس کے وہ عالم یاس وافسردگی میں مرتکب ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ اس سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ ذہنی اور اخلاقی طور پر اس بات کا اندازہ کرنے اور تسلیم کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ آج اور آنے والے زمانہ میں اسلام کی مرئی اور غیر مرئی عظمت کو نئی شکل اور مختلف انداز میں ظاہر ہونا ہے۔ اُن مسلمانوں کے لئے جو پیچھے کی طرف دیکھنے کے عادی ہیں یہ معلوم کرکے بڑی تکلیف ہوئی ہے کہ خدا اور انجمن اقوام متحدہ کسی کو بھی اس سے دل چسپی نہیں ہے کہ اسلامی کارناموں کی وہی قدیم شکل وصورت باقی رہے۔ ہندوستان میں اسلام کے عظیم اور پُرشکوہ مستقبل کی تعمیر اُن کے ہاتھوں نہیں ہوگی جو جاگیرداری نظام کے نمایندوں کی بڑائی اور کھوکھلی جاگیروں کے خاتمہ پر ماتم کرتے ہیں، بلکہ یہ بڑا کام وہ لوگ انجام دیں گے جو اسلام کی آفاقی اور ابدی سچائیوں کی تلاش میں کوشاں ہیں اور اس بات کی جدوجہد کرتے ہیں کہ ان کا پورا اثر موجودہ حالات پر پڑے۔

حیدرآباد کے مسلمانوں کو حالات کی غلط تاویلات کی جو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے اُسے بھی نہ بھولنا چاہئے۔ جب ہم مسلمانانِ ہند کی موجودہ پریشانیوں کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کا اندازہ بھی کرنا چاہیں کہ کہاں تک یہ دشواریاں خود اُن کی اپنی پیدا کی ہوئی ہیں، تو ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اُن کا ہر غلط قدم کتنے تباہ کن نتائج کا سبب بنا ہے۔

امید کی کرن اُن بڑھتے ہوئے حالات میں جن کا کہ انھیں سامنا ہے ہندوستان کے مسلمانوں میں دو رجحانات نمایاں رہے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کرچکے ہیں یعنی احساسِ نامطابقت

وعدم تحفظ کا خطرناک چکر اور دوسرا ہے حقیقت پرستی کی تکلیف دہ اور سست رفتار کامیابی یعنی یہ رجحان کہ تلخ حقایق کو سمجھنا چاہیے، اس سے سمجھوتہ کرنا چاہیئے اور سمجھ بوجھ کر، آزادی اور ذمہ داری کے ساتھ نئے ہندوستان کی سرگرمیوں میں شرکت کرنی چاہیئے، پہلے رجحان میں افسردگی اور فرار کی تلاش تھی، دوسرے میں اسلام اور اسلامیانِ ہند کی نئی زندگی کی صبح کے آثار ملتے ہیں جس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ایک نئی آزادی اور حالات سے مطابقت کا ایک تخلیقی حوصلہ، اہم تعمیر و ترقی اور نتیجہ خیز نشو و نما کا ایک امید افزا سلسلہ جو ہندوستان کی سرحدوں کو بھی پار کر جائے۔

یہاں ایک بار پھر ہم اسلام کے بنیادی "بحران" سے دوچار ہوتے ہیں، اس بحران کا تعلق ہے اُس اہم اور بڑھتے ہوئے تضاد سے جو مسلمانوں کے موجودہ حالات اور اُن پرانے اور ناموافق جذبات و نظریات میں ہے جن کے سہارے وہ نئی صورتِ حال کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تضاد ہندوستان کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ یہ حقیقت بیک وقت ان کی بے چینیوں اور ان بے چینیوں کے مداوا کے امکانات کا پیمانہ ہے۔

حالات کا خطرناک چکر برابر چل رہا ہے۔ خارجی حالات کو دیکھتے ہوئے جن کا تعلق ہندوستان، پاکستان اور گذری ہوئی تاریخ سے ہے، یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے آپ کو غیر محفوظ ہی محسوس کر سکتے ہیں اور یہ احساسِ عدم تحفظ ہی حقیقی صورتِ حال سے سمجھوتہ کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اِن کے ذہنی و جذباتی فرار (اور موقع ملنے پر جسمانی فرار —— یعنی پاکستان کا رُخ کرنا۔) کا سب سے بڑا سبب ہے۔

مثلاً، ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان میں مُسلم اقلیت کی کمزوری کا بنیادی سبب اس کا پاکستان سے (ذہنی و جذباتی) تعلق ہے۔ اور یہی وہ کمزوری ہے جس کی وجہ سے یہ مُسلم اقلیت اس تعلق کو ختم کر دینے کے لئے آمادہ نہیں ہوتی۔ یہ رشتہ منقطع ہو چکا ہے، اس حقیقت کو یا تو یہ جان بوجھ کر تسلیم نہیں کرتی یا اسے مان لینے کی اہلیت ہی نہیں رکھتی۔ جتنی زیادہ غیر محفوظ رہی ہے اتنا ہی اس نے یہ تعلق برقرار رکھنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ پایا ہے۔ (جب کہ یہی خارجی تعلق ہندوستان

میں اس کی پوزیشن کو نازک تر بنا دیتا ہے۔) ـــــ اسی طرح اگر ایک طرف خلیق الزماں، جو
اور بریگیڈیر انیس کا پاکستان بھاگ جانے سے مسلمانانِ ہند کی دشواریاں بڑھ جاتی ہیں تو دوسری
طرف یہی بات کسی دوسرے آدمی کے پاکستان چلے جانے کا معقول سبب قرار دی جا سکتی ہے
(اور قرار دی گئی ہے۔) حیدر آباد کے رضا کاروں کا ہنگامہ جن تباہ کاریوں کا سبب بنا اُن کا نتیجہ یہ
ہو سکتا تھا کہ بہت سے حیدر آبادی مسلمان جنھیں ان کا سامنا کرنا پڑا، اور بھی زیادہ مایوسیوں کا
شکار ہو گئے، معقول اور مناسب رویے کے لئے پہلے سے بھی کم تیار ہو سکے اور تعمیری اشتراک و
تعاون کی ذمہ داری لینے کے لئے پہلے سے اور بھی کم اپنے آپ کو اہل ثابت کر سکے۔ وہاں کے پڑھے
لکھے طبقہ نے اپنے نظریوں اور رجحانات پر نظر ثانی کرنے کے لئے جس سے زندگی کے نئے مسائل حل
کرنے میں ان کو مدد ملتی، کوئی کوشش نہیں کی ہے[۱]۔

ایسے حالات میں دانش مندی کی منطق ناکارہ ثابت ہوتی ہے۔ یہاں جذبات پورے طور
پر غالب رہے ہیں اور نظریات کی جڑیں دور تک گہرائی میں پہنچی ہوئی ہیں۔

باوجود ان باتوں کے حقیقت یہ ہے کہ صورتِ حال سنبھلی ہے۔ مذکورہ بالا دو رجحانات میں
سے ایک جو مایوسی و افسردگی کی طرف لے جاتا تھا، صرف تین چار سال تک غالب رہا۔ ۱۹۵۰ء کے
بتدریج مسلمان اس کے چنگل سے آزاد ہوتے رہے اور جیسا کہ ہم نے اشارۃً کہا ہے، یہ تبدیلی
ہمارے نزدیک بڑی کامرانیوں کے امکانات کا پیش خیمہ ہے۔ کیوں کہ واقعات نے خود سختی اور
بے رحمی کے ساتھ سبق سکھایا ہے۔ غلط تصورات اور اُن احمقانہ تاویلات کی بے منطقیت ہی نے
نہیں بلکہ عملاً اُن کے متواتر اور مجموعی طور پر تباہ کن نتائج نے حالات کا از سرِ نو جائزہ لینے کے لئے
مجبور کر دیا ہے۔ مزید براں ہندوستان میں جو کچھ ہوا ہے اور عام ترقی اور فلاح کی طرف جو قدم
اُٹھایا گیا ہے اس کی تعمیری خوبیوں کا بھی اس تبدیلی میں بڑا ہاتھ ہے۔

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کی مادی اور روحانی فلاح و بہبود کا راز اس میں ہے کہ وہ

---

[۱] ویسے کچھ قابلِ احترام مستثنیات بھی ہیں۔ ایک مثال ڈاکٹر سید عبد اللطیف کی ہے جو اکیڈمی آف اسلامک
اسٹڈیز کے منتظم کار اور صدر ہیں۔

خدا کے بھروسہ پر اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہوں، ہندوستان میں اپنی نئی صورتِ حال کو تسلیم کریں اور اس میں خود اپنی قسمت بنانے کے لئے اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیں اور قبول کریں، دوسروں پر بھروسہ اور اپنے آپ پر اعتماد کرنے کی صلاحیت پیدا کریں اور آزادی، ایمان داری اور تخلیقی قوتوں کے ساتھ نئی قوم کی زندگی کی سرگرمیوں میں شریک ہوں۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ گذشتہ پانچ برس کی مدت میں، تمام دشواریوں اور پریشانیوں کے باوجود، ہندوستانی مسلمان اس طرف آگے بڑھے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا ہاتھ سیکولرازم کی کامیابی کا ہے۔ سیکولرازم اگرچہ پوری طور پر کامیاب نہیں ہے لیکن بنیادی طور پر اس کا اثر پڑا ہے اور جتنا کچھ ہے ٹھوس ہے۔ مسلمانوں نے دیکھا ہے کہ ہندوستان میں لاقانونیت نہیں ہے، انھوں نے دیکھا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات میں پولیس نے انصاف برتنے کی کوشش کی ہے اور اس کا بھی تجربہ کیا ہے کہ سیکولر اسٹیٹ نے نشۂ کامرانی سے مخمور ہندؤں کو مسجدوں کو مندر میں منتقل کرنے کی کوشش سے روکا ہے[1]۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہندوستان میں رہ سکتے ہیں اور اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے میں آزاد ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں ہندوستان کے اکثر مسلمان یہ تسلیم کرنے کے لئے آمادہ معلوم ہوتے تھے کہ اُن کی حالت توقع سے زیادہ بہتر ہے۔

(بس ہندوستان میں مسلمان ہیں اور کافی ہیں —— ضیا) لیکن زندہ بچ جانے اور رہ جانے کے علاوہ بھی اور کچھ ہے، بعض لوگوں نے تو رہ جانے ہی کو غنیمت سمجھا ہے اور غیر شعوری طور پر اسی حالت پر مطمئن ہیں، اس معاملہ میں زیادہ غور و فکر نہیں کیا گیا ہے کہ ان کا ہندوستان میں رہنا اور ان کی فلاح و بہبود یہ سب منحصر ہے اسٹیٹ کے سیکولر ہونے پر اور اس طرح اس صورتِ حال کی دینی حیثیت کیا ہے (اور سیکولرازم اور اسلام کے اصولوں میں کہاں تک مطابقت ہے۔ ضیا) اس مسئلہ پر بھی ابھی نہیں سوچا گیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت واضح ہے، خواہ روایاتی مذہب اس کے بارے میں کچھ ہی کیوں نہ کہے، کہ سیکولرازم اپنا کام کر رہا ہے اور مسلمانوں کے حق میں یہ نعمت ثابت

---

[1] ملاحظہ ہو فیض آباد (یو۔ پی) کے قریب اجودھیا کی بابری مسجد کا واقعہ۔

ہوئی ہے۔ گنے چنے چند لوگ ہیں جو ابھی تک اسلامی اسٹیٹ کے نظریہ سے چپکے ہوئے ہیں[1]۔ اس نظریہ کی خوبیاں اور اس کے معنی اصولی طور پر چاہے جو کچھ ہوں، مسلمانانِ ہند کی اکثریت اس بات پر متفق ہو گئی ہے کہ موجودہ حالات میں یہ غیر ضروری، بے محل اور مضرت رساں ہے۔

حیدر آباد کے واقعہ نے اس احساس کو اور شدید کر دیا ہے۔ ایک مسلمان نے مجھ سے کہا کہ "جب مجھے معلوم ہوا کہ حیدر آباد میں پولیس ایکشن ہوا ہے، تو میں مسلمانوں کی حالت پر رو دیا، لیکن آخر میں، ان کے تمام آلام و مصائب کے باوجود، میرا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں یہ بہت مفید ثابت ہوا یعنی یہ کہ احمقانہ جذباتیت کا چراغ آخری بار بھڑک کر بجھ گیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ انھیں زندگی کی حقیقتوں کا، جیسی کچھ بھی وہ ہیں، مقابلہ کرنا چاہیے۔"

حقیقت پسندی کے اس رجحان کو اور تقویت ملی جب معلوم ہوا کہ پاکستان جنت نہیں ہے جس طرح بتدریج یہ بات معلوم ہوئی کہ ہندوستان کے حالات بہت خراب نہیں ہیں اسی طرح یہ چیز بھی آشکارا ہوتی رہی کہ پاکستان میں صورتِ حال بہت اچھی نہیں ہے۔ اور کچھ لوگ کم از کم اتنے ایماندار ہیں کہ یہ مانتے ہیں کہ نظری اور عملی اعتبار سے ہندوستان میں ایک اقلیت کی حیثیت سے ان کی پوزیشن پڑوس کی اسلامی جمہوریہ کی ہندو اقلیت سے بہتر ہے۔

جہاں تک مسئلہ کے مثبت پہلو کا تعلق ہے، مخلوط انتخابات نے کم از کم کچھ مسلمانوں پر "قومی" سیاست کا مطلب واضح کر دیا ہے اور فرقہ دارانہ موقف سے ہٹا کر ان کی توجہ انسانی پہلوؤں کی طرف پھیر دی ہے۔ یو۔پی کے میونسپل انتخابات میں کانگرس امیدواروں کے مقابلہ میں ان حلقوں میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے، آزاد مسلم امیدواروں کی کامیابی سے بھی مسلمانوں نے بہت کچھ سیکھا ہے[2]۔ اسی طرح یہ تجربہ بھی ان کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۵۱ء (اور ۱۹۵۶ء ۔ مینیا) کے عام انتخابات میں اپنے ووٹوں سے ہندو فرقہ پرستی کو بھاری شکست دی ہے۔

(باقی)

---

[1] جماعت اسلامی مستثنیات میں سے ہے جو پاکستان میں مودودی صاحب کی اسی نام کی جماعت سے وابستہ ہے۔
[2] سہارنپور (یو۔پی) میں جہاں ووٹ دینے والوں کی نصف تعداد سے زیادہ ہندو ہیں، کانگرس امیدوار کے مقابلہ

"عقاید جامی اُس کی شرحیں اور تراجم"

از

جناب محمد سخاوت مرزا صاحب بی۔ اے ال ال بی (عثمانیہ)

قدوۃ المحققین مولانا نورالدین عبدالرحمن جامی قدس سرہٗ (المتوفی ۸۹۸ھ)۔ نویں صدی ہجری کے نہ صرف ایک زبردست شاعر و ادیب بلکہ محقق صوفی گزرے ہیں جو محتاج تعارف نہیں حضرت موصوف کی تصانیف کے متعلق اختلاف آرا رہا ہے پاپولر انسائیکلوپیڈیا میں آپ کی تصنیفات کی تعداد ننانوے ۹۹ درج کی گئی ہے، آربتھ ناٹ کہتا ہے کہ ان کی تعداد ۴۰ تا ۵۰ ہے۔ تذکرہ علی قلی خاں داغستانی میں لفظ جامی کے اعداد کے برابر ۵۴ بیان کی گئی ہے۔ مگر عام تذکروں میں تصنیفات کی تعداد لفظ "جام" کے لحاظ سے ۴۴ ہے جس کی تفصیل مولانا اسلم جیراج پوری نے اپنی تالیف حیاتِ جامیؒ میں دی ہے۔ مگر عقاید جامی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جو عقاید نامہ یا اعتقاد نامہ یا عقاید جامی کے نام سے مشہور ہے۔ اور یورپی مستشرقین نے اس کو جامی سے منسوب کیا ہے اور یہ شبہ ظاہر کیا ہے۔ کہ یہ کتاب حضرت جامیؒ کی تصنیفات میں پائی نہیں جاتی۔

انڈیا آفس میں عقاید جامی کے تین نسخے ۱۳۸۱ پر درج ہیں۔ (فہرست کتاب خانہ انڈیا آفس مرتبہ ہرمن ایتھے جلد ۱) فاضل مرتب ہرمن ایتھے نے عقاید جامی کو ایک مستقل تصنیف قرار دیا ہے اور یہ لکھا ہے:-

"عقاید جامی ایک مختصر مثنوی صوفیانہ مصنفہ مولانا جامی ہے جس کا"

"دوسرا نام اعتقاد نامہ بھی ہے، اس کا ابتدائی شعر یہ ہے" بعد حمد خدا و نعت رسول الخ

مسٹر ریو (Rieu) برٹش میوزیم کے نسخوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ:-

"یہ جامی کی عام منظومات میں پائی نہیں جاتی" (ترجمہ)

لہ حیاتِ جامی مطبوعہ سلہ فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس مطبوعہ آصفیہ۔ سہ فہرست مخطوطات فارسی مرتبہ ریو

"It Is not Found in the Usual"
"Collections of Jami's prose works"

برٹش میوزیم میں اس کے چار نسخے ہیں :—

(۱) پہلا نسخہ ع ۸ مکتوبہ ۸/ذی الحجہ ۱۱۴۳ھ / ۱۴/جون ۱۷۳۱ء -

(۲) دوسرا نسخہ ع ۱۶۲/۱ دو صفحات تقطیع ۴ ۳/۴" × ۲ ۱/۲" خط شکستہ سنہ کتابت ندارد ناقص -

(۳) تیسرا نسخہ ع ۱۳۸۲ مکتوبہ ۵/شوال ۱۲۰۹ھ ۲۵/اپریل ۱۷۹۵ء -

(۴) چوتھا نسخہ ع ۱۳۴۵ از صفحات ۴۵ تا ۵۵ تقطیع ۴ ۳/۴" × ۲ ۱/۲" سنہ کتابت ندارد -

ضمیمہ فہرست برٹش میوزیم میں ایک پانچواں نسخہ بھی ہے جو ع ۱۶۸۱۹ کے مجموعہ میں محفوظ ہے - اور یہ لکھا ہے - اعتقاد نامہ (عقاید اسلامیہ منظوم - اور ڈاکٹر اسپرنگر کے حوالہ سے یہ بیان کیا ہے کہ یہ غالباً مولانا جامیؒ کی ہے - دیکھو ببلیو تھیکا اسپرنگر (۳ — ۵۹۱) —

نسخہ جات عقاید جامی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ :— (۱) ع ۵۰۱ فن کلام فارسی میں درد دوسرا نسخہ ع ۳۵/۸ شمولہ ع ۴۷۰ رسالہ تکمیل الایمان مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ کے ساتھ شیرازہ بند ہے جس کا سنہ کتابت ۱۱۴۱ھ ہے اور یہ نسخہ برٹش میوزیم کے نسخہ سے قدیم ہے -

نسخہ ادبیات عقاید نامہ فارسی :— عقاید نامہ مولانا عبدالرحمٰن جامی مکتوبہ غرہ رجب ۱۲۷۰ھ ناقص الاول - ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد ع ۴۸۱ -

کتاب زیر بحث طبع بھی ہو چکی ہے - جس کا ایک مطبوعہ نسخہ ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۷ء مطبوعہ مطبع حیدری بمبئی احقر کے پاس ہے دوسرا نسخہ مطبع انوری ۱۳۱۰ھ (مدراس ؟) (ع ۲۳۹ کتب خانہ سعیدیہ حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے) اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ حضرت جامیؒ کی کوئی علیحدہ مستقل تصنیف ہے یا درحقیقت یہ کوئی علیحدہ تصنیف نہیں بلکہ مولانا جامیؒ کی مستقل تصنیف سلسلۃ الذہب کا ایک حصہ ہے - جس کو ہمارے علماء اور صوفیاء کرام نے کار آمد اور مفید سمجھ کر کتابی شکل میں علیحدہ کر لیا اور

یہ علوم درسیہ اسلامیہ میں شامل تھی، اس لحاظ سے چارلس ریو، ہرمن ایتھے، اور ڈاکٹر اسپرنگر کی صاف اور واضح طور پر تردید ہو جاتی ہے کہ عقاید جامی "غالباً جامی کی تصنیف ہے یا جامی سے منسوب ہے" اس غلط فہمی کا ایک سبب تو سلسلۃ الذہب کا شاید عدم مطالعہ ہے یا سہو نظری دوسرے یہ کہ عقاید جامی کے علیحدہ نسخوں میں وہ تمہید نہیں ملتی جو سلسلۃ الذہب میں موجود ہے جس کو ہم احتیاطاً درج ذیل کرتے ہیں:

عنوان "رجوع بانچہ پیش ازیں اشارتے باں رفتہ بود"

پیش ازیں ذکر قاصد و نامہ | زد بلوح بیاں رقم خامہ
نامۂ بود بس عظیم الشان | قرۃ العین خواجہ مرسل آں
حاصل نامہ آنکہ می باید | چند بیتے رواں بنظم آید
در بیانِ عقایدِ اسلام | کافی اندر بیان آں و تمام
آں عقاید کہ ضبطش آساں است | وندراں خاص و عام یکسانست
ہر کہ ہست اہلِ سنت و دیدار | باشد اورا ز حفظ آں ناچار
اینک آنرا ہمی کنم املا | مستعینا بربنا الاعلیٰ

عقاید جامی کی ابتدا ء حمد سے ہوتی ہے ۔

بعد حمدِ خدا و نعتِ رسول | بشنو ایں نکتہ را بسمع قبول الخ

اور خاتمہ ۔

نعمتِ آں بود بروں ز شمار | برتر از جملۂ دیدار
کہ ببیند خدائے را ببصر | چوں شب چار دہ مہ انور

عقاید نامہ یا اعتقاد نامہ کے اختتام کے بعد حضرت جامیؒ نے سالک کو عشق حقیقی کی طرف رہنمائی فرمائی ہے چنانچہ سلسلۃ الذہب میں فرماتے ہیں:۔

گفتار در ختم دفتر اول از کتاب سلسلۃ الذہب و رفتن بسوئے انچہ تقریب باں رسیدہ بود و ز املائے سخنِ عشق بدفتر دیگر" الخ ۔

چوں شد ایں اعتقاد نامہ درست ٭ باز کردم بکار و بار نخست
کارِ من عشق و بارِ من عشق است ٭ حاصلِ روزگارِ من عشق است

جس سے یہ صاف واضح ہو جاتا ہے کہ عقاید جامی مولانا جامی کی تصنیف سلسلۃ الذہب کا ایک جزو ہے۔ اور اس میں تقریباً وہی مسائل ہیں جو عام طور پر عقاید کی مشہور کتابوں مثلاً عقاید نسفی، عقاید تفتازانی، فقہ اکبر، امام اعظم کوفیؒ، تکمیل الایمان شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ وغیرہ میں ہیں۔ اول الذکر تین کتابوں کی مکمل شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔ مگر ان میں محض متکلمین کا نقطۂ نظر ملحوظ ہے۔ اس لئے عقاید صوفیہ میں جو کتابیں مدون ہوئی ہیں وہ نہ صرف عقاید اسلام بلکہ حقایق و دقایق اور معارف پر مشتمل ہیں۔

جنوبی ہند کے عقاید ناموں پر ایک سرسری نظر

(۱) استقامۃ الشریعت بطریق الحقیقت، سید محمد حسینی گیسو درازؒ تصنیف ۷۹۲ھ

(۲) عقاید بندہ نوازؒ (سید محمد حسینی گیسو دراز اشرفی ۸۲۵ھ)۔

(۳) شرح فقہ اکبر فارسی (سید محمد حسینی گیسو دراز اشرفی ۸۲۵ھ)۔

(۴) فتوح العقاید، شیخ فتح محمد برہانپوری المتوفی ( )

(۵) عقاید حسینی، علامہ محمد حسین شہید، الملقب بہ امام المدرسین، مدرسہ محمود گاواں، بیدر المتوفی سنہ ۱۰۱۱ھ۔

(۶) عقاید صوفیہ مؤلفہ شیخ عبدالحق مخدوم ساوی بیجاپوری المتوفی ۱۱۶۵ھ۔

(۷) میزان العقاید، مولانا ابوالحسن قربی ویلوری، المتوفی ۱۱۸۳ھ۔

(۸) عقاید نامہ از علامہ محمد باقر آگاہ المتوفی ۱۲۲۰ھ - (مدراسی) (عقاید جامی پر مبنی ہے)

(۹) شرح عقاید جامی الموسوم بہ خلاصۃ البیان مؤلفہ علامہ محمد غوث المخاطب بہ شرف الملک مدراسی و مولوی عبدالوہاب المخاطب بہ مدار الامرا، تالیف سنہ ۱۲۶۶ھ (مطبوعہ سنہ ۱۲۷۱ھ - مدراس)

(۱۰) عقاید الاسلام (اردو) - مؤلفہ عبدالجلیل، منظوم۔ (اس کا ماخذ عقاید جامی ہے۔)

(۱۱) عقاید مصنفہ مولانا ابراہیم بن محمد، مکتوبہ سید شاہ محمد قادری حسنی الحسینی سنہ ۱۲۵۶ھ

بمقام چنیاپٹن مدراس - بعہد نیابت عظیم جاہ - بزمانہ طفولیت نواب غلام غوث خاں اعظم جو غالباً نواب اعظم کے لیئے تالیف کی گئی تھی ۔

(۱۲) عقاید الاسلام مؤلفہ مولانا ابو محمد عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی، (بعہد نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم)

(۱۳) شرح عقاید جامیؒ (فارسی) منسوب بہ شیخ عبدالحق مخدوم ساوی (متوفی ۱۱۶۵ھ) د مؤلفہ شیخ جمال محمدؒ - (مدراسی ؟) شیخ صاحب مخدوم ساویؒ کے غالباً مریدین میں سے تھے۔ مخدوم صاحبؒ کا ایک طویل مکتوب بنام جمال محمدؒ، ایک سالہ کی شکل میں محفوظ ہے - بہر حال شرح مذکور شریعت و طریقت و حقیقت اور علم کلام میں نہایت مدلل، جامع اور ضخیم ہے ۔

(۱۴) ایک کتاب شیعہ عقاید میں الموسوم بہ "صراط مستقیم فی دین قویم" سلطان ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ) سے منسوب کی گئی ہے - مرتبین فہرست کتب خانہ سالار جنگ بہادر حیدرآباد نے تصنیف وجہی گولکنڈوی - لکھا ہے - مگر ہماری رائے میں مشتبہ ہے - اس میں فرقہ ناجیہ، اور امامت، پر زیادہ زور دیا گیا ہے ۔

عقاید نامہ جامیؒ گو مختصر ہے مگر عقاید اسلام کے معرکۃ الآرا مسایل پر مبنی ہے - اور معنوی طور پر بہت سے اس میں ایسے اہم مسایل مضمر ہیں جو علم کلام اور عقاید صوفیہ میں مشترک ہیں جس کی ترجمانی اور شرح کوئی محقق صوفی ہی کر سکتا ہے جو علوم ظاہری و باطنی کا جامع ہو۔

عقاید جامیؒ کے اردو ترجمے بھی ہوئے ہیں - جن کا مختصر طور پر ذکر نامناسب نہ ہوگا :-

(۱) ترجمہ اردو عقاید جامیؒ از احمد علی میسوری، (دیکھو تذکرہ یادگار ضیغم تالیف ۱۳۰۲ھ مطبوعہ) مگر نظر سے نہیں گزری ۔

(۲) ترجمہ اردو عقاید جامیؒ، (کتب خانہ انجمن ترقی اردو علی گڈھ) نام مترجم و کاتب و سنہ ندارد۔

(۳) حمایت الاسلام ترجمہ عقاید جامیؒ م اہم ہے، مترجمہ مظفر الدین معلی حیدرآبادی، بایماء نواب فضیلت جنگ، (مولوی حافظ انوار اللہ خاں بہادر، مرحوم) - برائے تعلیم نواب اعظم جاہ

حمایت علی خاں بہادر ولی عہد آصف جاہ سابع مطبوعہ ۱۳۳۲ھ ۔ جو بہت مقبول ہوا اور اس کے تین اڈیشن چھپے اور شائع ہوئے اور محکمۂ امور مذہبی حیدر آباد نے نہ صرف طلبا بلکہ اہل خدمات شرعیہ کے لئے کئی سو جلدیں خریدیں ۔ بڑا اچھا ترجمہ ہے بیش قیمت ۔ حاشیہ بھی مدلل بحوالہ احادیث و آیات قرآنی لکھا ہے ۔

ابتدا :

حمد حق نعت نبی کے بعد مومن جان لے ۔ اس نصیحت کو مری دل سے یقیناً مان لے

وجہ تالیف :

یادگار میمنت تعلیم کے آغاز پر ۔ اس رسالہ کا ہوا ہے ترجمہ بھی پُر اثر

نام شہزادے سے ہے موسوم یہ جو نیک نام ۔ ہے حمایت نامۂ ایماں مقرر اس کا نام

ترجمہ منظوم جو میں نے یہ اُردو میں کیا ۔ فیض ہے بس حضرت جامیؒ کی روح پاک کا

سنہ تالیف :

کی جو فکر سال میں نے اے معلی نیک پے ۔ کہہ دیا دل نے تمامی ترجمہ مقبول ہے

۱۳۳۲ھ

خاتمہ :

نعمت دیدار خالق نعمت عظمیٰ ہے بس ۔ ختم ہے اس پر سخن اللہ بس باقی ہوس

عقاید جامی کی فارسی شرحیں (۱) شرح عقاید جامیؒ الموسوم بہ خلاصۃ البیان ، مشرحہ علامہ محمد غوث المخاطب بہ شرف الملک بہادر (مدراسی) ۔ جس کا تکملہ نواب مدار الامراء رئیس ارکاٹ نے کیا ۔ "جلا بخش گوہر ایمان" ، تاریخی مادہ ہے جو ۱۲۷۰ھ میں مطبع شرقیہ میں طبع اور شائع ہوئی ۔ ۱۲۰۹ھ

(۲) شرح عقاید جامیؒ از مولانا نور الدین سیال کوٹی ، جو میری نظر سے نہیں گزری ۔

(۳) شرح عقاید جامیؒ منسوب بہ شیخ عبد الحق ساوی بیجاپوری المتوفی ۱۱۶۵ھ المعروف بہ دستگیر صاحب ساوی مدفن مدراس جو ایک بڑے محقق صوفی تھے ، جن کے معرکۃ الآرا مباحثے مسائل تصوف

میں، بمقام دہلی، فتح خاں المعروف بہ فتی خاں معتقد حضرت شاہ رسول نماؒ سے نیز ایک عالم مولوی عزت اللہ سے بنگال میں ہوا تھا۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ غالباً یہ شرح آپ کے ایک مرید شیخ جمال محمدؒ کی لکھی ہوئی ہے جنھوں نے اسی میں اپنی تالیفات میزان التوحید اور بزم توحید کے حوالے دئیے ہیں۔

میزان التوحید مطبع برہانی حیدر آباد میں چھپ چکی ہے اور یہ بھی مخدوم ساویؒ سے منسوب ہے۔ محققانہ اور مدلل مختصر وجامع رسالہ ہے۔ جس کو حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ نے اپنے خاص مرید شیخ نورالدین کو گلبرگہ میں لفظ بہ لفظ پڑھایا تھا۔ (محبت نامہ)۔ اور شریعت پر استقامت کے لئے خاص زور دیا ہے۔ اور اپنے ملفوظات میں فرمایا ہے کہ لوگ حقیقت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ میرا قول یہ ہے "الشریعۃ افضل من الحقیقۃ" اور یہ استدلال کیا ہے کہ میں نے جوگیوں اور سنیاسیوں سے بھی حقیقت کے باریک نکات سنے ہیں، مگر اُس کو شریعت کا پاس ولحاظ کہاں، گویا صُمٌّ بُکْمٌ ہیں، یہی حال اُن سچے صوفیاء کا تصور کرنا چاہیئے جو شریعت کو نظر انداز کر دیتے ہیں ——— جس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ویدانت اور عقیدہ فلاطون اور اسلامی وحدۃ الوجود میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

میزان التوحید میں اسی مصنف نے اپنا نام قصداً ظاہر نہیں کیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ "ایں فقیر اظہار نام خود دریں رسالہ نمودہ بنابر آنست کہ اکثر مردم از کسے سخن شنوند نظر بر چہ می گوید نداشتہ بر کہ می گوید می بینند الخ"

بہرحال اس شرح کی تدوین کا زمانہ وسط بارہویں صدی یا ربع سوم بارھویں صدی ہجری ہے اور یہ کتاب علاقہ مدراس کے محققین صوفیاء کی اہم تالیفات سے ہے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے سوانح مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکیؒ کے ضمن میں اشارہ کیا ہے کہ حکیم صاحب مغفور، ایسی کتابیں فراہم کر کے ٹونک لے گئے تھے۔

شرح عقاید جامیؒ زیر بحث کے نسخے:-

(۱) شرح عقاید جامی، مکتوبہ ۱۲۶۹ھ۔ کاتب سید عبداللہ نانڈیری از اولاد شیخ محمد ملتانی بیدری ابتدائی چند ورق ندارد (مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ)

(۲) شرح عقاید جامی مکتوبہ ۱۲۹۵ھ کاتب سید وزیر علی حیدر آباد دکن (کتب خانۂ آصفیہ)

(۳) شرح عقاید جامی مکتوبہ ۱۳۰۹ھ، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن۔

(۴) شرح عقاید جامی مکتوبہ ۱۳۱۰ھ نام کاتب ندارد، عہد آصف جاہ ششم (کتب خانۂ احقر)

(۴) شرح عقاید جامی الموسوم بہ مُخ العقاید، مکتوبہ ۱۳۱۷ھ۔ حسب ذیل عبارت۔

نقل من مسودۃ الاصل ۱۳۱۷ھ۔ بقلم سید خلیل۔

غالباً یہ وہی سید خلیل ہیں جو نواب خورشید جاہ کے استاد تھے۔ (مخطوطہ کتب خانۂ مکرمی شیخ علاء الدین جُنیدی حیدر آباد دکن) مُخ العقاید وہی شرح زیر بحث رہی ہے۔

(۵) شرح عقاید جامی مکتوبہ ۱۳۳۶ھ۔ مکتوبہ قدوۃ العارفین شاہ کمال اللہ عرف مچھلی والے شاہ حیدر آبادی جس کی اصل عبارت تیمناً درج ذیل ہے:۔

"مورخہ ۲۲ ماہ شعبان المعظم ۱۳۳۶ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بقلم فقیر حقیر کمال اللہ شاہ چشتی القادری النقشبندی۔ برائے محب الفقرا و العلماء جامع صفدین شاہ احمد حسین چشتی القادری النقشبندی بمقام کاچی گوڑہ تحریر نمودہ دادہ شد۔ اللہ تعالیٰ از مطالعہ ایں شرح عقاید جامی رحمۃ اللہ علیہ شاہ احمد حسین چشتی القادری النقشبندی را بہرہ اندوز سازد و بمقام قربیت خود رساند آمین یا رب العالمین ۔"

(۶) شرح عقاید جامیؒ، مکتوبہ ۱۳۵۱ھ کتب خانہ مولوی عبد المجید مرحوم انجنیر آرائش بلدہ حیدر آباد جواب مولانا نوری شاہ صاحب کے پاس ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

(۷) شرح عقاید جامیؒ سنہ کتابت درج نہیں۔ بظاہر مکتوبہ وسط چودھویں صدی (کتب خانہ آصفیہ ۲۴۵)

(۸) شرح عقاید جامیؒ سنہ کتابت درج نہیں ناقص الاول بخط نستعلیق معمولی (کتب خانہ آصفیہ ۲۴۵)

شمالی ہند اور یورپ کے کتب خانوں کی فہرستوں میں اس کا کوئی نسخہ نظر سے نہیں گزرا۔

ابواب عقاید جامی :۔

(۱) حمد۔
(۲) ایمانِ مجمل۔
(۳) حق تعالیٰ کے واجب الوجود ہونے کا بیان
(۴) حق تعالیٰ کی یکتائی کا بیان
(۵) حق تعالیٰ کے اسماء جلالی و جمالی کا بیانِ جمالی
(۶) حیاتِ باری کی صفت۔
(۷) علم حق تعالیٰ کی صفت۔
(۸) ارادت و مشیتِ حق تعالیٰ کی صفت۔
(۹) قدرتِ حق تعالیٰ کی صفت۔
(۱۰) سمع و بصر حق تعالیٰ کی صفت۔
(۱۱) حق تعالیٰ کے کلام کا بیان۔
(۱۲) خلق و تکوین و فرقِ رضا۔
(۱۳) فرشتوں پر ایمان لانے کا بیان۔
(۱۴) انبیاء علیہ السلام پر ایمان لانے کا بیان۔
(۱۵) فضیلتِ رسولِ کریم صلعم۔
(۱۶) بیان خاتم النبیین و ختمِ نبوت۔
(۱۷) شریعتِ محمدیؐ ناسخ ادیان ہے۔
(۱۸) معراجِ آنحضرت صلعم۔
(۱۹) معجزات و کراماتِ انبیاء و اولیاء۔
(۲۰) آسمانی کتب پر ایمان لانے کا
(۲۱) کلامِ الٰہی قدیم ہے
(۲۲) امتِ محمدی افضل ہے
(۲۳) اہلِ قبلہ کو کافر نہ کہو
(۲۴) سوالِ منکر و نکیر و عذاب قبر
(۲۵) نفخ صور و حشر و نشر
(۲۶) اعمال ناموں کا بیان
(۲۷) میزان
(۲۸) پل صراط
(۲۹) قیامت کے پانچ مواقف
(۳۰) کافر اور دوزخ
(۳۱) حوض کوثر
(۳۲) درجات بہشت و دیدار حق تعالیٰ

ابتدا:۔ بعد حمدِ خدا و نعتِ رسول بشنو ایں نکتہ را بسمع قبول

خاتمہ:۔ نعمتِ آں بود بروں ز شمار برتر از جملہ نعمتِ دیدار
کہ ببینند خدائے را بہ بصر چوں شب چاردہ مہِ انور

وجہ تالیف شرح عقائد جامی " بدانکہ ایں اعتقاد مختصر را کہ از حضرت جامی قدس سرہ السامی مجملاً

منظوم بود بجہت تنبیہ خاص و عام خصوص محققانِ ناقص التحقیق زمان کہ از مسئلہ وحدت الوجود حقیقی و ہمہ اوست معنوی کہ من حیث الظہور است منکر اند واز غیریت حقیقی کہ فیما بین خلق و خالق من حیث الذات والصفات از ازل تا ابد است ناواقف و در مسئلہ جبر و قدر بالکل نامطلع، با دیگر فوائد دینی تصریح نمود، بتوضیحے کہ منکراں را در وحدت الوجود و ہمہ اوست معنوی من حیث الظہور انکار نماند، و قدمے بغیریت حقیقی عبد و رب من الازل الی الابد من حیث الذات حاصل آید، و از بس کہ جبر و قدر کماہا ینبغی مطلع شوند تا در منزل قبر و روز قیامت کہ سخت ترین روز ہاست آسانی ہا رو نماید و دشواری ہائے پل صراط کہ دشوار تر از ہمہ دشواری ہاست مرتفع گردد۔ بغور مطالعہ فرمائی و بامعانِ نظر ملاحظہ کنی، وگرنہ خسرانِ ابدی و زیان کاری سرمدی را آمادہ باشی و در قبر و قیامت بمواخذہ گرفتار آئی اعاذنا اللّٰہ عن ذالک"

شارح نے زیادہ تر قرآن و احادیث سے استدلال کیا ہے۔ اور حسب ذیل مستند کتابوں سے مدد لی ہے مثلاً

(۱) فتوح الغیب، مصنفہ حضرت میراں شیخ عبدالقادر جیلانی بغدادی قدس سرہٗ (۲) فتاویٰ ابو اللیث سمرقندی، (۳) فقہ اکبر، امام شافعی (۴) انسان کامل، مصنفہ شیخ عبدالکریم یمنی (۵) بحر المعانی (۶) اقوال شیخ اکبرؒ از فصوص الحکم و فتوحاتِ مکیہ (۷) تفسیر حضرت ابن عباسؓ (۸) کرامات اولیاء مؤلفہ شیخ عمر بن عثمان مکیؒ (۹) مثنوی مولانا رومؒ (۱۰) اقوال شیخ جنید بغدادی قدس سرہٗ۔

اپنی بعض تصنیفات کے حوالے دئے ہیں مثلاً، بزم توحید[۱]، میزان التوحید[۲]، مدار المحققین[۳]، رسالہ تجدد امثال[۴]۔

رسائل ۱ اور ۳ احقر کے پاس موجود ہیں، اور میزان التوحید مطبع برہانیہ حیدر آباد دکن میں چھپ گئی ہے اور کتب خانہ آصفیہ میں اس کے نسخے محفوظ ہیں۔

ہم یہاں بعض ابتدائی اور آخری اشعار کی توضیح نمونتہً پیش کرتے ہیں، جس سے طریقہ تفہیم اور استدلال پر روشنی پڑتی ہے:—

مثلاً ہست ایمان بقول پیغمبر + علم شش چیز انے نکو محضر کی طویل توضیح کا خلاصہ یہ ہے :۔

علم کی دو قسمیں ہیں، ایک علمِ ایمانی، دوسرا علمِ عملی،

علمِ ایمانی یعنی علمِ عقاید، مثلاً آمنت باللّٰہ و ملائکتہٖ وکتبہٖ ورسلہٖ الخ

منبع علمِ ایمانی کلمہ طیبہ ہے۔جس میں علمِ کونین پوشیدہ ہے۔اور علمِ کونین کے مدارج یہ ہیں :۔

(۱) درجہ جمع ۔ (۲) درجہ فرق ۔ (۳) درجہ جمع الجمع

(وجود) (ذات) (اثبات در اثبات)

علم عملی :۔ تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب۔

توحید کے دو مدارج :۔ ۱۔ وحدۃ مقیدہ ۔ ۲۔ وحدت مطلقہ ۔ اور وحدت مقیدہ و مطلقہ کی توضیح کے متعلق مختصر و جامع الفاظ یہ ہیں :۔

وحدت مقیدہ من حیث الصفات لا من حیث الذات، (نفی مثل) موجب انعدام مثل

وحدت مطلقہ من حیث الذات والصفات بود، (نفی غیر)، موجب انعدام وجود غیر،

گویا توحید کا ماحصل یہ ہے جو محققین صوفیاء کی تعلیم کا لب لباب ہے } "یک ذات باصفات خود موجود و ذات دیگر باصفات خود معدوم الخ . . "

(نیز ملاحظہ ہو لطیفہ بست و ہفتم۔ لطایف اشرفی مصنفہ میر اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھہ شریف) جس کی شرح مخدوم ساوی بیجاپوری نے "دلیل محکم" کے نام سے فرمائی ہے (آصفیہ)

خاتمہ :۔ دیدارِ حق تعالیٰ :۔

نعمت آں بود بروں ز شمار برتر از جملہ نعمتِ دیدار

کہ بہ بیند خدائے را بہ بصر چوں شب چار دہ مہ انور

خواجہ سید محمد حسینی گیسو دراز المتوفی (۸۲۵ھ) نے اپنے رسالہ "رویتِ حق" میں عالمانہ بحث کی ہے غرض اس مؤلف نے بھی اس مسئلہ کی تشریح میں مدلل طور پر صفحہ کے صفحے رنگ دئے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے :۔

اہل سنت جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو چشم سر سے دیکھنا ممکن ہے، یعنی حق تعالےٰ قادر ہے کہ خود کو چشم سر سے دکھلائے در جنت میں مومن حق تعالیٰ کو بے مقابلہ و بے جہت و مکان وغیر ذالک من الامادات الحدوث والنقصان دیکھیں گے۔

فرقہ معتزلہ اور شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ چشم سر سے خدا کا دیدار ناممکن ہے یعنی وہ اس امر پر قادر نہیں کہ خود کو چشم سر سے دکھلا سکے، بلکہ ان کے پاس رویت حق کفر میں داخل ہے۔ امو کے آٹھ احتمالات کے متعلق اس طرح فرماتے ہیں:۔

"وتحقیق ایں مقدمہ آں است کہ احتمالات جائزیہ عقلیہ در باب رویت ہشت اند چہار ازاں در ممکن، وچہار ازاں در وقوع، اما در ممکن آنست کہ ممکن است در دنیا و آخرت، وایں مذہب بعض اہل سنت جماعت است، یا ممتنع است در دنیا و آخرت، وایں مذہب معتزلہ و شیعہ است دیا ممکن است در دنیا و در آخرت ممتنع است وایں مذہب کسے نیست و یا در آخرت ممکن است یا ممتنع در دنیا وایں مذہب اہل تسنن است الخ"

بقولہ تعالےٰ رب ارنی ولن ترانی پر بحث کر کے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ:۔ رب ارنی دلیل صریح ہے کہ خود موسیٰؑ نے دیدار حق کی خواہش کی نہ ان کی قوم نے، اگر یہ جائز نہ ہوتی اور قوم کی تمنا ہوتی تو موسیٰ خود قوم کو منع فرماتے۔

لن ترانی کا مقصد اور استدلال یہ کہ دنیا میں خدا کو نہیں دیکھ سکتے، نہ یہ کہ آخرت میں بھی، حضرت موسیٰؑ کی خواہش اُس وقت صرف دنیا میں دیکھنے کی تھی جواب ملا کہ دنیا میں نہیں دیکھ سکتے، اگر اس کے معنی مطلق لیں اور کہیں کہ آخرت میں بھی دیدار کا یہی حکم ہے تو حضرت موسیٰؑ کی تمنا باطل ہو جائے گی اور موسیٰ کے متعلق ایسا اعتقاد باطل ہے۔ غرض اس سے ثابت ہوا کہ رویت ممکن ہے

رویت کے وقوع کے متعلق اعتبارات ہیں:۔

دنیا اور آخرت میں دیدار ممکن ہے۔ اور مذہب اہل سنت کا یہ ہے کہ حضرت رسول کریم صلعم نے شب معراج میں بحالت بیداری چشم سر سے خدا کو دیکھا اور آخرت میں بھی دیکھیں گے، اولیاء کرام

آں حضرت کی اتباع میں خدا کو بحالتِ بیداری بصیرت سے دیکھتے ہیں اور آخرت میں چشم سر سے یعنی بصارت سے دیکھیں گے۔

معتزلہ اور شیعہ کا استدلال نفی رویت کی دلیل لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ پر ہے مگر ابصار کے دو معنی ہیں:-

(۱) عقل، یعنی "عقلہا بکنہ ذات وصفاتِ او نرسد و او بکنہ آنہا برسد"

(۲) دید:- معنی ادراک بغایت چیزے رسیدن وغایت چیزے را دریافتن باشد مثلاً ادراک القصی وغیرہ معنی رویت دیدن است نہ ادراک و ذاتِ خدا عزوجل ازاں منزہ است کہ آنرا غایت باشد تا دیدہا آنرا دریابند، پس معنی لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ بعدم درک ذات است، و بعدم رویت غلط فہیدہ تمسک می کنند...

رویت کے متعلق بارہ شرایط عقلی یہ ہیں:-

" (۱) سلامتِ حالت قوتِ ادراک (۲) بودن شئ جایز الرویت (۳) بودن شے متقابل بلبنیدہ (۴) عدمِ غایتِ صغر (۵) عدمِ غایتِ قرب (۶) عدمِ غایتِ بعد۔ (۷) عدمِ غایتِ لطافت (۸) عدمِ حجاب حائل (۹) عدمِ ضدِ ادراک کہ نوم وغفلت و توجہ بچیزے دیگر است (۱۰) بودن شے روشن بذاتہ (۱۱) متصل شدن شعاع کہ خارج از عین است بمرئی (۱۲) منتقش شدن نمونہ از مرئی در حدقہ رائی......

و بے وجود ایں شروطِ حصول رویت باطل و محال عقل است ——

بدانکہ وجود ایں شروطِ مشروطِ عادیہ است یعنی حق تعالیٰ عادتِ خود جاری کردہ بخلق رویت باوجود ایں شروط و نیز قادر است بر عدم خلق رویت باوجود ایں شروط ثبوت ایں مدعا چہار دلیل نقلی است:-

(۱) يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ:- جنگ بدر میں آنحضرت صلعم کی طرف ۳۱۶ اشخاص تھے اور کفار کے ہزار، مگر کافروں کی نظر میں مسلمان دو ہزار دکھلائے گئے۔ "یعنی دو ہزار در چشم کافراں خلق کرد، و ایں شرط موجود نبود"

(۲) وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْۤ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا:- کافر زیادہ تھے مگر مسلمانوں کو ان کی تعداد کم دکھلائی گئی

"بیان آنست کہ حق تعالیٰ .... باوجود شرط خلق رویت نکرد"۔

(۳) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ دونوں تشریف فرما تھے، ابولہب ایذا دینے آیا اور کہا کہ حضرت صلعم کہاں ہیں، شروط موجود تھے، حق تعالیٰ نے رویت، ابولہب کی آنکھ میں پیدا نہ کی۔

(۴) رسولِ کریم جس طرح سامنے سے دیکھتے تھے اسی طرح پیچھے سے بھی دیکھتے تھے۔

اور بعض شروط موجود نہ تھے رویت کے متعلق بہت سی دلیلیں موجود ہیں :۔

(۱) آیۂ کریمہ :۔ وُجُوہٌ یومئذٍ ناظرۃٌ اِلیٰ ربھا ناظرۃ :۔ نظر = کے چار معنی ہیں :۔

(۱) اعتبار (۲) بخشش و مہربانی (۳) انتظار (۴) رویت۔

اعتبار = اس لئے نہیں کہ آں جہاں سرائے اعتبار نیست ——— وبمعنی بخشش و مہربانی، وایں از بندہ بخدا روا نہ باشد۔ وانتظار ایں معنی ہم در انجا بار ندہد۔ زیرا کہ در انتظار رنج و ناخوشی است ایں آیت بر سبیل بشارت گفتہ شد نہ کہ بہشت سرائے انتظار باشد ——— ونظر بمعنی رویت از لغت بے تاویل ست واضح"۔ شیعہ کہتے ہیں "ناظرۃ آنست کہ الیٰ ثواب" ربھا ناظرہ یعنی ثواب حق نگراں باشد وایں تاویل فاسد است"۔

حدیث شریف :۔ انکم لترون ربکم یوم القیامۃ کما ترون القمر لیلۃ البدر۔

..... یہ تشبیہ توضیح رویت کے لئے ہے نہ کہ چاند کی طرح مدور دیکھیں گے جو باطل و محال ہے۔

حدیث :۔ سب جنتی جمع ہوں گے، لحنِ داودی شروع ہوگا، تسبیح و تہلیل ہوگی، جملہ نعمتوں سے مشرف ہوں گے اس کے بعد تجلی خداوندی سے بہرہ ور ہوں گے۔

حدیث :۔ بعد ادخال جنت حجاب دور ہوجائے گا اور خدا کو دیکھیں گے۔

حدیث :۔ سب سے بڑا جنتی وہ ہوگا جس کو حق کا دیدار دو مرتبہ رات دن میں میسر ہو.....

لیکن یہ رویت بے کیف ہے جس طرح ذات بے کیف ہے۔

آخر میں فرماتے ہیں :۔ رویت تنزیہ جز بہ بصیرت امکان ندارد باستثنا رسولِ کریم صلعم و در خواب ممکن مثلاً حضرت امام اعظم ابو حنیفہؓ را۔ ٭

٭ رویت قلبی — بمعنی در دنیا اولیا را و کرام را میسر است ... رویت صوری و معنوی ہر دو در عقبیٰ خواص را است الخ۔

رفتارِ ادب

(سہ ماہی تبصرہ)
از
(جناب نثار احمد صاحب فاروقی)

پچھلے چند مہینوں سے اردو کتابوں کی اشاعت کی رفتار خاصی مسرت انگیز ہے۔ ایسی کتابیں منظرِ عام پر آنے لگی ہیں جو لکھنے والوں کی محنت اور موضوع سے محبت کا پتا دیتی ہیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر اردو کے کلاسکی سرمائے پر روشنی ڈالتی ہیں اس سے نہ صرف ماضی کی اچھی روایتوں کا تحفظ ہو رہا ہے بلکہ ان کی قدر شناسی اور ان کے محاسن کی پزیرائی سے جدید ادبی میلانات کی جلا اور تصفیہ بھی ہو رہا ہے۔ اس سے مستقبل کے ادب کی گذرگاہیں صاف اور روشن ہوں گی۔ یہ رفتار اسی لئے نیک فال ہے۔

تحقیق اور کاوش کا یہ رجحان ہمارے ان ادبی بزرگوں ہی میں ملتا ہے جو اپنے فن اور موضوع کے ساتھ سنجیدہ ہیں اور برسوں ریسرچ کرنے کے بعد اپنی تحقیقات منظرِ عام پر لاتے ہیں اس تحقیق اور جاں فشانی کے اثرات بالواسطہ جہاں تک بھی ہوں یقیناً مفید ہی ہوں گے اس سے ہمارے نئے ناقدوں میں بھی تحقیق کی ذمہ داری کا احساس پیدا ہوگا۔

میں اس وقت ایسی ہی تین کتابوں کا ذکر کروں گا جو ہمارے لئے معلومات افزا بھی ہیں اور مشعل راہ بھی۔ ان کے نام یہ ہیں، پروفیسر مسعود حسن رضوی کی دو کتابیں:

۱۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج ۔ ۲۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج

اور جناب خلیق احمد نظامی کی بلند پایہ تصنیف:

۳۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات۔

جو کچھ سرمایہ اردو ڈراما پر اب تک موجود ہے اس کے بہت سے گوشے مبہم ہیں اور ضرورت یہ تھی کہ کوئی بالغ نظر ادیب اردو ڈراما کی تاریخ کے ابتدائی دور پر روشنی ڈالے۔ یہ اہم کام لکھنؤ کے پروفیسر

سید مسعود حسن رضوی ادیب نے کیا ہے۔ تحقیق و تنقید ان کے خاص موضوع ہیں اور اس دشت کی سیاحی میں انھوں نے ایک عمر گزاری ہے۔

لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، امانت لکھنوی کی اندر سبھا کا مقدمہ و تعارف ہے۔ امانت کی اندر سبھا اور واجد علی شاہی رہس پر ریسرچ کرنے کا انھیں پورا حق پہنچتا تھا، انھوں نے یہ حق ادا کر دیا ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے کتنی محنت کی ہے، کیا نتائج برآمد کئے ہیں، تحقیقی اعتبار اور تنقیدی معیار سے کتنا بلند پایہ کام کیا ہے اس کا اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جس نے کسی موضوع کی تحقیق میں اپنی جان کھپائی ہو۔ اس بازار میں "کاتا اور لے دوڑی" کا کوئی گاہک نہیں۔ سب سے پہلا مرحلہ تو صحیح ماخذ کے حصول کا ہوتا ہے جس کی گرفت میں ماخذ ہی نہ آسکیں وہ موضوع سے کیا انصاف کرے گا؟

آغا حسن امانت لکھنوی کی اندر سبھا جب پہلی بار اسٹیج پر کھیلی گئی تو خلقت اُسے دیکھنے کو ٹوٹی پڑتی تھی ہر گلی کوچے میں اسی کا چرچا تھا۔ اس کے اشعار اور مکالمے سیکڑوں لوگوں کو زبانی یاد تھے۔ مولوی مظہر علی سندیلوی نے اپنے روزنامچے میں کئی جگہ اندر سبھا کے رہس کا تذکرہ کیا ہے اور اُسے پڑھ کر اس ناٹک کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے بڑے بوڑھے، پرانی قدروں کے پرستار اور اخلاق و وضع داری کے نگہبان، برسوں اس ڈرامے کو "مخرب اخلاق" اور "ناشائستہ" ہی سمجھتے رہے۔ انھوں نے زہر عشق، سحر البیان اور اندر سبھا کو تہذیب کے دامن کا داغ سمجھا۔ لیکن آج وہ تصورات بدل گئے ہیں یہی کتابیں ماضی کے ثقافتی سرمائے کا بقیہ اور گذری ہوئی تہذیبی روایات کے قافلے کا نقش قدم معلوم ہوتی ہیں۔ عوامی ذہن و مزاج کا عکس اب انھیں میں ڈھونڈھیں تو مل سکتا ہے۔ ادبی سے زیادہ ان کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت ہے۔ اندر سبھا پہلا ڈراما تھا جو عوامی اسٹیج پر کھیلا گیا اسی لئے پروفیسر مسعود حسن رضوی نے کتاب کا نام بھی لکھنؤ کا عوامی اسٹیج رکھا ہے۔ انھوں نے اندر سبھا کے متعدد مطبوعہ نسخوں سے فائدہ اُٹھایا ہے اس کے سوا اُنھیں اندر سبھا کا وہ چھاپا بھی دستیاب ہو گیا تھا جو خود امانت کی زندگی میں چھپا تھا اور صحیح ترین ہے۔ اس پر امانت نے اپنی مہر لگا کر اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ اس میں کوئی لفظ کیا، نقطہ بھی غلط نہیں ہے۔

فاضل مرتب نے فرہنگ اور غیر مانوس یا مشکل لفظوں کے معنی لکھنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ لیکن سب سے

زیادہ اہم ان کا مقدمہ ہے۔ جسے اردو ڈرامے کی تاریخ کا مقدمہ کہنا چاہیے۔ اس میں انھوں نے امانت کی زندگی، ان کے فن، ڈرامے کی مقبولیت اور اس کی ادبی و فنی حیثیت کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا جس پر سیر حاصل تبصرہ نہ کیا ہو۔ اس کتاب کے وقیع اور بلند پایہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

دوسری اہم کتاب "لکھنؤ کا شاہی اسٹیج" بھی پروفیسر مسعود حسن رضوی کی تصنیف ہے۔ واجد علی شاہ کے دربار میں جو رہس ہوا کرتے تھے ان کی تاریخی تفصیل اس میں پیش کی گئی ہے۔ یہ سوا دو سو صفحوں کی کتاب ہے جس میں سب سے پہلے واجد علی شاہ کے حالات اور فنون لطیفہ سے ان کی دلچسپی کا بیان کیا گیا ہے۔ انگریزوں نے اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے ہندوستان کی تاریخ میں بہت کچھ کتر بیونت کی ہے اور تاریخی کرداروں کے چہرے مسخ کر دیے ہیں۔ ایسی ہی تاریخی تحریفوں کا ستم رسیدہ واجد علی شاہ کا کردار بھی ہے۔ انھیں صرف عیاش، کاہل، ناچ گانے کا رسیا، امورِ مملکت سے قطعاً غافل اور انتظامِ سلطنت کے لیے سخت نااہل قسم کا بادشاہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر ہم عصر مورخوں کے بیان سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

فنونِ لطیفہ سے شاہ اودھ کی دلچسپی کے ہزاروں ثبوت ہیں "رہس" کا ایجاد اور اس کی سرپرستی بھی انھیں میں سے ایک ہے۔ خود واجد علی شاہ نے "رادھا کنھیا کا قصہ" مع ہدایاتِ تمثیل (Stage Directions) کے لکھا بھی تھا۔ پروفیسر رضوی کا کہنا ہے کہ یہ اردو کا پہلا طبع زاد ڈراما ہے۔ امانت کی اندر سبھا اس کے بہت بعد میں لکھی گئی۔ یہ جو مشہور ہے کہ امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش پر اندر سبھا لکھی وہ قیصر باغ میں کھیلی گئی اور خود شاہ نے اس میں کوئی پارٹ ادا کیا، یہ سب فرضی باتیں ہیں ایسے بہت سے مفروضات کی تردید دلیلوں کے ساتھ پروفیسر رضوی نے کر دی ہے۔

ایک اور ایسی ہی بلند پایہ علمی تصنیف "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" ہے۔ اس کا موضوع تاریخ ہے اور مصنف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ تاریخ کے ریڈر جناب خلیق احمد نظامی ہیں۔ جنھوں نے تاریخ مشایخ چشت، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات، لائف اینڈ ٹائمز آف بابا فرید گنج شکر، اور ایلیٹ اینڈ ڈاسن کی تاریخ کا ضمیمہ جیسی بلند معیار علمی کتابیں لکھ کر ہندوستان کے علمائے تاریخ میں اپنا ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس کتاب

میں انھوں نے سیکڑوں تاریخی کتابوں، دستاویزوں، اور نسخوں سے فائدہ اٹھا کر سلاطین دہلی کی مذہبی پالیسی کا مفصل اور مشرح بیان کیا ہے۔ علمی تحقیق اور تاریخی بلند نظری و بے تعصبی کا یہ ایک عمدہ نمونہ ہے۔ نظامی صاحب اپنے موضوع میں ڈوب کر ابھرتے ہیں اور اس پر حاوی ہو کر لکھتے ہیں وہ کسی موہوم اور مبہم سے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تحقیق کی ذمہ داری بہت بڑی ہوتی ہے۔ خلیق احمد نظامی اس سے عہدہ برآ ہونا جانتے ہیں۔

ان کی یہ کتاب اس لئے پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ اس سے سیکڑوں سال کی غلط بیانیاں "بیتِ عنکبوت" کی طرح ٹوٹ جاتی ہیں، تاریخی شعور میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور ماضی کی طرف ہم دور تک اور دیر تک دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے اپنے عظیم کلاسکی سرمائے کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں، اُس عہد کے میلانات ورجحانات کا پتہ لگا سکتے ہیں اور یہ ایک مثالی تصنیفی نمونہ بھی بن سکتی ہے۔

شاید ایسے ہی علمی کارناموں کے لئے کہا گیا ہے کہ "اچھا کام اپنا انعام آپ ہوتا ہے" معنوی اور ظاہری خوبیوں سے کتاب ہر طرح آراستہ پیراستہ ہے اور مہدی افادی کا جملہ "عروس جمیل ولباس حریر" اس پر صادق آتا ہے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی)

ادبیات

غزل

از

جناب الم مظفر نگری

جو ہیں رندِ ازل گلشن کو میخانہ سمجھتے ہیں
کلی کو شیشۂ مے گل کو پیمانہ سمجھتے ہیں

محبت میں یہ رتبہ بھی نہیں ملتا بآسانی
غنیمت ہے ہمیں وہ اپنا دیوانہ سمجھتے ہیں

مجھے حیرت ہے اہلِ بزم کی کوتاہ فہمی پر
مآلِ سوزِ غم کو خاکِ پروانہ سمجھتے ہیں

حقیقت آشنائے گلستاں فصلِ بہاراں میں
ہجومِ رنگ و بو کو برق کا شانہ سمجھتے ہیں

بنایا تھا جنھیں فصلِ جنوں پرور نے دیوانہ
وہی اب نو بہارِ گل کو دیوانہ سمجھتے ہیں

اذانِ عشق کی ہے ایک وہ بگڑی ہوئی لے
جسے ہم شورِ ناقوسِ صنم خانہ سمجھتے ہیں

سحر تک رنگ کیا بدلے گی محفل پوچھ لو ہم سے
کہ ہم انجامِ وجد و رقصِ پروانہ سمجھتے ہیں

یہ میخانہ ہے بے مانگے یہاں ملتی ہے اے واعظ
طلب کو تو یہاں رسمِ غلامانہ سمجھتے ہیں

سرِ محفل وہ کیا سمجھیں گے سازِ شمع کے نغمے
جو سوزِ غم کی چنگاری کو پروانہ سمجھتے ہیں

کسی دن جس کے شعلے خرمنِ ہستی کو پھونکیں گے
اسی بجلی کو ہم شمعِ طرب خانہ سمجھتے ہیں

کہاں سمجھے گی موجِ بوئے گل اس کی حقیقت کو
بگولے قدرِ جولانگاہِ ویرانہ سمجھتے ہیں

نگاہیں ڈالتے ہیں مرکزِ وحدت سے کثرت پر
حرم میں رہ کے ہم رازِ صنم خانہ سمجھتے ہیں

الم کیا اُن جفا کیشوں سے امیدِ عنایت ہو
بیانِ دردِ دل کو جو کہ افسانہ سمجھتے ہیں

تبصرے

اسباب بغاوت ہند از سر سید احمد خاں مع مقدمہ از فوق کریمی تقطیع ۲۲-۱۸/۸ کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت مجلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر یونیورسٹی پبلشرز مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

۱۸۵۷ء کے خونچکاں دور میں جب کہ ہندوستان کی پوری فضا مظلوموں کے خون سے شفق آلود ہو رہی تھی اور انگریز کے مظالم سے وحشت زدہ ہوکر ہندوستانیوں کی جرأت وعزم ٹھٹھر کر رہ گئے تھے۔ سر سید مرحوم نے انگریز کے خلاف ہندوستانیوں کی جدوجہد اور پُرحوصلہ مقابلہ کے اسباب کا گہری نظر سے تجزیہ کیا اور واقعات وحقائق کی روشنی میں انقلابی اقدامات کی صحیح توجیہ اور معقول وجوہ متعین کیں جن حوصلہ فرسا حالات میں یہ سب کچھ لکھا گیا تھا اس وقت اس کے کسی حصے کو بھی زبانِ قلم پر لانا ممکن نہیں تھا سر سید کی اس کتاب کی قدر وقیمت کا اندازہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ ۵۷ء کے ہنگامۂ خونیں کے فوراً بعد جب پوری انگریز قوم ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی طرف سے انتہائی بدظن اور مشتعل تھی۔ مؤلف نے اپنی کتاب کی کافی اشاعت برطانوی قوم میں کی اور ان کے ذہنوں کو بدلنے میں کافی بڑی حد تک کامیابی حاصل کی، آج کے دور میں انگریزوں کے خلاف بولنا اور کہنا ایک معمولی سی بات ہے۔ لیکن سو سال قبل حالات ایسے تھے کہ انگریز سے ٹکرانا پہاڑ سے نہیں زندگی سے ٹکرانا تھا

یہ مفید رسالہ عرصہ سے نایاب تھا۔ حال ہی میں ہندوپاک میں اس کے نئے اڈیشن شائع ہوئے ہیں، زیرِ نظر اڈیشن یونیورسٹی پبلشرز مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے اہتمام میں شائع ہوا ہے، کتاب کے شروع میں فوق کریمی صاحب نے ایک طویل مقدمہ سپردِ قلم کیا ہے جس میں سر سید کی شخصیت، ان کی تحریک اور مقاصد کی نقاب کشائی کرتے ہوئے بعض الزامات کی تردید کی ہے۔ یہ مقدمہ معلومات افزا مضامین پر پھیلا ہوا ہے اس مقدمے کے ساتھ کتاب کی اشاعت بدلے ہوئے حالات کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہے اور اس سے کتاب کی معلوماتی اور افادی حیثیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے، اگرچہ فاضل مقدمہ نگار کے اخذ کئے ہوئے نتائج کے تمام پہلوؤں سے اتفاق کرنا ہر گز ضروری نہیں۔

(ا۔ ن، ش)

تبصرے

اسباب بغاوت ہند از سر سید احمد خاں مع مقدمہ از فوق کریمی تقطیع ۱۸×۲۲/۸ کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت مجلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر یونیورسٹی پبلشرز مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

۱۸۵۷ء کے خونچکاں دور میں جب کہ ہندوستان کی پوری فضا مظلوموں کے خون سے شفق آلود ہو رہی تھی اور انگریز کے مظالم سے وحشت زدہ ہو کر ہندوستانیوں کی جرأت و عزم ٹھٹھر کر رہ گئے تھے۔ سر سید مرحوم نے انگریز کے خلاف ہندوستانیوں کی جدو جہد اور پرحوصلہ مقابلہ کے اسباب کا گہری نظر سے تجزیہ کیا اور واقعات وحقائق کی روشنی میں انقلابی اقدامات کی صحیح توجیہ اور معقول وجوہ متعین کیں جن حوصلہ فرسا حالات میں یہ سب کچھ لکھا گیا تھا اس وقت اس کے کسی حصے کو بھی زبان قلم پر لانا ممکن نہیں تھا۔ سر سید کی اس کتاب کی قدر وقیمت کا اندازہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ ۵۷ء کے ہنگامۂ خونیں کے فوراً بعد جب پوری انگریز قوم ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی طرف سے انتہائی بدظن اور مشتعل تھی۔ مؤلف نے اپنی کتاب کی کافی اشاعت برطانوی قوم میں کی اور ان کے ذہنوں کو بدلنے میں کافی بڑی حد تک کامیابی حاصل کی، آج کے دور میں انگریزوں کے خلاف بولنا اور کہنا ایک معمولی سی بات ہے۔ لیکن سو سال قبل حالات ایسے تھے کہ انگریز سے ٹکرانا پہاڑ سے نہیں زندگی سے ٹکرانا تھا۔

یہ مفید رسالہ عرصہ سے نایاب تھا۔ حال ہی میں ہندو پاک میں اس کے نئے اڈیشن شائع ہوئے ہیں زیر نظر اڈیشن یونیورسٹی پبلشرز مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے اہتمام میں شائع ہوا ہے، کتاب کے شروع میں فوق کریمی صاحب نے ایک طویل مقدمہ سپرد قلم کیا ہے جس میں سر سید کی شخصیت، ان کی تحریک اور مقاصد کی نقاب کشائی کرتے ہوئے بعض الزامات کی تردید کی ہے۔ یہ مقدمہ معلومات افزا مضامین پر پھیلا ہوا ہے اس مقدمے کے ساتھ کتاب کی اشاعت بدلے ہوئے حالات کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہے اور اس سے کتاب کی معلوماتی اور افادی حیثیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے، اگرچہ فاضل مقدمہ نگار کے اخذ کئے ہوئے نتائج کے تمام پہلوؤں سے اتفاق کرنا ہرگز ضروری نہیں۔

(ا۔ن۔ش)

ندوۃ المصنفین کی تاریخی کتابیں

غلامانِ اسلام

اسّی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور کارناموں کا ایمان افروز بیان۔

قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔ مجلد چھ روپے آٹھ آنے۔

تاریخ اسلام پر ایک نظر

تاریخ اسلام کے تمام ادوار کے ضروری حالات و واقعات کی تفصیل تاریخ نویسی کے جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر، اسلوب بیان نہایت ہی دل نشین۔

قیمت چھ روپے۔

مجلد چھ روپے آٹھ آنے۔

مسلمانوں کا نظم مملکت

مسلمانوں کے نظامِ حکمرانی کی بصیرت افروز تاریخ، جس میں مسلمانوں کے آئینِ جہانبانی کے تمام شعبوں سے متعلق نہایت صاف اور روشن معلومات دی گئی ہیں۔

قیمت چار روپے۔ مجلد پانچ روپے۔

تاریخ مشائخ چشت

سلسلۂ چشت کے صوفیائے کرام کی محققانہ تاریخ اور ان کے نظامِ اصلاح و تربیت کا مکمل تذکرہ لائق مطالعہ کتاب۔

قیمت بارہ روپے۔ مجلد تیرہ روپے۔

عرب اور اسلام

ڈاکٹر حِتّی کی مشہور و معروف کتاب کا آسان اور نفیس ترجمہ۔

قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ مجلد چار روپے آٹھ آنے۔

حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے

قرونِ وسطیٰ کے حکمائے اسلام، سائنس دانوں اور فلاسفروں کے بے مثال علمی کارناموں کا بیان۔ قیمت جلد اول مجلد [illegible]

قیمت جلد دوم مجلد [illegible]

مکمل سیٹ مجلد [illegible]

مسلمانوں کا عروج اور زوال

جدید ایڈیشن (اپنے موضوع پر ایک اچھوتی کتاب) جس میں خلافت راشدہ کے دور سے لے کر ہندوستان کے عہد حکمرانی تک مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب کا محققانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔

قیمت چار روپے۔ مجلد پانچ روپے۔

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح

شیخ محدث کے کمالات و فضائل کا صاف و شفاف نقشہ اور اس دور کی بصیرت افروز تاریخ۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

تاریخ اسلام نو جلدوں میں

تھوڑے وقت میں تاریخ اسلام پڑھنے والوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ تاریخ ملت کے یہ تمام حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع و مکمل بھی، طرزِ بیان نہایت شگفتہ و رواں، ترتیب دل نشین۔

نبی عربی صلعم قیمت بلا جلد [illegible]

خلافت راشدہ ۔ [illegible]

خلافت بنی امیہ ۔ [illegible]

خلافت ہسپانیہ ۔ [illegible]

خلافت عباسیہ اول بلا جلد [illegible]

خلافت عباسیہ دوم ۔ [illegible]

تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ ۔ [illegible]

خلافت عثمانیہ ۔ [illegible]

تاریخ صقلیہ بلا جلد قیمت [illegible]

قیمت مکمل سیٹ غیر مجلد [illegible]

مجلد [illegible]

مینیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

Registered ...

ندوۃ المصنفین کی ممبرشپ

۱- لائف ممبر کم سے کم ایک ہزار روپے یک مشت مرحمت فرمانے والے اصحاب اس حلقے میں شامل کئے جاتے ہیں، ایسے اربابِ ذوق کی خدمت میں برہان اور مکتبہ برہان اور ادارے کی تمام مطبوعات پیش کی جاتی ہیں، کتابوں کی جلد پر لائف ممبر کا نامِ نامی سنہری حرفوں سے ثبت کیا جاتا ہے

۲- معاونین خاص کم سے کم سو روپے سالانہ مرحمت فرمانے والے اصحاب حلقۂ معاونینِ خاص میں داخل کئے جاتے ہیں اور ان کی یہ اعانت عطیۂ خالص کے طور پر قبول کی جاتی ہے، ان حضرات کی خدمت میں بھی سال کی تمام مطبوعات اور برہان بغیر کسی معاوضے کے پیش کیا جاتا ہے۔

۳- معاونین اس حلقے کی سالانہ فیس تیس روپے ہے، معاونین کی خدمت میں سال بھر کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور برہان کسی مزید معاوضے کے بغیر پیش کئے جاتے ہیں۔

۴- معاونینِ عام معاونینِ عام کی سالانہ فیس بیس روپے ہے، ان کو سال کی تمام غیر مجلد مطبوعات دی جاتی ہیں اور برہان بلا قیمت دیا جاتا ہے۔

۵- احبا حلقۂ احبا کی سالانہ فیس دس روپے ہے، ان کی خدمت میں برہان بلا قیمت پیش کیا جاتا ہے اور ان کی طلب پر ایک فیس کے بدلے میں ایک سال کی غیر مجلد مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جاتی ہیں۔

قواعدِ رسالہ برہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائے گا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ دوسرے ملکوں سے گیارہ شلنگ (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ آنے۔

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے الجمعیۃ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان دہلی سے شائع کیا۔